فہرست

تعلیمات نبوی ﷺ کا تیسرا باب

اخلاق

اسلام اور اخلاق حسنہ

حقوق عباد کی اہمیت::

اسلام کے ارکان پنجگانہ اور اخلاق::

اخلاق حسنہ اور ایمان::

اخلاق حسنہ اور تقوی::

اخلاق حسنہ اور خدا کے نیک بندہ ہونے کا شرف::

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف::

اخلاق حسنہ کا درجہ اسلام میں::

ایک اور حدیث میں ہے:

ایمان کے اوصاف ولوازم::

اخلاق حسنہ صفات الٰہی کا سایہ ہیں::

اخلاقی معلموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز

بے پردہ زندگی::

قول کے ساتھ عمل::

کامل ومکمل::

اسلام کا فلسفہ اخلاق

بے غرضی::

نیت::

فلسفہ اخلاق کی تائید::

اخلاق کیلئے ایمان کی شرط::
ضمیر کی آواز::
مسرت وانبساط::
رضائے الٰہی::
مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول::
خوف ورجا::
اخلاق اور رہبانیت::
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر::
اس کی چند شرائط::
تجسس اور غیبت کی ممانعت::
توسط اور اعتدال::
عدل واحسان::
قانون اور اخلاق::
عفو اور انتقام::
عفو ودرگزر کی تعلیم::
برائی کی جگہ نیکی::
اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ
تفصیل اور ہمہ گیری ::
اخلاقی تعلیمات کا احاطہ ::
(۱)۔توراہ کے اخلاقی احکام۔
انجیل کے اخلاقی احکام ::
اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصاء ::

قرآنی اخلاق کی فہرست ::
احادیث کے اخلاقیات کی فہرست ::
اخلاقی جزئیات کا استقصاء ::
مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ ::
رشوت کی حرمت میں استقصاء ::
مسیحی اخلاق کی کمزوری ::
نٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر ::
اسلامی اخلاق کا اعتدال ::
نفوس کا اختلاف استعداد ::
ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح ::
مسیحی اخلاق کی کمزوریاں ::
لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر ::
اسلام اور بلند اخلاق ::
تقدیر، توکل صبر اور شکر ::
اپنے دشمنوں سے پیار کرو ::
کفار و مشرکین سے عدم موالات ::
سختی کا جائز موقع ::
خدا کے لیئے محبت اور خدا کے لیئے ناراضی ::
اسلام میں کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں ::
ترک ہجرت ::
اخلاق اور محبت الٰہی ::
تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب

انسانی برادری کا حق

جانوروں کے حقوق

فضائل اخلاق

فضائل کی مختصر فہرست ::

صدق

زبان کی سچائی ::

دل کی سچائی ::

عمل کی سچائی ::

سخاوت

عفت و پاکبازی

دیانتداری اور امانت

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی انزل الکتاب والحکمت والصلوٰت والسلام علی رسولہ نبی الرحمت وعلی الہ واصحابہ اولی العزم والھمت۔

اے تو بھمیں صفت سزاوار
نام تو گرہ کشائے ہر کار
اے کردہ زگنج خانۂ زار
بر آدمیاں در سخن باز
عالم زتو شد بحکمت آباد
حکمت زتو یافت آدمی زاد
در قربت حضرت مقدس
پیغمبر پاک، رہبرم بس
گنجینۂ کیمیائے عالم
پیش آزہمہ پیشوائے عالم
تامش بسریر یاد شاہی
توقیع سپیدی و سیای

(خسرو)

سیرت نبوی ﷺ کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے یہ ان اخلاقی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح میں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بتائی اور سکھائی گئیں، یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کی نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہے، عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں اسی لیئے عوام کے اس وہم کو دور، اور قوموں کی ترقی وتہذیب میں اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لیئے ان

اوراق میں اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا اہم جز اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔

کتاب میں اس نکتہ کی طرف کہ اخلاق حسنہ ''اسمائے حسنٰی'' کا پرتو ہیں' بار بار اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی مخلوق' خالق کی کسی صفت میں برابر کا شریک نہیں ہوسکتا' ایسا سمجھنا سراسر شرک ہے بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس وصف کو خدائے تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے اس پر اس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہیں' جیسے خدا کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہیں ہے جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہے' مگر خدا کی اس صفت علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہہ دیتے ہیں' حالانکہ حقیقی صفت علم خدا میں ہے' بندہ میں نہیں' لیکن چونکہ خدائے تعالیٰ اپنی صفت علم سے بندہ میں ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہے اس لیئے بندہ کی اس ادنٰی انکشافی شان کو بھی علم کہہ دیتے ہیں۔(۱)۔ ورنہ درحقیقت ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں'

(۱)۔ تفصیل کیلئے دیکھئے معارف لدنیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ' ص ۲۴' مطبوعہ مدینہ بجنور۔

یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسرے صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہے' اسی لیئے بہت سے اہل حق اور اہل تحقیق کے نزدیک ان اوصاف کا اشتراک' اشتراک بادنٰی مناسبت ہے اور بس! لیس کمثلہ شئی وھو السمیع البصیر (شوریٰ:۲)

کتاب میں چند موقعوں پر مختلف مذہبوں سے اسلام کا موازنہ آ گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسٰی علیہما السلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے' اس سے مقصود وہ تعلیمات و ہدایات ہیں جو آج ان کی طرف منسوب صحیفوں میں پائی جاتی ہیں' یا ان کے موجودہ پیرو ان کی طرف منسوب کرتے ہیں' ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبر صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے اور نبوت کے جس دور میں جو ربانی تعلیم آئی وہ اس کیلئے بالکل مناسب تھی' یہاں تک کہ خاتم

المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کی ہمیشہ کیلئے تکمیل فرمادی گئی۔

کتاب میں کہیں کہیں فقہی مسئلے آ گئے ہیں، چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے اس لیئے فقہی جزئیات اور تفصیلات میں الجھا نہیں گیا ہے ایسے موقع پر اگر شک وشبہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے۔

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کی گئی ہے پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلام اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ تعلیم کی کچھ خصوصیتیں گنائی گئی ہیں، پھر حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کے مختلف عنوانوں سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کی گئی ہے۔

فضائل، رذائل اور آداب کے بعض عنوان میرے رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے لکھے ہیں جن کو میں نے گھٹا بڑھا کر شامل کرلیا ہے، موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گزار ہوں۔

آیات واحادیث سے احکام کے استنباط اور مصالح وحکم کی تشریح میں اپنے ذوق وفکر کی رہبری سے چارہ نہ تھا، سہو وخطاء انسان کی فطرت ہے، پھر کیونکر دعویٰ کروں کہ اس میں میرا فکر وذوق آزاد رہا ہے۔

سلسلہ سیرت کے بانی حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کو مدت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا، اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے تو میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزا پڑے ہیں اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ (رحمتہ اللہ تعالیٰ)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے اور انبائے ملت میں اس آئینہ محمدی ﷺ کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل وصورت کی تزئین وآرائش کا ذوق پیدا کرے

اور وہ سمجھیں کہ ایمان و عبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی میں اخلاقی و عادات کی درستی ہے۔

طالب رحمت

سید سلیمان ندوی

(۴ ذی حجہ ۱۳۵۷ھ)

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

تعلیمات نبوی ﷺ کا تیسرا باب

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین و علی الہ واصحابہ اجمعین

اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیمات نبوی ﷺ کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے' اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق وفرائض کی وہ تعلیمات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لیئے مناسب بلکہ ضروری ہے' انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے' اسی تعلق کے فرض کو بحسن وخوبی انجام دینا اخلاق ہے' اس کے اپنے ماں باپ' اہل وعیال' عزیز ورشتہ دار' دوست و احباب' سب سے تعلقات ہیں بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلّہ' وطن قومیت' جنسیت یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے تعلقات ہیں' اور ان تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں۔

دنیا کی ساری خوشی' خوشحالی اور امن وایمان اسی اخلاق کی دولت سے ہے' اسی دولت کی کمی کو حکومت و جماعت اپنی طاقت وقوت کے قانون سے پورا کرتی ہے۔ اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح ازخود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو۔ اس لیئے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے راستہ سے بہکنے نہ دے' دنیا کے سارے مذہبوں نے کم وبیش اس کی کوشش کی ہے اور دنیا کے آخری مذہب ''اسلام'' نے بھی یہی کیا ہے' آئندہ ابواب میں اسلام کی انہی کوششوں کا جائزہ لینا

ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے' اس کو تفصیل سے بتایا ہے۔

اسلام اور اخلاق حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سارے مذہبوں کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے چنانچہ اس عرصۂ ہستی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے' سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے' انصاف بھلائی اور ظلم برائی ہے' خیرات نیکی اور چوہدری بدی ہے لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بعثت لا تمم حسن الاخلاق (مئوطا مالك حسن اخلاق)

میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیئے بھیجا گیا ہوں۔

یہ امام مالک کی مئوطا کی روایت ہے' مسند احمد' بیہقی اور ابن سعد (۱)۔ میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا:

انما ابعثت لا تمم مكارم الاخلاق

میں تو اسی لیئے بھیجا گیا کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں۔

چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا ابھی آپ ﷺ مکہ ہی میں تھے کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کی حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لیئے مکہ بھیجا' انہوں نے واپس آ کر اس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی' وہ یہ تھے:

رایته یامر بمكارم الاخلاق۔ (۱)۔

میں نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلوا کر اسلام کی نسبت

تحقیقات کی' اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

''اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے' بتوں کو پوجتے تھے' مردار کھاتے تھے' بدکاریاں کرتے تھے' ہمسائیوں کو ستاتے تھے' بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا' زبردست' زیردستوں کو کھا جاتے تھے' اس اثناء میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا' اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں' سچ بولیں' خون ریزی سے باز آئیں' یتیموں کا مال نہ کھائیں' ہمسایوں کو آرام دیں' عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔ (۳)۔''

اسی طرح قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ خدا کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ ''وہ پاکدامنی اختیار کریں سچ بولیں' اور قرابت کا حق ادا کریں۔ (۴)۔''

---

(۱)۔ کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵ حیدر آباد و زرقانی شرح مموطا جلد ٤ صفحہ ۹۲ مطبع کستیلہ مصر ۱۲۸۰ھ (۲)۔ صحیح مسلم مناقب ابی ذر جلد ۲ صفحہ ۳٤۹ مصر۔ (۳)۔ ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۰۲ و مستدرک حاکم حیدر آباد جلد ۲ صفحہ ۳۱۰ و ابن ہشام ذکر واقعہ ہجرت۔ (٤)۔ صحیح بخاری کتاب الوحی و کتاب الجہاد ۱۲۔

قرآن مجید نے جابجا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف میں کہا ہے:

ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔
(جمعہ: ۱)

یہ پیغمبر ان ان پڑھ جاہلوں کو پاک وصاف کرتا اور ان کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوس انسانی کو جلا دیں' ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور ان کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کیئے گئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن دونوں آپ کی اس خصوصیت کے قائل تھے۔

۲۔حکمت: اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے' گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ میں کی جا چکی ہے مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اس علم و عرفان کے معنی میں ہے' جو نور الٰہی کی صورت میں نبی ﷺ کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار و مظاہر رسول ﷺ کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و احکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں' وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس علم و عرفان کے ان عملی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے' قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کون باتیں داخل ہیں' سورۂ بنی اسرائیل میں توحید' والدین کی اطاعت و تعلیم' قرابت داروں اور محتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی' بخل' اولاد کشی' بدکاری' کسی بے گناہ کی جان لینے اور یتیموں کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے' ٹھیک ناپنے اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے' اس کے بعد ارشاد ہے:

ذلك مما اوحى اليك ربك من الحكمة ط (ع:۴)

یہ حکمت کی ان باتوں میں ہے جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا۔

سورۂ لقمان میں ہے کہ:

ولقد اتينا لقمان الحكمة ان اشكر لله (ع:۲)

اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں کہ خدا کا شکر ادا

کر۔

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے کہ ''کسی کو خدا کا شریک نہ بنا' والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش' آ نماز پڑھا کر' لوگوں کو بھلی بات کرنے کو کہہ' اور بری بات سے باز رکھ' مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی میں ان فطری امور خیر کو بھی جن کا خیر ہونا فطرتاً تمام قوموں اور مذہبوں میں مسلم ہے جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں ''حکمت'' کہا گیا ہے۔''

اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت میں اخلاق کا مرتبہ اور پایہ یہ ہے کہ ان کو ''حکمت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور قرآن پاک کے اس اظہار حقیقت سے کہ وحی محمدی کتاب اور حکمت دونوں پر برابر مشتمل ہے' یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادت اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں' خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہے' فرمایا:

یاایھا الذین امنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا ربکم
وافعلوا الخیر لعلکم تفلحون۔ (حج: ۱)
اے ایمان والو! رکوع کرو' سجدہ کرو' اپنے رب کو پوجو' اور نیکی
کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

گویا ایمان کے روح کے بعد دعوت محمدی ﷺ کے جسم کے دو بازو ہیں' ایک عبادت اور دوسرا اخلاق ایک خالق کا حق اور دوسرا مخلوق کا اور انہی کے مجموعہ کا نام ''اسلام'' ہے۔

حقوق عباد کی اہمیت::

ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تعلیم محمدی نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے' اخلاق حقوق عباد یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے اور عبادات' حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہیں' اللہ

تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہیں اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے۔ مگر حقوق عباد یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی خدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے جن کے حق میں ظلم اور تعدی ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہو سکتی جو اس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہے' اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا تو اس (ظالم بھائی) کو چاہئے کہ اس دنیا میں وہ اس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرا لے' ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لیئے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا' صرف اعمال ہوں گے' ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔ (۱)۔'' ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت میں نامہ اعمال کی تین فردیں ہوں گی' ایک وہ جس کی کوئی پرواہ خدا نہ کرے گا۔ دوسری وہ جس میں سے خدا ایک حرف کو بھی نہ چھوڑے گا' اور تیسری وہ جس میں سے کچھ نہ معاف فرمائے گا۔ جس فرد کے گناہ معاف نہ ہوں گے وہ شرک ہے اور جس فرد کی کوئی پرواہ اس کو نہ ہوگی تو وہ ظلم ہے جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے خدا کے درمیان ہے' جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو۔ یا نماز نہ پڑھی ہو تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہئے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کر دے گا اور بخش دے گا' لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے دوسرے بندہ پر کیا ہے۔ (مسند احمد و حاکم عن عائشہ) اس سے معلوم ہوا کہ معاملات انسانی میں جو تجاوز اور ظلم ہوگا۔ اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ (۲)۔ چنانچہ اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اس وقت تک بندہ پر عائد نہیں کی ہے جب تک وہ اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کر لے' اور زکوٰۃ بندہ کے اسی

مال میں فرض کی ہے جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے مصارف سے زیادہ ہو' یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اس وقت تک بندہ پر واجب نہیں کیا جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہولیا۔

اسلام کے ارکان پنجگانہ اور اخلاق::

بعض ان حدیثوں کی بنا پر جن میں اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز روزہ' حج' اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے' بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ اسلام کی عمارت میں اخلاق حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاق حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے' قرآن پاک میں یہ لفظ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتوں سے باز رکھتی ہے' روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ وہ تقوی کی تعلیم دیتا ہے' زکوٰۃ سرتاپا انسانی ہمدردی اور غم خواری کا سبق ہے اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح وترقی کا ذریعہ اور اپنی دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ احکام الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں' وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں' وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں' وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں۔ قرآن پاک اور تعلیم نبوی ﷺ کے جو اشارات اس باب میں ہیں' حضرات صوفیہ نے اپنی تالیفات میں ان کی پوری تشریح کر دی ہے۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصاص یوم القیامۃ ص

۹۶۷ (۲)۔ یہ اصول فقہ کا مسئلہ ہے دیکھو ہدایہ کتاب الحج ص ۲۱۳ مرتبہ مولانا عبدالحی مرحوم۔

امام غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لیئے کھڑی کرو اور فرمایا کہ بھولنے والوں میں نہ ہو' اور فرمایا کہ نشہ کی حالت میں اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو' کتنے نمازی ہیں جنہوں نے گو شراب نہیں پی۔ مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن میں کسی دنیاوی چیز کا دھیان نہ آئے تو خدا کی اس کے گناہ کو معاف کر دے گا پھر فرمایا کہ نماز عاجزی' فروتنی' زاری' دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے' اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو "اے میرے اللہ!" جس نے یہ بات نہیں پیدا کی' اس کی نماز ناقص ہے اور اگلی کتابوں میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک نماز قبول نہیں کرتا۔ میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری بڑائی کے سامنے سرنگوں ہے۔ میرے بندوں پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا اور جو بھوکے محتاج کو میرے لیئے کھانا کھلاتا ہے۔" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "نماز اسی لیئے فرض کی گئی اور اسی لیئے حج کے ارکان بنائے گئے تا کہ خدا کی یاد کی جائے" تو اگر دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو جو مقصود ہے تو اس یاد الٰہی کی قدر و قیمت کیا ہے' حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی ہے۔(۱)۔"

اس اخیر کی حدیث کی ابن جریر' ابن ابی حاتم اور دوسرے اہل تفسیر محدثوں نے اپنی کتابوں میں بسند ذکر کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (سورۂ عنکبوت) میں ان تمام روایتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ اس حدیث کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ "جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے اس کی نماز ہی نہیں۔(۲)۔" اسی قسم کے الفاظ روزوں کے متعلق آپ ﷺ نے فرمائے ارشاد ہوا کہ "روزہ رکھ کر بھی

ان آیتوں میں اہل ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے' ان میں وقار و تمکنت ولغویات سے اعراض فیاضی (زکوٰۃ) پاکدامنی اور ایفائے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے۔

اخلاق حسنہ اور تقوی::

اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی نیکیوں کی محرک ہے' تقوی ہے' وحی محمدی ﷺ نے تصریح کر دی ہے کہ تقوی والے لوگ وہی ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں:

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغربط ولکن البر من امن باللہ والیوم الاخر والملئکہت والکتب والنبین واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتمی والمسکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوہت واتی الزکوہت والموفون بعھدھم اذا علھدوا والصبرین فی البلساء والضرآء وحین البلسط اولئک الذین صدقواط واولئک ھم المتقون۔ (بقرہ: ۲۲)

نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو خدا پر' قیامت پر' فرشتوں پر کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور مال کی خواہش کے باوجود (یا خدا کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں کو' یتیموں کو' غریبوں کو' مسافر کو' مانگنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ دیتا رہا اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت تکلیف اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں' وہی ہیں جو راستباز ہیں اور یہی تقوی والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ راستبازی اور تقوی کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے، اسی طرح ان کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی، ایفائے عہد اور صبر و ثبات وغیرہ بھی ہیں۔

اخلاق حسنہ اور خدا کے نیک بندہ ہونے کا شرف::

محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم میں خدا کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیئے گئے جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں اور وہی باتیں خدا کے نزدیک ان کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں، چنانچہ سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا:

وعباد الرحمن الذين يمشون على الارض هونا واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلما والذين يبيتون لربهم سجدا وقياما۔ والذين يقولون ربنا اصرف عنا عذاب جهنم ان عذابها كان غراما انها ساءت مستقرا ومقاما والذين اذا انفقوا الم يسرفوا ولم يقتروا وكان بين ذلك قواما والذين لا يدعون مع الله الها اخر ولا

اور رحم والے خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب ناسمجھ لوگ ان سے بات کریں تو وہ سلام کہیں اور جو اپنے پروردگار کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گزارتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب دور کر، اس کا عذاب بڑا تاوان ہے اور جہنم کا برا ٹھکانہ اور مقام ہے اور جو خرچ جب کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں بلکہ ان

يقتلون النفس التي حرم الله الا بالحق ولا يزنون ومن يفعل ذلك يلق اثاما۔۔۔ والذين لا يشهدون الزور واذا مروا باللغو مروا كراما والذين اذا ذكروا بايت ربهم لم يخروا عليها صما وعميانا والذين يقولون ربنا هب لنا من ازواجنا وذريتنا قرت اعين

واجعلنا للمتقین اماما۔ (فرقان:۲)

دونوں کے بیچ سے وہ سیدھے گزریں' اور جو خدا کے ساتھ کسی اور خدا کو نہیں پکارتے اور جو کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے جس کو خدا نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا۔۔۔۔ اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کبھی لغو بات پر گزرتے ہیں تو سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں اور جب خدا کی نشانیاں ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت میں عفو و درگزر و میانہ روی اور قتل و خونریزی اور بدکاری نہ کرنا اور مکروزور میں شریک نہ ہونا وغیرہ اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں۔

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف::

وہ لوگ جو خدا کے پیارے اور مقبول بندے ہیں' محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانی ان کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں:

وعلی ربھم یتوکلون والذین یجتنبون کبرالاثم والفواحش واذا ما غضبوا ھم یغفرون۔ والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوہت وامرھم شوری بینھم ومما رزقنھم ینفقون والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون وجزآء سیئہت سیئہت مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظالمین ولمن انتصر بعد ظلمہ فاولئك ما علیھم من سبیل انما السبیل علی الذین یظلمون الناس و یبغون فی الارض بغیر الحق اولئك لھم عذاب الیم ولمن صبر

و غفران ذلك لمن عزم لامور۔(شوریٰ:۴)اعدت للمتقین الذین ینفقون فی السرآء والضرآء والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین۔ (آل عمران:۱۴)

اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں' نماز ادا کرتے ہیں اور ان کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں اور ہم نے ان کو جو دیا ہے اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں اور جب ان پر چڑھائی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے تو جو کوئی معاف کردے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے' وہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا اور اگر کوئی مظلوم ہو کہ بدلہ لے لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ ملامت تو ان پر ہے' جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں ان کے لیئے بڑا دردناک عذاب ہے اور بے شبہ جو (مظلوم ہونے پر بھی) ظالم کو معاف کردے اور سہہ لے تو یہ ہمت کے کام ہیں جنت ان پرہیزگاروں کے لیئے تیار کی گئی ہے جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں خدا کی راہ میں کچھ خرچتے ہیں اور جو غصہ کو دباتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اولئك یؤتون اجرھم مرتین بما صبروا ویدرء ون بالحسنت السیئت ومما رزقنھم ینفقون واذ اسمعوا اللغو عرضوا عنه وقالوا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم سلام علیکم لا نبتغی الجاھلین۔ (قصص:۲)

یہ وہ ہیں جن کو دہرا ثواب ملے گا اس لیئے انہوں نے صبر کیا۔
اور وہ برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے
اس سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جب کوئی
بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور کہہ
دیتے ہیں کہ ہمارے لیئے ہمارا عمل اور تمہارے لیئے تمہارا
عمل ہے تم سلامت رہو ہم نا سمجھوں کو نہیں چاہتے۔

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا و یتیما و اسیرا۔
(دہر: ۱)

اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے مسکین، یتیم اور قیدی
کو کھلا دیتے ہیں۔

ان آیتوں کی اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی وہ احادیث میں محفوظ ہے، ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے؟

اخلاق حسنہ کا درجہ اسلام میں ::

اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز میں جو دعا مانگتے تھے اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا:

واھدنی لاحسن الاخلاق لا یھدی لاحسنھا الا انت واصرف عنی سیئاتھا لایصرف عنی سیئاتھا الا انت۔ (مسلم باب الدعاء فی الصلوٰۃ)

اور اے میرے خدا! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کا رہنما کر
تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور
برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو کوئی نہیں پھیر سکتا،
لیکن تو۔

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے وہ حسن اخلاق ہے۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے فرمایا:

اکمل المئومنین ایمانا احسنھم خلقا۔

مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔

یہ حدیث ترمذی، ابن حنبل، ابوداؤد، حاکم اور ابن حبان میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے وہ حسن اخلاق ہے کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔

اسلام میں نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے لیکن اخلاق حسنہ کو بھی ان کی قائم مقامی کا شرف کبھی کبھی حاصل ہوجاتا ہے، ارشاد ہوا:

ان الرجل لیدرک بحسن خلقہ درجہت قائم اللیل وصوم النھار۔

انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ حدیث چند ہم معنی لفظوں کے الٹ پھیر سے ابوداؤد، ابن حنبل، حاکم، ابن حبان اور طبرانی میں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہوسکتا ہے وہی درجہ حسن خلق سے بھی حاصل ہوسکتا ہے، حسن اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے۔

اسلام میں اخلاق وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے فرمایا:

خیار کم احسنکم اخلاقا (بخاری کتاب الادب)
تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

ایک اور حدیث میں ہے:

ما من شی ء یوضع فی المیزان اثقل من حسن الخلق فان صاحب حسن الخلق لیبلغ به درجه صاحب الصوم و الصلوبت۔

(قیامت کی) ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی کہ حسن اخلاق والا اپنے حسن خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کرسکتا ہے۔

یہ حدیث ترمذی میں انہی الفاظ کے ساتھ ہے' لیکن حدیث کی دوسری کتابوں (حاکم' ابن حبان' ابن حنبل' ابوداؤد) مختصر اصرف پہلا ٹکڑا ہے یعنی یہ کہ "حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو میں نہیں۔" اس حدیث نبوی نے پوری طرح واضح کردیا کہ اسلام کی میزان میں حسن اخلاق سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں' ایک اور حدیث میں ہے کہ بندہ کو خدا کی طرف سے جو کچھ ملا ہے اس میں حسن اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے۔

خیر ما اعطی الناس خلق حسن۔

لوگوں کو قدرت الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم' نسائی' ابن حنبل' طبرانی اور ابن ابی شیبہ میں ہے' اس بشارت نے اخلاق حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتوں سے بالاتر بنادیا' ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

احب عباد الله الی الله احسنهم اخلاقا۔ (طبرانی)
اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے

اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسن خدا کی محبت کا ذریعہ ہے اور دراصل رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے' فرمایا:

(۱)۔ یہ تمام حدیثیں کنزالعمال جلد ثانی کتاب الاخلاق باب اول سے ماخوذ ہیں۔

انی احبکم الی واقربکم منی فی الاخرہت مجالس محاسنکم اخلاقا و ان ابغضکم الی وابعد کم منی فی الاخرہت مساویکم اخلاقا۔

تم میں میرا سب سے پیارا اور نشست میں مجھ سب سے نزدیک وہ ہیں جو تم میں خوش خلقی ہیں اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بداخلاقی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں دو صحابی بیویاں تھیں' ایک رات بھر نماز پڑھتیں' دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں' مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک میں کیئے رکھتی تھیں' دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں' آنحضرت ﷺ سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا تو آپ ~ صل۳ ~ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ ''اس میں کوئی نیکی نہیں وہ اپنی بدخلقی کی سزا بھگتے گی'' اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ ''وہ جنتی ہوگی۔(۱)۔ان دونوں بیویوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زبان فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔''

حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھایئے جو مجھے جنت کو لیجائے فرمایا۔ ''انسان کو غلامی سے آزاد کر' انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ اگر تو یہ نہ کر سکے تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا' اور نیکی بتا اور

برائی سے روک' اگر یہ بھی نہ کر سکتے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک (۲)۔'' غور کیجئے کہ یہ حدیث اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے۔

ایمان کے اوصاف ولوازم::

ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف و اخلاق' ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہیں' جس قدر ان لوازم اور خصوصیات میں زیادتی اور کمی ہوگی' گویا اسی قدر اس ایمان کے منشا میں زیادتی و کمی ہوگی یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق' ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیر دامن کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا:

۱۔ ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں' جن میں سے ایک حیا ہے۔

۲۔ ایمان کی بہت سی شاخیں جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف کی چیز کو ہٹا دو (تا کہ تمہارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو۔)

۳۔ جس میں تین باتیں ہوں' اس نے ایمان کا مزہ پایا۔ جس (۱)۔ کو خدا اور اس کا رسول سب پیارا ہو' جو دوسرے (۲)۔ کو صرف خدا کے لیئے پیار کرے' اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔

۴۔ جس میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پایا۔ حق (۳)۔ بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا۔ مزاحمت (۴)۔ کے باوجود جھوٹ نہ بولنا' اور یقین (۵)۔ کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہٹ نہیں سکتا تھا۔

---

(۱)۔ ادب المفرد امام بخاری باب من لا یوذی جارہ۔ (۲)۔ مشکل

۵۔تین باتیں ایمان کا جز ہیں' مفلسی (۱)۔میں بھی خدا کی راہ میں دینا۔دنیا (۲)۔ میں امن اور سلامتی پھیلانا اور خود (۳)۔اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔

۶۔تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا ہے جب تک اپنے بھائی کے لیئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیئے کرتا ہے۔

۷۔مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنا جان و مال اس کی ضمانت میں دے دیں۔

۸۔ایک شخص آ کر پوچھتا ہے یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟فرمایا (بھوکوں کو) کھانا کھلانا اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا (سلام کرنا۔)

۹۔ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے خدا کے رسول ﷺ اسلام کیا ہے؟فرمایا اچھی بات بولنا' اور کھانا کھلانا' پھر پوچھا ایمان کیا ہے؟فرمایا صبر کرنا اور اخلاقی جوانمردی دکھانا (سماعت۔)

۱۰۔مومن وہ ہے جو دوسروں سے الفت کرتا ہے اور جو نہ دوسرے سے الفت کرتا اور نہ کوئی اس سے الفت کرتا ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

۱۱۔مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے نہ کسی کو بددعا دیتا ہے اور نہ گالی دیتا ہے اور نہ بدزبان ہوتا ہے۔

۱۲۔ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے' نہ اس پر وہ ظلم کرے اور نہ اس کو گالی دے' جو اپنی کسی بھائی کی مدد میں ہوگا' خدا اس کی مدد میں ہوگا' جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو خدا اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔

۱۳۔مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں' مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے

لوگ سلامت رہیں، مہاجر وہ ہے جسنے بدی کو چھوڑ دیا ہے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو۔

۱۴۔ جو صاحب ایمان ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔

۱۵۔ بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہے بولے تو جھوٹ بولے۔ وعدہ کرے تو خلاف کرے، اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔ (۱)۔

ان مذکورہ بالا حدیثیں میں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہئے کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے۔

---

(۱)۔ یہ تمام حدیثیں معتبر و مستند کتب حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں، ہم نے ان کو مجمع الفوائد اور کنز العمال جلد اول کتاب الایمان سے لیا ہے، کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں مگر ہم نے ان کے انتخاب میں مشہور و معتبر حدیثوں کو ترجیح دی ہے۔

اخلاق حسنہ صفات الٰہی کا سایہ ہیں::

لیکن اسلام نے اخلاق حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاق حسنہ درحقیقت صفات الٰہی کا سایہ اور ظل ہیں اور اسی کی صفات کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا حسن الخلق خلق اللہ الاعظم (طبرانی) یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں جو صفات ربانی کا عکس ہیں اور انہیں کو برا کہتے ہیں جو خدا کی صفات کے منافی ہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے اس کا واحد ہونا، یا خالق ہونا، نیز بعض ایسی پرجلال صفتیں ہیں جو صرف خدا ہی کو زیبا ہیں جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ۔ اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے کہ ان کی مقابل

کی صفتیں اس میں پیدا ہوں' خدا کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاکساری اور تواضع ہو اور خدا کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی ہو۔ الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لیئے قرار دیا ہے کہ وہ صفات الٰہی کے انوار کے کسب وفیض کا سبب ہے' ہم جس حد تک اس کسب وفیض میں ترقی کریں گے' ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے۔ اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں۔

---

(۱) ہم نے اسمائے الٰہی کی بحث میں اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کر دی ہے دیکھو سیرت جلد چہارم طبع اول صفحات ۳۸٤' ٤۰٥۔

اخلاقی معلموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلم پیدا ہوئے جن کے مکتب میں آ کر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانو تہہ کیا' اور آداب و اخلاق کے وہ سبق ان سے حاصل کیئے جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی اب تک ان کو یاد ہیں اور سچ یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کا کوئی نمونہ ہے وہ انہی کے صحیفہ تعلیم کا ایک ورق ہے مگر ایک تنقیدی نظر یہ بتا دے گی کہ ان اخلاقی استادوں میں باہمی نسبت کیا ہے؟ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے ان میں درسگاہ عالم کے سب سے آخری معلم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کیا امتیاز حاصل ہے۔

آنحضرت ﷺ سے پہلے نوع انسانی کے اخلاقی معلمین کی دو جماعتیں ہیں' ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی آخروی مذہب پر رکھی جیسے عام انبیاء علیہم السلام' اور بعض مذہبوں کے بانی' دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ وحکمت اور عقل ودانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی' ہم ان میں سے اول کو انبیاء اور مصلحین دین اور دوسری کو حکماء کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں' ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس وتعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کیئے۔ پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا ماخذ ''حکم خداوندی'' کو قرار دیا۔ اس حکم وفرمان الٰہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں' نہ ان کی تعلیمات میں علت ومعلول کا سلسلہ ہے' نہ اخلاق کے دقیق نکتوں کی گرہ کشائی ہے اور نہ احکام وتعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے' دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت ومعلول کی تحقیق' نفسیاتی خواص کی بحث اخلاق کی غرض وغایت کی تعین' قوائے عملی کی تحدید' یہ سب کچھ ہے مگر بحث ونظر سے آگے عمل کا درجہ صفر محض ہے' اگر ہے تو بے کیف اور بے مدت مگر:

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکم خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی' فرمان الٰہی اور اخلاقی

نکتہ دری، امر ربانی اور حکم فطرت کتاب اور حکمت کی آمیزش ہے۔

انبیاء اور حکماء میں جو اصلی فرق اور امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کی معصوم زندگی، ان کے مقدس کارنامے اور ان کے پاک اثرات ہوتے ہیں، جن کا فیض ان کے ہر بن مو سے خیر و برکت کی سلسبیل بن کر نکلتا ہے اور پیاسوں کو سیراب کرتا ہے لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز جس کی اخلاقی سخن طرازی، اور نکتہ پروری سے دنیا محو حیرت ہے اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے، عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوگی وہ گو دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے، مگر خود تاریکی سے باہر نہیں آتا، وہ دوسروں کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے مگر خود عمل کی راہ میں بھٹکتا پھرتا ہے، وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے، مگر غریبوں پر رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں جانتا، وہ سچائی اور راستبازی پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے مگر وہ خود سچا اور راست باز نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے، دل اور ہاتھ نہیں، اس لیئے اس کے منہ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی بلکہ ہوا کے تموج میں مل کر بے نشان ہو جاتی ہے، اور انبیاء علیہم السلام چونکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں، جو ان کی تعلیم ہے وہی ان کا عمل ہے جو ان کے منہ پر ہے وہی دل میں ہے۔ اس لیئے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا اور ہم نشینوں کو معطر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیاء اور حکماء یعنی موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ علیہم السلام اور سقراط، افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہے، سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں جو موسیٰ، عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہنچیں، اور آج زمین کے کرہ پر جہاں

کہیں بھی حسن اخلاق کی کوئی کرن ہے وہ نبوت ہی کے کسی مطلع انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔

مگر اس وصف میں سارے انبیاء علیہم السلام یکساں نہیں ہیں بلکہ ان کے مختلف مدارج ہیں' ان کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ اس درجہ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہوتا کہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق اور اہل صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں اور پھر وہ روایتوں کے اوراق میں محفوظ ہیں تا کہ بعد کے آنے والے بھی اس نشان قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں' الغرض ایک کامل ومکمل اور آخری معلم کے لیئے حسب ذیل معیاروں پر اترنا ضروری ہے۔

۱۔

اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔

۲۔

اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔

۳۔

اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لیئے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پردہ زندگی::

تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیاء اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبر اسلام علیہ السلام کی حیات پاک کے برابر جامع کمالات نہیں دینا کا کوئی پیغمبر بانی مذہب ایسا نہیں ہے جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے تو راہ کے پیغمبروں میں سے کونسا پیغمبر ہے جس کے اخلاقی کمالات

ہمارے علم میں ہیں' ان غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے جن کو تو راہ کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے اور قرآن نے ہر جگہ ان کو بیہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے' حضرت نوحؑ سے لیکر حضرت موسیٰ علیہما السلام تک تو راہ کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں اور کیا ان کی اخلاقی شکل وصورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تینتیس برس کی زندگی میں صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی معجزات وخوراق کے سوا کوئی اور حالت بہت کم معلوم ہے ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں۔

ان انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان' ایران اور چین کے بانیان مذہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہا تو معلوم ہوگا کہ اس کے لیئے دنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں۔ کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔

صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ ''یہاں (سیرت محمدی ﷺ) پورے دن کی روشنی ہے جن میں محمد ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو روز روشن کی طرح نمایاں (۱)۔ ہے'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ' محرمان راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو' اس کو جلوت میں برملا بیان کر جو حجرہ میں کہتے سنو اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو' الا فلیبلغ الشاھد الغائب۔

قول کے ساتھ عمل::

اب دوسری حیثیت سے غور کیجئے' ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی' اخلاقی احکام

کی خوبی اور مواعظ و نصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہ زیتون کے پر تاثیر واعظ (حضرت عیسیٰؑ) کی معصومانہ باتیں، سچائی اور راست بازی کی نصیحتیں اور لفظی صنائع و بدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے سنیں اور ان کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن میں ہے مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''سب کچھ جو تمہارے پاس ہے جب تک اس کو خدا کی راہ میں لٹا نہ دو'' آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگے۔ (۲)۔ کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ میں لٹایا۔ وہ جس نے یہ کہا کہ ''دشمنوں کو بھی پیار کرو'' کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر'' کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا۔ وہ جس نے کہا کہ ''اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو'' کیا اس نے خود بھی ایسا کیا۔ وہ جس نے یہ کہا کہ ''تم سے اگر کوئی تمہارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو۔'' کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیح میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں بلکہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے اس کو کر کے دکھایا اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ تامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم (بقرہ: ۵) (کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو) اور مسلمانوں کو متنبہ کیا

لم تقولون مالا تفعلون کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون

(تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، بڑی بیزاری ہے اللہ کے

یہاں کہ وہ جو نہ کرو۔)

ایک شخص نے آ کرام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا۔ کان خلقہ القران جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے وہی

---

(۱)۔ بامسورتھ سمتھ کی کتاب سیرت محمدی حصل ۳ ص ۱۰۸

(۲)۔ انجیل

حامل قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا۔ اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا' خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا' اگر آپ اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا' کھانے میں زہر دینے والوں سے درگزر کیا' اپنی ذات کے لیئے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ جنہوں نے آپ پر تلواریں چلائیں' مسلح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا' کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت بھی جس نے آپ ﷺ سے کپڑا مانگا خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی۔ سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور راہنماؤں کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں' دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیات کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہمعصروں کے سامنے پیش نہیں کیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیات کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لیئے پیش کیا' فرمایا:

فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون۔

اپنے اپنے پیشہ وفن کے مطابق آپ ~ صل ۳~ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں مدنیتہ النبی ~ صل ۳~ کی اس درس گاہ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے اور جس کا نام مسجد نبوی تھا اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں کہیں ابو بکر ~ رضی ۲~ و عمر ~ رضی ۲~ عثمان ~ رضی ۲~ و علی ~ رضی ۲ ~ جیسے فرماں روا زیر تعلیم ہیں کہیں طلحہ ~ رضی ۲ ~ و زبیر و معاویہ ~ رضی ۲~ وسعد ~ رضی ۲~ بن معاذ ~ رضی ۲~ بن زبیر جیسے ارباب رائے وتدبیر ہیں کہیں خالد ~ رضی ۲~ ' ابوعبیدہ ~ رضی ۲~ سعد بن ابی وقاص ~ رضی ۲~ عمرو بن العاص ~ رضی ۲~ جیسے سپہ سالار ہیں کہیں وہ جو بعد کو صوبوں کے حکمرانوں' عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے کہیں ان زہاد وعباد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں کہیں ابوذر ~ رضی ۲~ سلیمان و ابوداؤد ~ رضی ۲~ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو ''مسیح اسلام'' کہلاتے تھے کہیں وہ صفہ والے طالب علم تھے جو جنگل سے لکڑی لاکر بیچتے اور گذارہ کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے کہیں حضرت علی ~ رضی ۲~ ' حضرت عائشہ ~ رضی ۵~ حضرت ابن عباس ~ رضی ۲~ ' حضرت ابن مسعود ~ رضی ۲~ حضرت زید بن ثابت ~ رضی ۲~ جیسے فقیہ ومحدث تھے جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے کہیں غریبوں کی نشست ہے اور کہیں دولتمندوں کی مجلس ہے مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی ' سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اخلاق واعمال کے ایک ہی آئینہ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں (۱)۔۔

---

(۱)۔ اس موقع پر مدراس والے میرے چھ خطبوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

ان اصولوں کی تفصیل وتشریح کیلئے ہم کو تھوڑی دیر کیلئے فلسفۂ اخلاق کے کانٹوں میں الجھنا ہوگا۔ اخلاق کا وجود یقیناً اس وقت سے ہے جب سے انسان کی زندگی اور اس کے ذہنی وجسمانی اعمال کا وجود ہے، مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث، ان کے اسباب وعلل کی تلاش، ان کے اصولوں قوانین کی تحقیق اور ان کی غرض و غایت کی تعین یونانیوں کے عہد میں شروع ہوئی اور موجودہ عہد میں علم نفسیات کے زیر سایہ پرانے نظریوں پر نظر ثانی کی گئی، ان اسباب وعلل، اصول وقوانین اور غرض وغایت کی تحقیق میں شروع سے آج تک فلسفیوں میں قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے، ہر سوال کے جواب میں متعدد نظریے بنتے اور بگڑتے رہے، اور نئے نئے فرقے اور سکول پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے، تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب انہی دو قدیم مسلکوں کی تشریح ہیں جنہیں یونانی اصطلاح میں ''رواقیہ'' اور ''لذیۃ'' کہا گیا ہے۔ موجودہ اصطلاح میں پہلے کو ''ضمیریہ'' اور دوسرے کو ''افادیہ'' کہہ لیجئے، یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یوں کہئے، پہلا فریق اخلاق کی بنا ''جذبات'' پر قرار دیتا ہے اور دوسرا ''عقل'' پر پھر اس منشائے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے، ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا منتہی نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے۔

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل مماخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں، علمائے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون، خدا کا قانون، فطرت کا قانون، حاسۂ اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیت اور پھر بالآخر عقل کا قانون کہہ کر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے، لیکن درحقیقت ان کی بھی دو ہی اصلی تقسیمیں ہیں، یعنی یہ کہ یہ قوانین اخلاق کسی وحی والہام سے ماخوذ ہیں یا کسی بیرونی ماخذ سے، جو لوگ وحی والہام پر ایمان نہ لا سکے، انہوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار

دینا چاہا۔ پھر کسی بیرونی ماخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا اور کسی نے اس سے باہر جنہوں نے خود انسان کے اندر تلاش کیا۔ انہوں نے باختلاف مذاق انسان کی اصل فطرت کو انسان میں ایک خاص حاسۂ اخلاقی کو' انسان کے وجدان کو' انسان میں ضمیر کو' اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا' جنہوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا' انہوں نے قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم اور سوسائٹی کے رسم و رواج کو ان کا ماخذ قرار دیا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم' یا بادشاہ کا حکم یا سوسائٹی کے رسم و رواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی' اس لیئے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل منبع قرار دینا ہوگا' ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے مصنوعی اور ساختہ پرداختہ بتانا پڑے گا۔ جو اخلاق کے امہات مسائل میں کبھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اخلاق کا مماخذ خدا کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو' لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ خدا نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا ہے اور اپنے بندوں کی فطرت میں ودیعت بھی رکھا ہے تا کہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکام الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کر دے فلسفیانہ کاوشوں اور موشگافیوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں' ہو سکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذ خدا کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی مماخذ اور محرکات' ضمیر' فطرت' وجدان اور عقل سب ہوں اسی طرح معیار اخلاق کے اختلافات میں بھی توافق ممکن ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال میں لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے یا اس کے ساتھ کسی مصلحت عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ

ہو اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب جہتیں ایک کام میں مجتمع ہو سکتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد خدا کا حکم بھی ہے اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے' ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ بہت سے ایسے مواقع بھی ہو سکتے ہیں' جہاں خدا' ضمیر' فطرت' جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جاری ہو اسی لیئے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قوی کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے اصلاح کے لائق ہے۔

الغرض خدا کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہیے' وجدان کہیے' حاسۂ اخلاقی کے لیئے ضمیر کہیے اس فلسفیانہ تشقیق سے اس کو بحث نہیں اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر مبنی سمجھتا ہے' اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں جن کی اچھائی یا برائی پر آب و ہوا خصوصیات اقلیم' زبان' مذہب' رسم و رواج' طرز حکومت وغیرہ صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلا دلیل متفق اور متحد ہیں' اس لیئے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرتاً ودیعت ہے جس طرح دوسرے قوی اور حواس ودیعت ہیں۔ اب یہ کاوش کہ جس طرح مرئیات' مسموعات اور ملموسات وغیرہ کے لیئے ہمارے اندر باصرہ' سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسے ہیں اسی طرح اخلاقی تمیز کے لیئے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے جس سے

ہم اخلاق کی اچھائی یا برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں' یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے جس کے ذریعے سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں۔ جس طرح ہم دوسرے وجدانیات جیسے حسن و قبح خوبصورتی اور بدصورتی کا' یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو بروقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا برا عملی حیثیت سے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔

تعلیم محمدی ﷺ نے گو اخلاق کے ان اصول و مبانی کی طرح کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی اشارات کیئے ہیں مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی ان کے علم و فلسفہ میں نہیں بلکہ ان کے عمل میں ہے اس لیئے ''علم بلا عمل'' کی کوئی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں نہیں لیکن اسی کے ساتھ ''عمل بلا علم'' کو بھی اس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے' اسی بنا پر اس نے ان اصولوں کی طرف اشارے تو کیئے ہیں مگر اخلاق کے باب میں اس کی عالمانہ تحقیق و تلاش کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کیئے جائیں کہ یہ خدا کے احکام ہیں' وہ خدا کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں۔ انہی احکام الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر' وجدان اخلاقی حاسہ اور عقل میں سے جس ایک کو یا سب کو اصل کیسے ہونا چاہئے ان میں باہم جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہوگی' اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس حد تک ان میں کمی ہوگی اسی حد تک اس کے کمال میں نقص ہوگا۔

ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ خدا کا حکم ہے' پھر کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہئے' اس کا وجدان بھی ہو۔ اس کو وہ اپنا فرض بھی جانے اس کے کرنے میں وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے اور اسی کی پیروی میں نوع انسان کی کثیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قوی میں اس بارہ میں باہم موافقت اور یکسانی ہوگی اتنا ہی اس کا

روحانی کمال بلند ہوگا اور جس قدر اس توافق میں کمی ہوگی کہ خدا کا حکم سمجھ کر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو' یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے یا اس سے اس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو' اسی قدر اس کے روحانی اور ایمانی کمال میں نقص پیدا ہے' کتنا ہی نیک کام ہم خدا کا حکم سمجھ کر انجام دیں لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہیں سمجھتا اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو راہ سمجھاتی ہے تو اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ ابھی تک اس کے خدا کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہیں ہوا ہے جس کی دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہے۔ اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا حصول مسرت یا فائدہ عام کی غرض سے انجام دے' مگر خدا کے حکم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہ رکھے تو وہ کام بھی اسلام کی نظر میں ثواب اور تزکیہ روح کا ذریعہ نہیں۔

بے غرضی ::

چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے اس لیئے اس کی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دنیاوی' نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہئے' اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں' اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی' مذہبی کاموں کو چھوڑ کر دنیاوی کاموں پر بھی نظر ڈالیئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے اسی قدر وہ قابل قدر ہوتا ہے ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں اور اس کے سامنے کتنے ہی الوان نعمت چن دیں لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطر داری کی تہہ میں ذاتی نفع' یا ریا کاری یا نمائش یا خوشامد یا کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان و نمک ہی رکھ دیں تو اس کی

وقعت اور قدر و قیمت کی کوئی انتہا نہ رہے گی' تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدم اخلاص کے یہ اثرات ہیں تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔

نیت::

اسی لیئے آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض و غایت کو ہر اچھے اور برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا برا نہیں ہوتا' جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے ایک دو مثالوں سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی۔ ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لیئے بلایا کہ اس کو یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالیں گے یا سخت تکلیف پہنچائیں گے' اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے میں بہک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا اور وہاں اس کو اشرفیوں کی تھیلی راستہ میں پڑی ملی' گو تو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو' مگر اس بلانے والی کی نیت کی برائی میں اب بھی کوئی شک نہیں' اور نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے رات کو اندھیرے میں بلوا کر اس پر احسان کیا' لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے میں درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے اس کو بلوایا لیکن اتفاق سے وہ راستہ میں کسی گڑھے یا کنوئیں میں گر کر مر گیا تو وہ بلانے والا ابدی کے گناہ کا مرتکب نہ ہوگا کہ گو جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بری نہ تھی۔

ایک دوسری مثال فرض کیجئے' میری جیب میں روپیوں کا ایک بٹوہ تھا' اتفاق سے وہ راستہ میں گر گیا' جب میں راستہ سے واپس پلٹا تو ایک بٹوہ پڑا دیکھا اور دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے چپکے سے اٹھا لیا' تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے کسی برائی کا مرتکب نہیں ہوا مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کر چکا' لیکن فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوہ مجھ کو سڑک پر پڑا ملا' اور میں نے اس کو اپنا

سمجھ کر اٹھالیا تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہے' راستہ میں کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے' اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے' حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا تو پہلی صورت میں اس کا دل گنہگار ہو چکا اور دوسری صورت میں اس کی بے گناہی بالکل ظاہر ہے۔ نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ بھی فخر' نمائش' ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا' اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لیئے کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے تو اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا۔ سورہ آل عمران میں ہے:

ومن یرد ثواب الدنیا نئوته منها ومن یرد ثواب الاخرہت نئوته منها۔ (آل عمران:۱۵)

اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے' اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے۔

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو۔ اس کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں۔ فرمایا:

یایها الذین امنوا لا تبطلوا صدقتکم بالمن و الاذی کالذی ینفق مالئه رئاء الناس و لا یئومن بالله والیوم الاخر۔ (بقرہ:۲۶۴)

اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو احسان دھر کر اور ستا کر برباد نہ کرو' جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کیلئے خرچ کرتا ہے اور خدا اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔

اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کام تمام تر ارادہ کی صحیح جنت ہی کا بتلاتا ہے' جو اخلاقی احکام ہم کو لگاتے ہیں ان کا تعلق بھی ارادہ سے ہوتا ہے جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی اخلاقی حیثیت نہیں۔''

اس مسئلہ کی ایک دو مثالیں دے کر کینٹ کی رائے نقل کی ہے:

اسی لیئے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کی جس مشہور و معروف دعوئی کے ساتھ شروع کیا ہے اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے' وہ کہتا ہے کہ ''بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کو علی الاطلاق بلا کسی قید و شرط کے اچھا کہا جا سکے۔(۱)۔''

اخلاق کیلیئے ایمان کی شرط::

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنا ارادہ و نیت' یعنی قلب کے عمل پر ہے تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کیلیئے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے' ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں' تاہم کوئی ہے جس کی آنکھیں اس کے دل کی تہہ کو پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں' دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں' مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے۔پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے

(۱)۔ علم اخلاق' کتاب اول باب ششم' مترجمہ پروفیسر عبدالباری ندوی شائع کردہ جامع عثمانیہ ۱۲۴۱ھ

کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے اور ایک دن آئے گا جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہوں گے اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعی محال ہے' اسی لیئے وحی محمدی ﷺ نے خدا اور قیامت پر ایمان لانا' ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش بن جاتا ہے' فرمایا:

یاایھا الذین امنوا لا تبطلوا صدقتکم بالمن و الاذی

کالذی ینفق مالہ رئاء الناس ولا یومن باللہ والیوم الاخر۔ (بقرہ:۲۶۴)

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کر یا ستا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور خدا اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا۔

یہی ایمان صحیح جس سے حسن نیت پیدا ہوتا ہے' آب حیات کا وہ سرچشمہ ہے' جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ حقیقت ہیں۔

والذین کفروا اعمالھم کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمان مائ حتی اذا جاء ہ لم یجدہ شیئا۔ (نور:۵)

اور جو خدا اور قیامت کو نہیں مانتے ان کے کام ایسے ہیں جیسے میدان میں ریت' کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے جب وہاں جائے تو اس کو کچھ نہ پائے۔

یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے۔ یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو۔

او کظلمت فی بحر لجی یغشہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب ظلمت بعضھا فوق بعض اذا اخرج یدہ لم یکد یرھا ط ومن لم یجعل اللہ لہ نورا فما لہ من نور۔ (نور:۵)

یا (خدا اور قیامت کے) نہ ماننے والوں کے کاموں کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرے ہیں گہرے دریا میں اس کو لہر ڈھانکے ہے' اس لہر پر دوسری لہر ہے اس پر گھٹا چھائی ہے تاریکیاں ہیں ایک پر ایک' جب ہاتھ نکالے تو سوجھا نہیں اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی اس کو کہیں روشنی نہیں۔

جب تک کسی واقف اسرار' عالم الغیب' دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ' باز پرس' اور جواب دہی کا یقین

کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں اور اس سے متاثر ہو کر یہ کام کرتے ہیں' غرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض' مختلف اشخاص کے کاموں کی غایت اور محرک ہو سکتے ہیں' لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالیئے تو معلوم ہو گا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جا رہے ہیں اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی و نفسانی غرض و غایت سے پاک ہے' اسی قدر وہ بلند اور قابل قدر ہے' کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے۔ اس کے بعد عزت و شہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لیئے کرنا بھی گو پست مقصد ہے مگر پہلے سے بلند ہے' پھر روحانی خوشی کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے یہ بالکل فطری بات ہے' کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے مگر جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی تہہ میں اس کی فلاح ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہو جاتا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کاموں کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہیں لیکن درحقیقت اس میں بھی گو دنیا کی نہیں' لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے اس لیئے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے' اس لیئے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیم محمدی میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے' مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہیں دیا گیا ہے' یہاں تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہیں۔

طاعت میں تار ہے نہ مئے و انگبین کی لاگ
دوزخ میں لیکے ڈالدے کوئی بہشت کو

ضمیر کی آواز::

یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور

بھلائی میں تمیز کر لیتا ہے اور جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے، غریب و لاچار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرتاً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے، قابل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے۔ یہ قلب کی فطرتی صلاحیت ہر انسان کے ضمیر میں ہے ہر اچھے یا برے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے، لیکن بری صحبت، بری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں، وہ اپنی گنہگاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے، وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو جاتا ہے، اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے اور اس کی پشیمانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے۔

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصول اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی و بدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہیں، یہ اس کے نتائج ہیں، قرآن کہتا ہے:

فالهمها فجورها وتقوها۔ (الشمس)

(نفس میں) اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی ہے۔

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے اور جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے، وحی محمدی ﷺ کی اصطلاح میں اس کا نام "نفس لوامہ" (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے، سورۂ قیامت میں ہے:

ولا اقسم بالنفس اللوامة۔ (قیامت: ۱)

اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کی اس کی برائیوں پر

ملامت کرتا ہے۔

آگے چل کر فرمایا:

بل الانسان علی نفسه بصیرہت ولو القی معاذیرہ۔
(قیامت: ۱)

بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے اگر چہ وہ اپنے اوپر
طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال دیتا ہے۔

نواس بن سمعانؓ انصاری ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں' آخر ایک دن ان کو موقع مل گیا اور انہوں نے دریافت کیا۔ فرمایا ''نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ جو تیرے دل میں کھٹک جائے اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں''

اسی طرح وابصہؓ بن معبد نام ایک صاحب خدمت نبوی ﷺ میں نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کی غرض سے آئے' چاروں طرف جانثاروں کا ہجوم تھا اور وہ شوق وذوق میں سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے' لوگ ان کو روک رہے تھے مگر وہ آگے بڑھتے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا ''وابصہ قریب آجاؤ'' جب وہ قریب جا کر بیٹھے تو فرمایا اے وابصہ! میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو' یا تم بتاؤ گے۔ ''عرض کی'' حضور ہی ارشاد فرمائیں ''فرمایا'' وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہوں ''عرض کی'' سچ ہے یا رسول اللہ فرمایا:

یاوابصته استفت قلبك واستفت نفسك البرما
اطمان الیه القلب واطمانت الیه
اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر' اپنے نفس سے فتوی لیا
کر نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں
النفس والاثم ماحاك فی القلب وتردد فی النفس
وان افتاك الناس۔ (۱)۔

طمانیت پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑ بن میں ڈالے اگر چہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں۔

یہی وہ حاسۂ اخلاق ہے جس کا نام لوگوں نے ضمیر کی آواز رکھا ہے۔

پہلے پہل جب انسان اپنی ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے دل کو صاف و سادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اگر چہ ہوش میں آ کر جب وہ توبہ و استغفار کرتا اور پشمان و نادم ہوتا ہے تو وہ داغ مٹ جاتا ہے لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کر کے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے اسی مفہوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ میں ادا فرمایا:

ان العبد اذا اخطاء خطیئۃ نکتت فی قلبہ نکتۃ سوداء فاذا ھو نزع و استغفر و تاب صقل قلبہ و ان عاد زید فیھا حتی یعلو قلبہ۔

بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے تو اگر اس نے پھر اپنے کو علیحدہ کر لیا اور خدا سے مغفرت مانگی اور توبہ کی تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا یہی وہ دل کا زنگ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔ (تطفیف: ۱)

کبھی نہیں ان کے (برے) کاموں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چھا گیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک تمثیل میں فرمایا کہ منزل مقصود کی جانب

ایک سیدھا راستہ جاتا ہے' راستہ کے ادھر ادھر دونوں طرف دو دیواریں کھینچی ہوئی ہیں اور ان دوونوں میں دو دروازے کھلے ہیں لیکن ان پر پردے پڑے ہیں' راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو' اور ادھر ادھر مڑو نہیں' جب کوئی راہ گیر خدا کا بندہ چاہتا ہے کہ ان دائیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے'' خبردار پردہ نہ اٹھانا' اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے'' پھر فرمایا یہ راستہ اسلام ہے' اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہیں اور یہ پردے اس کے حدود ہیں اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے۔

هو واعظ الله فی قلب کل مئومن۔

وہ خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب میں ہے۔

کیا کسی بڑے سے بڑے ضمیری نے بھی اخلاقی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہے۔

(۱)۔ مسند ابن حنبل ج ٤ ص ۲۲۸ مصر۔ (۲)۔ جامع ترمذی تفسیر آیت مذکور۔

مسرت وانبساط::

یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے' کرنے والے کو جو خوشی اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے وہی اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دیتا اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے' گو تمام تر صحیح نہیں ہے تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقتاً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور برائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے لیکن یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں' ایک غریب و لاچار کی امداد سے بے شبہ ہم کو خوشی ہوتی ہے لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے لیکن وہ اس کی محرک علت اور غرض و غایت نہیں بلکہ اب اس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے۔ علمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہیں' اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفہ الٰہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

ولکن اللہ حبب الیکم الایمان و زینہ فی قلوبکم و کرہ الیکم الکفر والفسوق و العصیان اولئک ھم الراشدون۔ (حجرات: ۱)

لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا کر کے دکھایا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے گھن لگا دی۔ یہی لوگ نیک چلن ہیں۔

اسی آیت پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے الفاظ میں اس طرح فرمائی:

اذا سرتک حسنتک وساء تک سیئتک فانت مومن (۱)۔

جب تمہاری نیکی تمہیں خوشی بخشے اور تمہارے بدی تم کو غمگین کردے تو تم مومن ہو۔

من سرتہ حسنہت وساء تہ سیئہت فھو مئومن من عمل سیئہت فکرھھا حین یعمل وعمل حسنہت فسر فھو مئومن۔ (۳)۔

جس کو نیکی خوش اور برائی غم زدہ بنا دے وہ مومن ہے۔ جس نے جب کوئی برائی کی تو اس کو اس سے سخت نفرت آئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو مسرت ہوئی وہ مومن ہے۔

غرض نیکی پر مسرت و انبساط اور انشراح خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصول اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقہ لذتیہ کے لیئے بھی قدم رکھنے کی گنجائش باقی رکھی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی اس کی تصحیح فرما دی ہے۔

رضائے الٰہی ::

اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض و غایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے' ایک سچے مسلمان کو صرف اس کی خاطر کام کرنا چاہئے اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے' یہیں آ کر فلسفۂ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایاں ہوتا ہے حکمائے اخلاق یہ ڈھونڈتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے اور معلم حکمت علیہ السلام یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض و غایت کیا قرار دینی چاہئے۔ انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں اور انہی دونوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا ایثار اور حسن عمل ہے' پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا:

ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ واللہ رءوف بالعباد۔ (بقرہ: ۲۵)

بعض ایسے ہیں جو اپنی جان کو خدا کی خوشنودی چاہنے کیلئے بیچتے ہیں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

(۱)۔مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنتہ بحوالہ احمد و بیہقی فی شعب الایمان ورزین و ترمذی مختصرًا۔

پھر مال کے متعلق فرمایا۔

ومثل الذین ینفقون اموالھم ابتغاء مرضات اللہ۔ (بقرہ: ۲۶۵)

اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی کیلئے خرچ کرتے ہیں۔

وما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللہ۔ (بقرہ: ۲۷۳)

اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔

ومن یفعل ذلک ابتغاء مرضات اللہ فسوف نوتیہ اجرا عظیما۔ (نساء: ۱۱۴)

اور جو یہ تمام کام خدا کی خوشنودی کے لیئے کرے گا تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے۔

والذین صبروا ابتغاء وجہ ربھم واقاموا الصلوٰۃ

وانفقوا مما رزقنھم سرا وعلانیہت ویدرء ون بالحسنہت السیئہت اولئك لھم عقبی الدار۔ (رعد: ۳۱)

اور جنہوں نے خدا کے لیئے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ چھپے اور کھلے طریقہ سے خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دور کرتے ہیں' انہی کے لیئے ہے پچھلا گھر۔

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورۂ لیل میں کھولی گئی ہے۔

الذی یوتی مالہ یتزکی وما لاحد عندہ من نعمہت تجزی الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلی۔ (لیل)

جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے ہوئے دیتا ہے کسی کا اس پر احسان نہیں ہے جس کو ادا کرنے کیلئے دیتا ہو بلکہ وہ خدا کی ذات کی طلب کیلئے دیتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر و توضیح آنحضرت ﷺ نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے' ایک صحابی پوچھتے ہیں یا رسول اللہ! کوئی اس لیئے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے' کوئی اس لیئے کہ وہ بہادر کہلائے' کوئی اس لیئے کہ اسے شہرت حاصل ہو تو ان میں سے راہ خدا میں لڑنا کس کو کہیں گے؟ فرمایا۔ اس کو جو اس لیئے لڑتا ہو کہ خدا کی بات بلند ہو۔ (۴)۔'' ایک دفعہ ارشاد فرمایا ''ایک گھوڑا باندھنا' کسی کیلئے اجر کا موجب' کسی کیلئے پردہ پوش' اور کسی کیلئے گناہ ہے' اجر کا موجب اس کیلئے ہے جو خدا کی راہ میں اس کو باندھتا ہے تو اس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے' پردہ پوش اس کیلئے ہے' جو ضرورتاً اس لیئے باندھتا ہے کہ خدا نے اس کو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگنی نہ پڑے تو وہ رحم و شفقت کے ساتھ اس سے کام لیتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے اور گناہ اس کیلئے ہے جو فخر اور نمائش کے لیئے باندھتا ہے۔

اس تعلیم کا سب سے مؤثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابو ہریرہؓ تین دفعہ غش کھا کر گرے اور جس کو سن کر حضرت معاویہؓ زار زار روئے' حضرت ابو ہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لیئے اترے گا اور ہر امت اپنی جگہ گھٹنے ٹیکے گی۔ اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہوگا جو قرآن

(۱)۔ مسند احمد بن حنبل ابی مامتہ الباھلی جلد ۵ صفحہ ۲۵۲'۲۵۱ و مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول ص ۱۴ حیدر آباد و مختصر شب الایمان بیھقی ص ۵۲ مطبع سعادت مصر' وابن حبان و ابوداؤد' وعن عمرؓ بن الخطاب۔ (۲)۔ طبرانی فی الکبر عن ابو موسیٰ کنزالعمال ج' ص ۳۷ (۳)۔ مستدرک حاکم کتاب الایمان ج ۱ ص حیدر آباد۔ (۴)۔ صحیح بخاری کتاب الجھاد' ج ۱' ص ۳۹۴

کے عالم تھے اور جہاد میں مارے گئے تھے اور جو دولت والے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا' کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا جو اپنے پیغمبر پر اتارا تھا۔ تو تم نے اس پر کیا عمل کیا؟ عرض کرے گا' بارالٰہا! میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا۔ خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے۔ فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے۔ پھر خدا فرمائے گا' تو تو اس لیئے یہ کرتا تھا تا کہ لوگ کہیں تو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے' تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا) پھر دولت مند سے خدا فرمائے گا' کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا' یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا؟ عرض کرے گا کیوں نہیں' اے میرے رب' دریافت کرے گا تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا اس میں تو نے کیا کیا جواب دے گا' میں اہل استحقاق کا حق ادا کرتا تھا اور خیرات دیتا تھا۔ ارشاد ہوگا تو جھوٹا ہے' فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے۔ پھر خدا فرمائے گا تو تو اس لیئے یہ کرتا تھا تا کہ لوگ کہیں کہ تو بڑا سخی ہے' تو یہ تجھ کو دنیا میں کہا جا چکا (تو اپنا بدلہ پا چکا) اس کے بعد وہ لایا

جائے گا جو جہاد میں مارا گیا تو خدا اس سے دریافت کرے گا تو کس کس بات کے لیئے مارا گیا؟ کہے گا خدایا تو نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا تھا تو میں لڑا یہاں تک کہ مارا گیا' خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے' فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے' خدا کہے گا تو تو اس لیئے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں' تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا' پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔(۱)۔

حضرت معاویہؓ اس حدیث کو سن کر بہت روئے۔ پھر بولے خدا اور اس کا رسول سچا ہے اور اس حدیث کی تائید میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

من کان یرید الحیوۃ الدنیا و زینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون۔ اولئک الذین لیس لھم فی الاخرۃ الا النار وحبط ما صنعوا فیھا و باطل ما کانوا یعملون۔ (ہود:۲)

جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہو تو ہم اس کا عمل اسی دنیا میں پورا کر دیں گے' بے کم و کاست' ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ مگر دوزخ اس دنیا میں انہوں نے جو بنایا وہ مٹ گیا اور جو کیا وہ برباد گیا۔

غرض ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت' خودغرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلندی ہے بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے جہاں اس کی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں بلکہ خود ذات الٰہی ہو جاتی ہے۔

وما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللہ۔ (بقرہ:۳)

اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔

والذین صبروا ابتغا وجہ ربہم۔ (رعد:۳)

اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لیئے صبر کیا۔

وما لاحد عنده من نعمت تجزی الا ابتغاء وجه ربه الاعلی۔ (لیل)

اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کیلئے نہیں بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کیلئے کرتا ہے۔

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الجهاد و کتاب المناقب آخر باب علامات النبوه فی الاسلام و کتاب الاعتصام بالکتاب والسنته باب الاحکام تعرف بالدلائل و باب تفسیر اذ زلزلت و صحیح مسلم کتاب الزکوه۔ (۲)۔ جامع ترمذی باب الزهد باب ماجاء فی الریاء والسمعته۔

فات ذاالقربی حقه والمسکین وابن السبیل ذلك خیر للذین یریدون وجه الله و اولئك هم المفلحون۔ (الروم: ۴)

تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا اور مسافر کا ایسا کرنا ان لوگوں کیلئے بہتر ہے جو خدا کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول::

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے اصول اخلاق کی جو تکمیل ہوئی اس کا پتہ اخلاق کے بنیادی اصول سے چلتا ہے تو راہ نے اپنی اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے۔ جس میں کسی اصول اور غرض و غایت اور علت و مصلحت کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی، انجیل میں لفظی صناعیوں کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیاد ہی قائم نہیں کی گئی ہے تاہم عیسائی مذہب میں کچھ اصول ضرور موجود ہیں مگر ان کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے ان میں سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقت انسانی کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے یا گناہوں سے

داغدار ہے۔ عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل میں گناہگار پیدا ہوتا ہے' گناہ اس کا مایۂ خمیر ہے کیونکہ اس کے باپ اور ماں حضرت آدم اور حوا گناہ گار تھے' اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے جس سے بچنا انسان کے لیئے ممکن نہیں' اس مسئلہ میں مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک بپتسمہ نہ پائے پاک نہیں ہوتا۔ اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مر جائے تو وہ گناہگار مرا' اور آسمانی بادشاہی کے حدود میں وہ داخل نہ ہوگا بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائے گا کیونکہ مسیح کے نام سے اس نے نجات نہیں پائی تھی۔

لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے' اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا۔ (خدا کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) پھر الست بربکم کے ازلی سوالی کے جواب میں بلی یعنی خدا کا اعتراف ہر انسان روز اول کر چکا ہے۔ اس لیئے اس دنیا میں آ کر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہیں کیا اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لیئے کافی ہے اور اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوح فطرت پر جو زریں حرف لکھے ہیں' وہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد یا ان کو ابھار کر چمکا دیتا ہے یا مٹا ڈالتا ہے' فرمایا:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (التین)

ہم نے انسان کو اچھی راستی پر پیدا کیا۔

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے' دوسری جگہ ارشاد ہوا:

الذی خلقك فسوك فعدلك فی ای صورۃ ماشاء ركبك۔ (انفطار: ۱)

جس خدا نے تجھے بنایا پھر تجھ کو برابر کیا' پھر تجھ کو ٹھیک کیا پھر جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔

یہ آیت سورہ انفطار کی ہے' اس میں قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے

مقررہ دن کا بیان ہے اس کے بعد یہ آیت ہے جس لفظ کا ترجمہ ہم نے ''ٹھیک کیا'' کیا ہے اس کے لفظی معنی ''معتدل کیا'' ہیں یعنی اس کو قوی کا ہر قسم کا اعتدال بخشا' نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس میں کمالات کی حصول کی پوری استعداد عنایت کی' اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قوی کا اعتدال داخل ہے' دوسری آیتوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے سورۂ اعلیٰ میں ہے:

سبح اسم ربك الاعلى الذى خلق فسوى والذى قدر فهدى۔ (اعلیٰ: ۱)

اپنے بلند و برتر رب کی پاکی بیان کر جس نے پیدا کیا' پھر برابر کیا اور جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا پھر راہ دکھائی۔

راہ دیکھنا' یعنی ہدایت انسان کی فطرت میں اس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے جس طرح اس میں دوسرے بیسیوں قوی اس نے ودیعت رکھے ہیں' سورۂ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہے۔

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه۔ فجعلنه سميعا بصيرا۔ انا هديناه السبيل اما شاكرا و اما كفورا۔ (دہر: ۱)

ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا' پلٹتے رہے اس کو پھر کر دیا اس کو سنا دیکھتا ہم نے اس کو راہ سوجھا دی تو وہ یا شکر گزار (نیکوکار) ہوتا ہے یا ناشکر (بدکردار)

غرض اس کو یہ رہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی۔ اب عقل و تمیز آنے کے بعد خدا کا شکر گزار' یا ناشکر' نیکوکار یا بدکردار' اچھا یا برا ہو جانا خود اس کا کام ہے' سورۂ شمس میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔

ونفس وما سوىها فالهمها فجورها وتقوىها قد افلح من زكىها وقد خاب من دسىها۔

قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے کی، پھر ہم نے اس کو الہام کر دیا (سوجھا دیا) اس کی نیکی اور بدی تو کامیاب ہوا۔ وہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف رکھا اور ناکام ہوا وہ جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا (گندہ کر دیا۔)

الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کی رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی گناہ گار اور عصیان کار نہیں ٹھہرایا گیا ہے بلکہ اس کی اصل فطرت میں ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہے اس لیئے یہ کہا گیا:

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرت الله التى فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون۔ (روم: ۴)

سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھو وہی اللہ کی فطرت، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

یہ دین فطرت اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں جن کی بنیادی چیز توحید ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل میں صحیح و سالم پیدا ہوتا ہے وہ کن کٹا نہیں پیدا ہوتا۔ (۱)۔ اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے، وحی محمدی نے اس مسئلہ کو اپنی ایک اور ازلی مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے۔ انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسانی ارواح سے دریافت فرمایا الست بربکم کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ انہوں نے اپنی زبان حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا ''بلیٰ'' (ہاں بیشک تو ہمارا پروردگار ہے) یہی ازلی اور فطری اعتراف انسان کا وہ عہد ہے جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے اور کہا ہے کہ

''دیکھو شیطان نے تمہارے باپ آدم کو بہکایا تھا تو تم اس کے بہکانے میں نہ آؤ۔''

(۱)۔ صحیح بخاری و مسلم کتاب الایمان۔ (۲)۔ سنن ابن ماجہ کتاب الحج باب الخطبہ یوم النحر۔

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت سے معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتاور اپنی پیٹھ پر لادکر نہیں آتا' قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ:

ولا تزر وازرۃ وزر اخری۔ (فطری:۳)

اور ایک گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔

کل امری بما کسب رھین۔ (طور: ۱)

ہر نفس اپنے ہی عمل میں گروی ہے۔

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الا لا یجنی جان علی ولدہ ولا مولود علی والدہ۔ (۱)۔

ہاں! باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ۔

اسی طرح ان مذہبوں نے بھی جنہوں نے انسان کی آواگون اور تناسخ کے چکر میں پھنسا رکھا ہے انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گنہگار اور داغدار ہی ٹھہرایا گیا۔ انہوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے' اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا ہر زندگی کو دوسری زندگی کا اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو اپنے پچھلے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہوا سکے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے۔

اب غور کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ اور بے داغ ہے' غمگین دنیا کے لیئے کتنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے' اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے

عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور نا کردہ گناہ بچہ بھی گنہگار اور جہنم کا ایندھن ہے' آپ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش وحواس اور عقل وتمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے' فرمایا کہ ''خدا کا قلم بچہ سے اس وقت کے لیئے اٹھا دیا گیا جب تک وہ عقل وتمیز کو نہ پہنچے۔(۱)۔''

باغ ہستی کی یہ انسانی کلیاں جو بن کھلے مرجھا گئیں' اسلام کی نگاہ میں جنت کے پھول ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس مسلمان کے تین بچے بچپن میں مر گئے' وہ خدا کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے اور ان کو جنت میں لے جائیں گے۔(۲)۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شیر خوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی تو فرمایا ''یہ جنت میں جا کر جنتی دایوں کا دودھ پیئے گا۔(۳)۔'' اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچوں کی نسبت آپ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہاں رہیں گے فرمایا'' خدا کو علم ہے کہ یہ کیا ہوتے۔(۴)۔'' لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرمادی' ایک دفعہ رویا میں حضرت ابراہیم کو دیکھا کہ وہ جنت میں بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف کمسن بچوں کا ہجوم تھا فرمایا یہ وہ کمسن بچے تھے جو دین فطرت پر مر گئے۔صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! اور مشرکوں کے بچے؟ فرمایا'' اور ''مشرکوں کے بچے بھی (۵)۔'' ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کمسنی میں مرجانے والے بچہ

---

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الطلاق و ترمذی فی من لا یجب علیه الحد۔ (۲)۔ ابن ماجه کتاب الجنائز۔ (۳)۔ صحیح مسلم' کتاب القدر۔ (٤)۔ صحیح بخاری کتاب التعبیر باب تعبیر الرویا بعد صلوٰة الصبح۔ (٥)۔ یه حدیثیں صحیح مسلم کتاب القدر میں هیں۔ نیز امام نووی کی شرح مسلم میں بھی یه باب دیکھو اور باب فضل من یموت له ولد جلد ۲ صفحه ۲۳۰ و ۳۳۷۔ (٦)۔ صحیح مسلم باب الاوقات التی نهی عن الصلوٰة فیها و صحیح بخاری و مسلم و ترمذی کتاب الحج۔

کو بہ تخصیص جنتی کہہ اٹھتے تھے لیکن چونکہ غیب پر حکم لگانا صرف خدا کا حکم ہے' اس لیئے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہہ دینا' آپ ﷺ نے مناسب نہیں سمجھا' ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مر گیا تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اس سانحہ کو سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی ''یارسول اللہ ! اس کو مبارک ہو۔ یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی' نہ گناہ کیا نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا۔'' فرمایا۔'' اے عائشہ ! اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیئے کچھ لوگ پیدا کیئے ہیں اور جہنم کے لیئے کچھ لوگ۔ (۱)۔'' ایک طرف عیسائیت ہے جو بپتسمہ پانے سے پہلے مر جانے والے بچوں کو جہنم میں جھونکتی ہے' دوسری طرف اسلام ہے جو ان کے لیئے جنت کا دروازہ کھولتا ہے' اور ان کے جنازہ کی نماز میں یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے۔ خداوند ! اس کو میرے لیئے پیشگی کا ذخیرہ بنانا اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ میں مقبول ہو۔ احادیث میں ایسے موقعوں پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے۔ اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ ''وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنا ہے۔ (۲)۔''

خوف و رجا::

اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے' یونان کے فلسفیوں میں دو گروہ گزرے ہیں ایک کو رونے والے فلسفی' دوسرے کو ہنسنے والے فلسفی کہتے ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے ناامیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے' اس کو دنیا تمام تر تاریک اور خار زار نظر آتی ہے' دوسرا گروہ وہ ہے جس کو دنیا میں چہل پہل' عیش و آرام اور بہار و رونق کے سوا کچھ سوجھائی نہیں دیتا' پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو اور زندگی میں موت کی صورت بنا لو کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے' دوسرے کا نظریہ یہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو اور کل کے غم کی فکر نہ کرو' اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں رائیں ترمیم

کے قابل ہیں۔ پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قوی سرد ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ دنیا میں کسی کام کے سرانجام دینے کا اہل نہیں باقی رہتا اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ بادۂ غفلت میں مست و سرشار ہوتا ہے اور اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دونوں گلیوں کے بیچ سے نکلی ہے۔ وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے۔ کہ دل بادۂ غفلت میں سرشار نہ ہو اور دوسری طرف وہ اس کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ اخیر اخیر وقت تک خدا کے سہارے جینے کی تعلیم کرتا ہے' اس کی شریعت میں خدا سے ناامیدی اور کفر ایک ہے' وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی ناامید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا۔ قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا۔

فلا تکن من القنطین۔ (حجر: ۴)

(ابراہیم)! ناامیدوں میں سے نہ بن۔

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی تعلیم ملی۔

ولا تایئسوا من روح اللہ انہ لا یایئس من روح اللہ الا القوم الکفرون۔ (یوسف: ۱)

اور اللہ کے فیض سے ناامید مت ہو' اللہ کے فیض سے ناامید وہی ہیں جو خدا کے منکر ہیں۔

اس امت کے گناہ گاروں کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے۔

یعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمتہ اللہ۔ (زمر: ۶)

اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر آپ ظلم کیا تم خدا کی رحمت سے ناامید مت بنو۔

اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پرامید رہنے کی تاکید کی آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "میں اپنے بندہ

غرض کے اخلاق کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے' اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قوموں میں نا کامی اور نا امیدی کی خودکشیوں کا عام طور سے رواج ہے' ہندوستان میں ہندو عورتوں کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں' یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکوں میں ذرا ذرا سی نا امیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بن گیا ہے' جس وقت یہ سطریں لکھ رہا ہوں' وارسا (پولینڈ) میں نا کام نوجوان لڑکیوں کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس کے قیام کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں' مگر کسی مسلمان میں اخیر سے اخیر لمحہ میں بھی نا امیدی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور خدا کے فضل و کرم سے اس کی آس نہیں ٹوٹتی' امیر ہو کہ غریب تندرست ہو کہ بیمار' اولاد والا ہو کہ بے اولاد کامیاب ہو یا نا کام' دولت مند ہو یا دیوالیہ' ہر حالت میں وہ پر امید رہتا ہے۔ مشکلات میں بیماریوں میں' محتاجوں میں' نا کامیوں میں' ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ خدا کی رحمت کا امیدوار ہے' اور یقین رکھتا ہے کہ نا امیدی اور کفر دونوں اس کے مذہب میں ایک ہیں اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہاں نہیں تو وہاں ضرور ہے۔ اس کے خدا کا یہ وعدہ ہے کہ :

(۱)۔جامع ترمذی' کتاب الزھد باب فی حسن ظن باللہ تعالیٰ۔

انی لا اضیع عمل عامل منکم۔ (آل عمران:۳)
میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔

اخلاق اور رہبانیت::

اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش نیتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے یا یوں کہیے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں ان کو ادا کرنے کو کہتے ہیں' اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لیئے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے جو رہبانیت تجرد اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی ہے' اسی لیئے گوشہ نشینی' عزلت گزینی' خلق سے کم آمیزی' جماعت

سے علیحدگی، اہل وعیال، عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے تعلقات سے آزادی، اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھو دیتی ہے یا کم کر دیتی ہے۔

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لیئے ہے کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نیکی اور دینداری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھی اور وہ خود اور ان کے عقیدت مند بھی اس کو ان کی انتہائی نیکوکاری اور دینداری قرار دیتے تھے لیکن حقیقتاً ان مذہبی افراد اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لیئے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب و اثر کو نمایاں کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے میں مدد ملے اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیر پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دینداری کا ڈھونگ کھڑا کر سکیں اور تیسری طرف اپنی عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل وعیال، اعزہ و اقارب، دوست و احباب اور قوم ملت کے فرائض وحقوق کو بجا لانے کی تکلیف سے بچ جائیں، اسی لیئے اسلام نے اپنے اصول اخلاق میں راہبانہ، جوگیانہ اور مجردانہ زندگی کی ہمت افزائی نہیں کی ہے، نبوت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اس مجمع انسانی میں رہ کر اور تمام تر انسانی جدوجہد میں شریک ہو کر گزاری ہے، یہی طرز عمل خلفائے راشدینؓ اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہ کا تھا اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عمل صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے۔ تجرد، علیحدگی، خلوت، نشینی، ترک عمل اور ترک جماعت کے لیئے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہیں، ان سے ہٹ کر نہیں، وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہیں؟ کیا وہ

قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سرپرست ہیں؟ کیا وہ خلق الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا وہ اپنے دست و بازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ و دعوت، تعلیم و موعظت امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں، حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں، اسی لیئے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

قوا انفسکم واھلیکم نارا۔ (تحریم: ۱)

تم اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا **کلکم** راع **وکلکم** مسول عن رعیتہ تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار ہے اور نگران ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے۔ امیر اپنی رعیت کا چرواہا۔ مرد اپنے اہل و عیال کا رکھوالا اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔ (۱)۔

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں۔ یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اسی لیئے وحی محمدی ﷺ نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا اور کہا:

واتقوا فتنہ لا تصبین الذین ظلموا منکم خاصہ۔ (الانفال: ۳)

اور اس فساد سے بچو جو چن کر صرف گناہگاروں ہی پر نہیں پڑے گا۔

بلکہ اس کی لپٹ گنہگار و بے گناہ سب تک پہنچے گی کہ اگر جماعت اپنے تمرد کی مجرم ہوئی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے' چنانچہ قرآن پاک میں اصحاب سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور فرض تبلیغ سے بے پرواہ رہنے والے اشخاص کو بھی گنہگاروں ہی میں شامل کیا ہے۔

دنیا اور حقیقت جدوجہد اور دار و گیر کا ایک میدان ہے۔ جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں' راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں' ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا لحاظ و خیال کرنا پڑتا ہے' اسی لیئے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے۔ دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے۔ بیہقی نے شب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے:

ان المسلم الذی یخالط الناس ویصبر علی اذاھم افضل من الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علی اذاھم۔ (۲)۔

وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے' اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا' اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا۔

گوشہ گیری اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے' اور فتنہ و فساد کے شعلے اتنے بھڑک چلے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں وہ مجمع سے الگ ہو جائیں' فتنہ میں عزلت نشینی کی حدیثیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں' ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت میں

تبلیغ اور امر معروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کر دے، یہی وہ نمونہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا میں پیش کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہؓ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی کی۔

(۱)۔ صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب المراۃ راعیتہ فی بیت زوجھا، ص ۷۸۳ (۲)۔ شعب الایمان، بیہقی و جامع ترمذی، کتاب الزھد، ص ۴۱۲

آپ ﷺ نے فرمایا کہ "بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔(۱)"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ::

اسلام کے اس اصول اخلاق کو پیش نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آ جاتا ہے کہ تعلیم محمدی میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے، اسی اخلاقی فرض کا دوسرا نام شرعی "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" (یعنی اچھی باتوں کیلئے کہنا اور بری باتوں سے روکنا) قرآن پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر۔ (آل عمران: ۱۲)

تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے لیئے باہر لائی گئی ہو اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو۔

یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر۔ (توبہ: ۹)

وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے باز رکھتے ہیں۔

پھر خاص طور سے حکم ہوا:

وامر بالمعروف وانہ عن المنکر۔ (لقمان: ۲)

اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے روک۔

مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ:

واتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔ (العصر)

اور وہ آپس میں سچائی اور ثابت قدمی کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔

واتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمہت۔ (بلد: ۱)

اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور قوی دل اور قوی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوم کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔ توراہ میں قابیل کا یہ فقرہ کہ ''کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں (۲)۔؟ عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام ''شخصی آزادی کی بحالی ہے'' لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گزرا کہ ''کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ (تم میں ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں ہر شخص سے اس کے زیر ذمہ داری لوگوں کی نسبت باز پرس ہوگی) قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے۔ تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف' لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

(۱)۔ صحیح مسلم کتاب الایمان۔ (۲)۔ سفر تکوین ۴۔۹

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیئے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارہ آباد تھی۔ وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی۔ اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک وہ جو اس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا' دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کو سمجھاتا تھا' تیسرا وہ جو گو اس فعل میں شریک نہ تھا لیکن ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا بلکہ خود سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے ناشنوا لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جن کو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کرنے والا ہے لیکن ان پر جب عذاب الٰہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا۔ جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا۔ بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گیا' پہلا تو اپنے گناہ کی بدولت اور دوسرا اپنے فرض تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے' سورۂ اعراف کے بیسویں رکوع میں یہ پورا قصہ مذکور ہے۔ آخر میں ہے:

واذ قالت امہت منہم لم تعظون قوما ن اللہ مہلکہم او معذبہم عذابا شدیداط قالوا معذرہت الی ربکم ولعلہم یتقون فلما نسوا ما ذکروا بہ انجینا الذین ینہون عن السوء واخذنا الذین ظلموا بعذاب بئیس بما کانوا یفسقون۔ (اعراف: ۲۱)

اور جب ان میں سے ایک فرقہ بولا کہ تم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جن کو خدا برباد کرنے والا یا سزا دینے والا ہے' انہوں نے جواب دیا کہ ہم تمہارے رب کے آگے اپنے سے الزام اتارنے کے لیئے ان کو نصیحت کرتے ہیں اور شاید کہ یہ نیک بن جائیں تو جب وہ بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تو ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے بچا لیا اور گناہگاروں کو ان کی بے حکمی کے سبب سے بڑا عذاب میں پکڑا۔

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے' کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گناہگار ہے جیسا وہ اس فعل کا مرتکب ہوا' البتہ بھائی کا فرض اس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے' زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہیں اور اس کا کیا بلکہ رسول کا بھی یہ فرض نہیں' فرمایا:

ماعلی الرسول الا البلاغ (مائدہ۔۱۳:نور۔۷)

رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا۔

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی' اسی لیئے سورہ مائدہ میں فرمایا:

یاایھا الذین امنوا علیکم انفسکمج لا یضر کم من ضل اذا اھتدیتم۔ (مائدہ:۱۴)

اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے۔تم اگر سیدھے راستے پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس آیت کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ ''لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں' کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ نہ لیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔'' ایک دوسرے صحابی ابوثعلبہؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے معنی دریافت کیئے' تو فرمایا کہ ''نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جا رہی ہے' اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے تو اس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہے۔(۱)۔''

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ ''کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟ منسوخ کر دیا' واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاق تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں رکھے گی' ان کی حفاظت نہیں ہو سکتی' قوموں کے رسوم و آداب اور ایٹیکیٹس اسی اصول پر قائم ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور سے ہر شخص کے پرائیویٹ اور نجی قسم کی باتیں معلوم ہوتی ہیں' جن کا نفع و نقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے مگر ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں' ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے' دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیوں کی برائی نہایت ہلکی ہو کر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیوں کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے' اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہو جاتا ہے' اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر گر جاتی ہے' ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ ''بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا کہ جب ان میں برائی پھیلنے لگی تو پہلے تو ان علماء نے منع کیا لیکن جب وہ نہ رکے تو وہ ان کے ساتھ بیٹھنے اور اٹھنے اور کھانے پینے لگے' صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے' اللہ تعالیٰ نے داؤدؑ اور عیسیٰؑ کی معرفت ان پر لعنت کی۔''

اس کے بعد آپ ﷺ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا ''نہیں! جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو اور اس کا حق پر نہ جھکا دو۔ (۲)۔''

یہ ہے اس باب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم۔

اس کی چند شرائط::

لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل و عامی کا فرض نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا

ہوتو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ وفساد پیدا کر دے گا۔ یہ حق سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیوں سے بچا ہے' قرآن نے کہا:

اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم۔ (بقرہ:۵)

کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمایش' خوش اسلوبی' نرمی اور مصلحت کے ساتھ کی جائے' خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا:

ادع الی سبیل ربك بالحکمت و الموعظت الحسنت۔ (نحل:۱۶)

تو اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا۔

---

(۱)۔ یہ دونوں حدیثیں ترمذی کتاب التفسیر (مائدہ) میں ص ۴۹۸' ۴۹۹۔ (۲)۔ جامع ترمذی تفسیر مائدہ۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا۔

فقولا له قولا لینا۔ (طٰہٰ:۲)

تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا۔

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی۔

وعظهم وقل لهم فی انفسهم قولا بلیغا۔ (نساء:۹)

اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جانے والی بات۔

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیئے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کی بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

امن و امان کا قائم رکھنا' امام کے ہاتھ میں ہے' اس لیئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوجدارانہ اور زبردستی کے تحکمانہ انتظامات جن کے لیئے تنقیدی قوت

درکار ہے‘صرف حکومت کا فرض ہے تا کہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لیئے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے۔

تجسس اور غیبت کی ممانعت::

یہ بات کی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے‘اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق وتفتیش کی جس کا نام تجسس اور ٹوہ لگانا ہے۔ممانعت کی ہے‘ کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اس کی حالت وکیفیت کی جستجو کرے‘یہاں تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ:

محتسب را درون خانہ چہ کار

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقہ اصلاح سے فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ رہتا لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے‘ جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا اس لیئے جماعت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں‘اور اسی کے ساتھ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم وحیا کا جوہر ابھی موجود ہے‘جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے‘لیکن اگر لوگ چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی بادتند سے اس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے۔

اسلام میں کسی گھر یا کمرہ بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت ہے اس کی علت بھی یہی ہے جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ظاہر فرما دیا ہے کہ انما الاذن لاجل الرؤیہت یعنی کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لیئے ہے کہ وہ اس کو نہ دیکھے۔

اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے یعنی اس کی برائی اس کے پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ و ناصح کی طرف سے اس کو ملال ہو اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر اس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لیئے بند ہو جائے' چنانچہ وحی محمدی ﷺ نے اسی لیئے تجسس اور غیبت ان دونوں چیزوں کی قطعی طور سے ممانعت کی' فرمایا:

یایھا الذین امنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا ط ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتا فکرھتموہ ط واتقوا اللہ ط ان اللہ تواب رحیم۔ (حجرات:۲)

اے ایمان والو! بہت سارے گمانوں سے بچتے رہو۔ کہ بیشک بعض گمان گناہ ہے اور نہ کسی کا اندر کا ٹٹولا کرو اور نہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہو' بھلا تم میں سے کوئی یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے' سو تم کو گھن آئے' اللہ سے ڈرو' بے شبہ اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا کہ جس طرح مردہ اپنے اس جسم کی حفاظت نہیں کر سکتا' وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں برا کہہ رہے ہو' اپنے الزام کی مدافعت نہیں کر سکتا۔ اس غیبت کی ایسے قابل نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرتاً گھن آ جائے۔ اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتی' اس کی کراہت کی یہ شدت اسی لیئے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ اس شخص کی' جس کی غیبت کی جائے' اصلاح ہو سکتی ہے اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری برملا ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ایک مسلمان کی شان ایمان کے شایان نہیں' اس

لیئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی ٹوہ لگاتے پھرو گے تو ان کو برباد کر دو گے۔(۱)۔''

غور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف نکتے پنہاں ہیں۔

توسط اور اعتدال::

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا دور گزر چکا تھا اور دنیا ایک ایسے مذہب کا انتظار کر رہی تھی جو ان دونوں کا جامع ہو' اسلام دنیا کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے آیا' اور سلسلۂ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا۔

عدل و انصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے اور احسان و رفق و ملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوشنما بنا دیا ہے' لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جز بالکل الگ الگ تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا۔

حضرت موسٰی علیہ السلام کی شریعت مجسم عدل ہے۔ اس میں احسان و درگزر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے (۲)۔' اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے' ان کی شریعت میں عدل و انصاف کے قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے۔ (۳)۔ حضرت موسی علیہ السلام کی شریعت نے دنیا کیلئے عدل و انصاف کے جو اصول قائم کر دیئے تھے' اس کے مقابل میں حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا:

''تم نے یہ سنا ہو گا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت (۴)۔' لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو' بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کر دو جو شخص لڑنے جھگڑنے

میں تمہارے کپڑے پکڑے اس کو چادر بھی دے دو۔ جو شخص تم کو ایک میل تک بیکار ہی پکڑ لے جائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ' جو تم سے مانگے اس کو دو' جو تم سے قرض لینا چاہئے اس کو واپس نہ کرو۔

(۱)۔سنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب النھی عن التجسس۔ (۲)۔ یہودگی سنگدلی کے سبب سے۔ (۳)۔ یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کیلئے۔ (۴)۔ یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے۔

تم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بغض رکھو' لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔ (متی' باب ۵)

حضرت عیسٰی علیہ السلام سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہا گیا تھا' وہ حضرت موسٰی علیہ السلام کا قانون تھا جو بالکل عدل و انصاف پر مبنی تھا لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسی علیہ السلام کی زبان مبارک سے سن رہی تھی وہ سراسر اخلاق رحمت اور احسان تھا لیکن اسلام نے عدل و احسان دونوں میں امتزاج پیدا کر کے دنیا کے نظام حکومت کو کامل تر کر دیا۔

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان۔ (نحل:۱۳)

بے شبہ خدا عدل اور احسان (دونوں کا) حکم دیتا ہے۔

یہ ایک اصول تعلیم تھی جس نے شریعت موسوی و عیسوی کی دو الگ الگ خصوصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

عدل و احسان::

''عدل اور احسان'' کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لیئے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے' قانون کی بنیاد درحقیقت ''عدل'' پر ہے عدل کے معنی ''برابر کے ہیں'' جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے' اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے۔ یہ ''عدل'' ہے اور اس کو چھوڑ دینا اور معاف کر دینا اور درگزر کرنا یہ ''احسان ہے'' اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں' قانون عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھوں میں اس

نے دیا ہے یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے اور احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور یہ محض شخصی معاملہ ہے' قانون عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے' اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے اور کسی کو جان و مال و آبرو سلامت نہ رہے' اس لیئے حکومت کو سرے سے مٹانا جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ میں پیش کر کے ہمیشہ کے لیئے تو راہ کے قانون عدل کا خاتمہ کر دیا' کبھی دنیا کے لیئے قابل عمل نہیں رہا' خود عیسائی سلطنتوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کسی قانون عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن و امان قائم نہیں رہ سکا اور نہ برائیوں کی روک تھام ہو سکی۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے' اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پا کر اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے' اس لیئے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کر دینے کا پورا پورا حق نہیں ہے' کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کر کے جماعت کے ہزاروں لاکھوں افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کر رہا ہے اس لیئے اخلاق کو قانون عدل کی جگہ دینے میں بہت کچھ غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے جو شریعت محمدی ﷺ میں پوری طرح برتی گئی کیونکہ وہ دنیا کی دائمی شریعت بننے والی تھی۔

پھر سب لوگ دنیا میں ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہیں ہوئے۔ بعض نیک' نرم مزاج' صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہیں۔ جن کے لیئے معاف کر دینا' درگزر کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہے' اور بعض غصہ ور' سخت مزاج اور تند خو پیدا ہوئے ہیں جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لیئے بغیر چین نہیں لے سکتے۔ ان کے لیئے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے' اور ''برائی' برائی کے بقدر''

اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہ راست دوسروں تک پہنچتا ہے' قانون کے تحت میں رکھا۔ مثلاً قتل' سرقہ' رہزنی' تہمت لگانا' چنانچہ ان جرائم کے لیئے قرآن نے سزا مقرر کی ہے' جو حکومت اسلام کی طرف سے دی جاسکتی ہے اور جو باتیں ایک انسان کی ذاتی تکمیل نفس کے متعلق تھیں' ان کو اخلاق کے دائرہ میں رکھا۔ مثلاً جھوٹ نہ بولنا رحم کھانا' غریبوں کی امداد وغیرہ۔ اس طرح شریعت محمدی ﷺ اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے' قانوناً اس نے ہر مظلوم اور صاحب حق کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراہ کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے' لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے بلکہ برائی کے بجائے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے' اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانون انتظام وعدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیئے وہ نسل انسانی کی حفاظت' ترقی اور نشوونما کی پوری طرح متکفل ہے' وہ عدل وانصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے' اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگوں کی روحانی تکمیل بھی کسی طرح حارج نہیں' وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم وجان کا مجموعہ اور زندہ ومحسوس پیکر ہے۔

عفو اور انتقام ::

موسویؑ' عیسویؑ اور محمدی ﷺ اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے' اسلامی قوانین کو پیش نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں' لیکن اگر وہ قانون محمدی ﷺ کے ساتھ ساتھ اخلاق محمدی کو بھی سامنے رکھتے تو ان کو یہ بھی شبہ پیش نہ آتا معلوم ہو چکا کہ توراہ اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے۔ اس کا حکم ہے:

''اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا۔۔۔ اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے' سو جیسا کرے' ویسا پائے گا توڑنے کے بدلے توڑنا' آنکھ کے بدلے آنکھ' دانت کے بدلے دانت۔''

(احبار ۲۴۔۷ خروج ۲۱۔۱۲ گنتی ۳۵۔۳۱ استثناء ۱۹۔۱۱۔۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے' اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے:

''تم سن چکے کہ کہا گیا' آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا' بلکہ جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے' دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے۔'' (متی ۵۔۳۸)

لیکن اس سرتا پا روحانی اخلاقیات پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کوئی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس حکیمانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد رسول اللہ نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ عدل قانون ہے اور احسان اخلاق ہے' اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں اور پر جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کیئے گئے ہیں' اس کی نسبت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے۔

یایھا الذین امنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی الحر بالحر و العبد بالعبد و الانثی بالانثی۔ (بقرہ: ۲۲)

اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں برابری کے بدلے کا حکم ہوا! آقا کے بدلے آقا' غلام کے بدلے غلام' عورت کے بدلے عورت۔

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے۔

فمن عفی لہ من اخیہ شی ء فاتباع بالمعروف وادآء الیہ باحسان لا ذلک تخفیف من ربکم و رحمہت فمن اعتدی بعد ذلک فلہ عذاب الیم۔ (بقرہ: ۲۳)

تو اگر اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا' تو

دستور کے مطابق اس کی پیروی کرنا اور نیکی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ یہ تمہاری رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ داروں میں سے) اس (معافی یا خون بہا لینے) کے لیئے بعد پھر زیادتی کرے تو اس کے لیئے دکھ کی سزا ہے۔

ان آیتوں کی بلاغت پر غور کیجئے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان کھلی دشمنی کے بعد ان کے جذبہ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ داروں کا بھائی کہہ کر بتایا گیا' ساتھ ہی چونکہ تو راہ کے حکم میں خون بہالے کر معافی کی دفعہ نہ تھی اس لیئے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا اور قاتل کی نیکی اور احسان کی یاد دلائی گئی اور مقتول کے رشتہ داروں کو معاف کر دینے یا خون بہالے لینے کے بعد انتقام لینے پر عذاب الٰہی کا ڈر سنایا گیا۔ دیکھو کہ اسلام کا حکم توراہ انجیل اور اخلاق' انتقام اور عفو دونوں کو کس خوبی سے یکجا کرتا ہے۔

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا۔

وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس والعین بالعین والانف بالانف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاصط فمن تصدق بہ فھو کفارہت لہط ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئك ھم الظلمون وقفینا علی اثارھم بعیسی ابن مریم مصدقا لما بین یدیہ من التوراہت واتینا الانجیل فیہ ھدی ونور و مصدقا لمابین یدیہ من التوراہت وھدی و موعظہت للمتقین۔ (مائدہ:۷)

اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراہ میں یہ حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں برابر کا بدلہ' تو جس نے بخش دیا تو وہ اس کیلئے کفارہ ہے' اور جس نے خدا کے

اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا تو وہی ظالم ہیں'
اور ہم نے بنی اسرائیل کے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے
بیٹے عیسیٰ کو بھیجا جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا
تھا اور اس کو انجیل دی جس میں رہنمائی اور روشنی ہے اور جو
اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتی ہے اور جو
پرہیز گاروں کیلئے ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے۔

۲۔ یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانونی و اخلاقی احکام تھے' مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اس جامعیت کے نکتہ کو پیش نظر رکھتا ہے۔ فرمایا:

وان تبتم فلکم رء وس اموالکم۔ (بقرہ:۳۸)
اور اگر تم سود سے باز آ گئے تو تمہارا وہی حق ہے جو اصل
سرمایہ تم نے دیا تھا۔

یہ تو قانون تھا' اب اخلاق دیکھئے۔

وان کان ذوعسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ وان
تصدقوا خیرلکم ان کنتم تعلمون۔ (بقرہ:۲۸)
اور اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اس کو اس وقت تک مہلت
ہے جب تک اس کو کشائش ہو اور بالکل معاف کر دینا
تمہارے لیئے زیادہ اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہو۔

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے اس جامعیت کو قائم رکھا ہے۔ فرمایا:

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم
لھو خیر للصبرین۔ (نحل)
اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو دی گئی ہے اور اگر صبر
کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیئے بہت بہتر ہے۔

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا۔

والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون ون وجزآء
سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ

علی اللہ انہ لا یحب الظلمین۔ (شوریٰ: ۴۰)

اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو تب وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے تو اگر معاف کر دیا اور نیکی کی تو اس کا ثواب دینا خدا پر ہے، وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان از خود کسی پر ظلم کرنے میں پہل اور سبقت نہ کریں لیکن اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہیں جتنا ان پر کیا گیا۔ کیونکہ قانون یہی ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے جیسا کہ تورات میں بیان ہوا ہے لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کر دے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے (واصلح) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملے گا اور ملاغت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے۔

الغرض عفو اور انتقام میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کی جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن و امان رہ سکتا ہے اور نہ افراد کے بڑے حصوں کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے۔ حالانکہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے، اس لیئے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظام ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔

اس لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسی تعلیم کو لے کر آئے جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے۔ اس نے یہ کہا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دے دیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجراء میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے چھوٹے، امیر و غریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق کیا جائے تا کہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے، دوسری طرف عفو کو شخصیت کے

مدارج کمال کا ذریعہ بتایا تا کہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے۔

جماعتی انتظامات کے قیام کے لیئے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجراء کے وقت حکم ہوتا ہے۔

ولا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللہ ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر۔ (نور: ۱)

اور تم کو اللہ کے حکم چلانے میں ان دونوں گنہگاروں پر ترس نہ آئے اگر تم کو خدا پر اور قیامت پر ایمان ہے۔

یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہاں ہے اور جو قیامت میں ہوگی وہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی اس لیئے اس گناہ کی سزا دنیا ہی میں دے دینا درحقیقت اپنے گنہگار بھائی پر احسان کرنا اس لیئے اس سزا کے دینے میں نرمی نہ کی جائے۔

کسی سزا کے جاری کرنے میں اونچے نیچے اور امیر وغریب کے فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم میں گرفتار ہوئی اور قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دی جائے اور اس کے لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں سفارشیں پہنچائی گئیں تو فرمایا ''اے لوگو! تم سے پہلے قومیں اسی لیئے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے خدا کی قسم! اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹتا۔ (۱)۔''

دوسری طرف عفو کا یہ حال ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا۔ لا یہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہے۔ (۲)۔ تو اس کو (قانوناً) سزا ملی ہو۔'' یہ عمل تھا تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ''میں نے آپ ﷺ کی خدمت میں قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھا۔ لیکن یہ کہ اس میں آپ ﷺ نے معاف اور درگزر کرنے کا

مشورہ دیا۔ (۳)۔ یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی کر دینے کو فرمایا۔ معمولی چھوٹے جرم کی نسبت صحابہ سے فرمایا۔ آپس میں گناہوں کو معاف کر دیا کرو لیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچے گا تو سزا ضروری ہو جائے گی۔ (۴)۔ ''یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہو جائے گا' تو پھر سزا ہونا واجب ہے تا کہ حکومت کا رعب دلوں پر قائم رہے' چنانچہ ایک دفعہ کا

(۱)۔ صحیح بخاری جلد دوم کتاب الحدود ص ۱۰۰۲ (۲)۔ ایضاً کتاب الحدود۔ (۳)۔ ابوداؤد نسائی کتاب الدیات۔ (٤)۔ ابوداؤد کتاب الحدود۔

واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سو رہے تھے' ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی وہ پکڑا گیا اور عدالت نبوی ﷺ میں پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ جن صاحب کی چادر تھی انہوں نے آ کر عرض کی کہ ''یا رسول اللہ! کیا تیس درہم کی ایک چادر کے لیئے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ میں یہ چادر اس کے ہاتھ ادھار فروخت کر دیتا ہوں۔'' فرمایا کہ ''میرے پاس لانے سے پہلے یہ کیوں نہیں کر لیا۔ (۱)۔''

یہ تو اس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے اور اس لحاظ سے قانون محمدی ﷺ موجودہ سلطنتوں کے قوانین سے زیادہ نرم ہے' زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

عفو و درگزر کی تعلیم ::

اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار ترین تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گزرتی ہے وہ عفو درگزر' ضبط نفس' تحمل اور برداشت کی ہے لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے' سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور خدائے تعالیٰ کی توحید اور عظمت و جلالت

اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے
ہیں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے فرمایا:

(۱)۔ ابوداؤد کتاب الحدود۔

ولمن صبر و غفران ذلك لمن عزم الامور۔
(شوریٰ: ۴)

اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو وہ بے شک
ہمت کے کام ہیں۔

اس برداشت اور عفو کو وحی محمدی ﷺ نے اپنے الفاظ میں ''عزم'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انبیاءؑ اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے فرمایا:

فاصبر كما صبر اولوا العزم من الرسل۔ (احقاف: ۴)
اور برداشت کر جس طرح ہمت اور عزم والے پیغمبروں نے
برداشت کیا۔

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہئے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے فرمایا:

وامر بالمعروف وانه عن المنكر واصبر على ما
اصابكط ان ذلك من عزم الامور۔ (لقمان: ۲)
اچھی بات بتا اور بری بات سے روک اور جو تجھ پر پڑے اس
کو سہار لے کہ یہ ہمت کے کام ہیں۔

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے فرمایا:

وان تصبر واوتتقوا فان ذلك من عزم الامور۔ (آل عمران: ۱۹)
اور اگر صبر کرو اور تقوی اختیار کرو تو یہ بڑے ہمت کے کام ہیں۔

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگزر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا گیا اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ حسب ذیل آیت میں ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

قل للذین امنوا یغفروا للذین لا یرجون ایام اللہ۔ (جاثیہ: ۲)

(اے پیغمبر) ایمان والوں سے کہہ دو کہ ان کو جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے، معاف کریں۔

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے، ظاہر ہے کہ یہ وہی کافر ہیں جو کافر و مشرک ہیں، اب دیکھئے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بیزاری ہے اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کریں اور ان کی خطاؤں سے درگزر کریں، کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ ترغیب کی خاطر اس عفو و درگزر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر ان کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے۔

ان تبدوا خیرا او تخفوہ او تعفوا عن سوء فان اللہ کان عفوا قدیرا۔ (نساء: ۲۱)

اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کر دیا چھپا کر کر دیا یا کسی برائی کو معاف کرو (تو یہ مسلمان کی شان ہے) کیونکہ خدا معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔

یعنی جب گنہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہئے اور اس تعلیم میں قرآن پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمہارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس

اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے، پھر دوسری جگہ فرمایا مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برا نہ مانو۔ کیونکہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بے جا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے، اگر ایسا موقع آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہئے کہ وہ شیطان کے پھندے سے بچالے اور غصہ سے محفوظ رکھے۔

ادفع بالتی ھی احسن السیئہت نحن اعلم بما یصفون وقل رب اعوذبك من ھمزات الشیطین واعوذبك رب ان یحضرون۔ (مئومنون:٦)

مشرکوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دے ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور کہہ کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کی چھیڑ سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے رب اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے، مگر تمام مذکورہ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے۔ فرمایا:

والذین یصلون ما امراللہ بہ ان یوصل ویخشون ربھم ویخافون سوء الحساب۔ والذین صبروا ابتغاء وجہ ربھم واقاموا الصلوہت وانفقوا مما رزقنھم سرا وعلانیہت ویدرء ون بالحسنہت السیئہت اولئك لھم عقبی الدار جنت عدن۔ (رعد:٣)

اور جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم ان کو اللہ نے دیا ہے (یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور حساب کے برے انجام سے خوف کھاتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی خوشی کے لیئے صبر کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں اور برائی کے بدلہ

بھلائی کرتے ہیں انہی کے لیئے ہے پچھلا گھر' ہمیشہ رہنے کے باغ۔

ان سے کہا جائے گا۔

سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار۔ (رعد:۳)

تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے میں کہ تم نے صبر کیا سو خوب ملا پچھلا گھر۔

آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارت غیبی میں نہ تو نماز کا ذکر ہے نہ خیرات کا اور نہ خوف خدا کا۔ صرف ایک صبر کی جزا کی خوشخبری ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک اور آیت میں نومسلم یہودیوں کو اپنے برخلاف اپنی ہم قوموں سے جو دلآزار فقرے اور اعتراضات سننے پڑتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہوگیا ہے کہ وہ برائی کی جگہ بھلائی کرتے ہیں۔

اولئك يؤتون اجرهم مرتين بما صبروا ويدرءون بالحسنة السيئة ومما رزقنهم ينفقون واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنه وقالوا لنا اعمالنا ولكم اعمالكم سلام عليكم لا نبتغي الجاهلين۔ (قصص:٦)

وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا پائیں گے اور وہ برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں اور ہمارا دیا کچھ خیرات کرتے ہیں اور جب کوئی نکمی بات سنتے ہیں' تو اس سے درگزر کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیئے ہمارے کام ہیں' اور تمہارے لیئے تمہارے کام' سلامت رہو' ہم کو بے سمجھوں سے مطلب نہیں۔

ان آیتوں کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجئے۔ نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں بلکہ ان کے حق میں سلامتی کی دعائے خیر بھی کرتے ہیں

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''قرابت کا حق ادا کرنے والا وہ نہیں ہے جو احسان کے بدلہ میں احسان کرتا ہو' بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو۔ (۱)۔ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر عرض کی کہ ''اے خدا کے پیغمبر! میرے کچھ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ میں تو سلوک کرتا ہوں مگر وہ بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں۔ میں حلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو ان کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو۔'' یعنی نیکی کے لقمہ سے ان کا منہ بند کر رہے ہو اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے' خدا کی مدد شامل رہے گی۔ (۲)۔حذیفہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو' تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی کریں گے' اور وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے' یہ نہیں بلکہ اپنے کو پرسکون اور مطمئن رکھو' لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو اور اگر برائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو۔ (۳)۔''

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں' جھوٹے وعدوں' خیانت کارانہ معاہدوں اور پرفریب صلحوں سے دھوکا دیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہی ہدایت ہوئی:

ولا تزال تطلع علی خائنۃ منھم الا قلیلا منھم
فاعف و اصفح ان اللہ یحب المحسنین۔ (مائدہ:۳)
اور ان میں سے چند کے سوا اوروں کی کسی نہ کسی خیانت سے
تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے تو تو ان کو معاف کر اور ان کے قصور

سے درگزر کرکہ اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اور ان کے قصوروں سے درگزر کرنا' اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنے والوں کو اپنے پیار اور محبت کو خوشخبری دیتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم اس باب میں کس قدر اہم اور کامل ہے۔

(حاشیہ گذشتہ صفحہ) (۱)۔ صحیح بخاری بحوالہ مشکوہ باب البر والصلتہ۔ (۲)۔ صحیح مسلم بحوالہ مشکوہ باب البر والصلتہ۔ (۳)۔ جامع ترمذی کتاب البر والصلتہ ص ۳۳٤ (غریب۔)

معاملات میں، اخلاق میں، جو چیزیں ناجائز اور مصلحت عامہ کے مخالف تھیں، ان کی ترغیب دی، لیکن امر و نہی کے طریقے اور ان کی جزئیات کے احاطہ میں کمی و بیشی ہے اور اسی نے ان مذاہب کے احکام و شرائع میں باہم امتیاز پیدا کر دیا ہے۔ اس بنا پر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے۔ جس سے برائیوں کا تمام تر سدباب ہوتا ہے اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہو، اسی طرح بہترین اخلاقی تعلیم وہ ہے جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصاء کیا ہو اور عام انسانوں کے لیئے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے، اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری اور انضباط ہے۔ یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے ہیں۔ اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے۔

مثلاً توحید تمام مذاہب کا ام الاصول ہے لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعین نہیں کی۔ اس بنا پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہو گیا، صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے۔ جس نے شرک کے تمام علل و اسباب اور عواقب و نتائج کی تحدید کی، اور ان کا کلی استیصال کیا، شرک کا ایک۔ متداول طریقہ بت پرستی تھا۔ اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دے جاتی اور عرب کے تمام بت توڑ دیئے جاتے لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا جو ان بتوں کی یاد کو تازہ کر سکتی تھیں، تصویر بجائے خود کوئی بری چیز نہ تھی تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی، اس لیئے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا۔ کسی کی مدح میں غلو

واغراق اگر چہ ایک قسم کی بداخلاقی ہے تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور ان کے نفوذ طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے' اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہوسکتا ہے۔ اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کے لیئے اس سے کام لے سکتا تھا' تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی ہے جس نے امم قدیمہ میں شرک کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برسر منبر سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی۔

لاتطرونی کما اطرت النصاری ابن مریم فانما انا عبدہ فقولو اعبداللہ ورسولہ۔ (بخاری' کتابالانبیاء)

میری شان میں مبالغہ نہ کرو جس طرح نصاری نے ابن مریم کی شان میں کیا۔ میں تو خدا کا بندہ ہوں۔ تو کہو کہ خدا کا بندہ اور رسول۔

یہ ایک کلی حکم تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی' اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا بتا کر اس کی بیخ کنی کی' یہی حال عبادات کا بھی ہے اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا اور یہی روش اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے۔ اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیروؤں کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا اور کوئی بات سوال و جواب کے لیئے باقی نہیں رکھی یہی معنی اس تکمیل کے ہیں جس کے لیئے آپ ﷺ کی بعثت ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اخلاق کی تکمیل تین حیثیتوں سے فرمائی ہے۔

۱۔ تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ۔

۲۔ ہر برائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ۔

۳۔ نرمی و گرمی' عاجزی و بلند ہمتی دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اور ان کے مواقع کی تحدید۔

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ ::

یہودی وعیسائی اور دوسرے اخلاقی معلمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا اس راز کو فاش کر دے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہے بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنالی گئی ہے اور ان میں سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت احکام عشرہ کی ہے یعنی وہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے۔ ان دس حکام میں سے پہلا حکم توحید' دوسرا تصویر اور مجسمہ بنانے کی ممانعت تیسرا خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت اور چھوتھا سبت کے دن آرام کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے۔ باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں جو حسب ذیل ہیں: (۱)۔ (دیکھو خروج' باب ۲۰)

۱۔ تو اپنے ماں اور باپ کو عزت دے۔

۲۔ تو خون مت کر۔

۳۔ تو زنا مت کر۔

۴۔ تو چوری مت کر۔

۵۔ تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔

۶۔ تو اپنے پڑوسی کی جورو' اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز پر تیرے پڑوسی کی ہے' لالچ مت کر۔

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے اس کے بعد خروج باب ۲۲' اور ۲۳ میں قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں اور آ گئی ہیں یعنی مسافر' بیوہ اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم اور جھوٹی گواہی کی ممانعت' پھر احبار باب ۱۹ میں انہی حکام کی

حسب ذیل مزید تفصیل ہے۔

۱۔تم میں سے ہر شخص اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا ہے۔

۲۔تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو۔

۳۔تو میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔

۴۔تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے، تو مزدور کی مزدوری چاہیے کہ ساری رات صبح تک تیرے پاس نہ رہ جائے۔

۵۔تو بہرے کو مت کوس، تو وہ جس چیز سے اندھے کو ٹھوکر لگے اندھے کے آگے مت رکھ۔

۶۔تو حکومت میں بے انصافی نہ کر، غریب و امیر کو نہ دیکھ بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر۔

۷۔تو عیب جوؤں کے مانند اپنی قوم میں آیا جایا نہ کر اور اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ۔

۸۔تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ رکھ۔

۹۔تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلہ مت لے اور نہ ان کی طرف کینہ رکھ۔

۱۰۔تو اس کے آگے جس کا سر سفید، اٹھ کھڑا ہو اور بوڑھے مرد کو عزت دے۔

۱۱۔اگر کوئی مسافر تمہاری زمین پر تمہارے ساتھ سکونت کرے، تم اس کو مت ستاؤ، بلکہ مسافر کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ایسا جانو جیسے وہ تم میں پیدا ہوا ہے بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو جیسا آپ کو کرتے ہو۔

۱۲۔تم حکومت کرنے میں پیمائش کرنے میں، تولنے میں ناپنے میں بے انصافی نہ کرو۔

(۱)۔توراہ کے اخلاقی احکام۔

انجیل کے اخلاقی احکام ::

انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہیں کیا ہے بلکہ ان کی تفصیل بھی نہیں کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کو رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنی اور روح کی طرف دعوت تھی۔ یہ حقیقت جس طرح احکام میں نظر آتی ہے' اخلاق میں بھی جھلکتی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی تجدید و اصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی تورات' حضرت داؤدؑ کی زبور حضرت سلیمانؑ کے امثال' اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں میں جو خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے' ان کو یکجا اپنے مشہور وعظ میں ان کے سامنے پیش کیا۔ اس مشہور اخلاقی وعظ میں بترتیب حسب ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں۔

دل کی غریبی' غمگینی' حلم و بردباری' راست بازی' رحم دلی' پاک دلی' صلح جوئی' صبر' عفو و درگذر پاک دامنی' قسم کھانے کی ممانعت' ظالم کا مقابلہ نہ کرنا' قرض معاف کرنا' دشمنوں کا پیار کرنا' ریا کی ممانعت توکل' عیب نہ لگانا' جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں ایسا بھی ان کے ساتھ کرو۔

یہ اخلاقی تعلیمات بیشتر انہی لفظوں کے ساتھ جو انجیل میں ہیں۔ بنی اسرائیل کے مختلف صحیفوں میں مذکور ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خاص طور سے ان اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود ان میں اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح و معنی کو جلوہ گر کرنا تھا۔

اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصاء ::

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں' اس لیئے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا' اس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا۔ بلکہ تمام قوموں اور زمانوں تک وسیع کیا گیا۔ اس لیئے تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جاتیں یا پائی جانے والی

تھیں ان سب کو استقصاء کر کے منع کیا گیا اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا' اور ان کے حصول کی تاکید کی گئی' گذشتہ صحیفوں میں جن برائیوں سے روکا گیا ہے۔ یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وحی مبارک نے ان کی تمام جزائیات کا استقصاء کیا اور ان کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کر دیا۔ ذیل میں ہم ان اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہیں جن کی تعلیم یا ممانعت قرآن پاک نے کی ہے۔

قرآنی اخلاق کی فہرست ::

سچ بولنا' جھوٹ کی برائی' علم بے عمل کی مذمت' عام عفو و درگذر' توکل' صبر' شکر' حق پر استقامت' خدا کی راہ میں جان دینا' سخاوت اور خیرات کا حکم' بخل کی برائی' اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت' میانہ روی کی تاکید' عزیزوں' قرابتداروں' یتیموں' مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی' مسافروں سائلوں اور غریبوں کی امداد' غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان' فخر و غرور کی برائی امانت داری' وعدہ کا ایفاء کرنا' عہد کا پورا کرنا' معاہدوں کا لحاظ کرنا' صدقہ اور خیرات' نیکی اور بھلائی کی بات کرنا' آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا' کسی کو برا بھلا نہ کہنا' کسی کو نہ چڑھانا' نہ برے ناموں سے یاد کرنا' والدین کی خدمت' اور اطاعت' ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا۔ حق گوئی انصاف پسندی' سچی گواہی دینا' گواہی کو نہ چھپانا' جھوٹی گواہی کا دل کی گناہگاری پر اثر' نرمی سے بات کرنا۔ زمین پر اکڑ کر نہ چلنا' صلح جوئی' اتحاد و اتفاق' ایمانی برادری' انسانی برادری' اکل حلال' روزی خود حاصل کرنا' تجارت کرنا' گداگری کی ممانعت' لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بری بات سے روکنا' اولاد کشی اور کسی دوسرے کے ناحق جان لینے کی ممانعت' یتیم کی کمالت' اس کے مال و جائیداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت' ناپ اور تول میں بے ایمانی نہ کرنا' ملک میں فساد برپا نہ کرنا۔ بے شرمی کی بات سے روکنا' زنا کی حرمت' آنکھیں نیچی رکھنا۔ کسی

کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا' ستر اور حجاب' خیانت کی برائی' آنکھ' کان اور دل کی بازپرس' نیکی کے کام کرنا' لغو سے اعراض' امانت وعہد کی رعایت ایثار' تحمل' دوسروں کو معاف کرنا' دشمنوں سے درگذر' بدی کے بدلہ نیکی کرنا' غصہ کی برائی' مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ' مشرکوں کے بتوں تک کو برا نہ کہنا' فیصلہ میں عدل وانصاف' دشمنوں تک سے عدل وانصاف صدقہ وخیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی برائی۔ الاہنے کی مذمت' فسق وفجور سے نفرت' چوری' ڈاکہ' رہزنی اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت' دل کا تقوی اور پاکیزگی' پاکبازی جتانے کی برائی رفتار میں وقار ومتانت' مجالس میں حسن اخلاق' ضعیفوں' کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ نیکی' شوہر کی اطاعت' بیوی کا حق ادا کرنا' ناحق قسم کھانے کی برائی' چغل خوری' طعنہ زنی اور تہمت دھرنے کی ممانعت' جسم وجان اور کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت' شرمگاہوں کی ستر پوشی' سائل کو نہ جھڑکنا' یتیم کو نہ دبانا' خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا' غیبت نہ کرنا' بدگمانی نہ کرنا' سب پر رحم کرنا' ریا اور نمائش کی ناپسندگی۔ قرض دینا' قرض معاف کرنا سود اور رشوت کی ممانعت' ثبات قدم' استقلال اور شجاعت وبہادری کی خوبی' لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی' شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت' بھوکوں کو کھانا کھلانا' ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز' بے غرض نیکی کرنا۔ مال ودولت سے محبت نہ ہونا' ظلم سے منع کرنا' لوگوں سے بے رخی نہ کرنا' گناہ سے بچنا' ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمائش' معاملات میں سچائی اور دیانتداری۔

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست ::

یہ وہ تعلیمات ہیں جن کا ماخذ قرآن پاک ہے۔ ان کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان اقوال میں ہے جو ان کی تفسیر اور تشریح میں احادیث میں مذکور ہیں۔ ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ

کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کی بڑی تقطیع کے ۱۸۷ صفحوں میں ہے۔ جن میں سے ہر ایک صفحہ میں ۳۷ سطریں ہیں اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب وعنوانات میں منقسم ہیں، ان میں سے بعض مکرر باتیں بھی ہیں۔ تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی ونفسانی کیفیات وحالات کا کوئی ایسا جز نہ ہوگا جو داعی اسلام علیہ السلام کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو، اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو۔ ہم ذیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں جو صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں۔

صلہ رحمی، ماں باپ کے ساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا ہمسایوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا اہل وعیال کی پرورش، یتیموں، بیوہ کی خبر گیری، حاجت مندوں کی امداد، اندھوں کی دستگیری، عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی، قرض داروں پر احسان، فریادیوں کی فریاد رسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیر خواہی، جانوروں پر شفقت اور رحم، محسنوں کی شکر گزاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں کی خدمت وعیادت، رشک وحسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت وبہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی، امیر وامام کی اطاعت، مداومت عمل، اپنے ہاتھ کام کرنا، شیریں کلامی، خوش خلقی فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم وحیا، حلم ووقار، غصہ کو ضبط کرنا، عفو ودرگذر، صبر وتحمل، حسب ونسب پر فخاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر بلا اجازت داخل نہ ہونا۔ دوسرے کے گھر جا کر ادھر ادھر نہ دیکھنا دوسرے بھائی کے

لیئے پیٹھ پیچھے دعا کرنا' رفق و نرمی' قناعت و استغنا' گداگری کی ممانعت اپنے گناہوں کی پردہ پوشی' اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا چغل خوری کی ممانعت' تہمت لگانے کی برائی' غیبت کی ممانعت بغض وکینہ کی ممانعت' دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت' رازداری' تواضع وخاکساری' امانت داری' گالی کی ممانعت' منہ پر مدح و ستائش کی ممانعت' لعنت کرنے کی ممانعت' بخل کی ممانعت' فضول گوئی کی ممانعت' فضول خرچی کی ممانعت' کبر وغرور کی مذمت' ہنسی مذاق کی برائی' نفس انسانی کا احترام' ظلم کی ممانعت' عدل و انصاف' تعصب کی ممانعت' سخت گیری کی ممانعت غمخواری وغمگساری' توکل' لالچ کی برائی' رضا بالقضاء ماتم کی ممانعت قمار بازی کی ممانعت' سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت' جھوٹی گواہی کی ممانعت' جھگڑا فساد کرنے کی ممانعت' باہم مصالحت کرانا' ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے منافقت اور دورخی' چال کی مذمت' وعدہ خلافی کی ممانعت' خیانت اور فریب کی ممانعت' شراب خوری' زنا کاری اور چوری کی ممانعت' طہارت و صفائی' دوست واحباب کی ملاقات سلام وتحیت' مصافحہ ومعانقہ' دیگر آداب ملاقات' آداب مجلس' آداب طعام' آداب لباس' آداب نشست وبرخاست' خانہ داری کے آداب' سونے جاگنے کے آداب' عورتوں کے متعلق خاص آداب واخلاق وسلوک کے احکام۔

ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ۔ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

اخلاقی جزئیات کا استقصاء ::

انسان بڑا بہانہ جو اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے اس کے لیئے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے' اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کرے' اس کے لیئے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بداخلاقی

کے ایک ایک جزئیہ کا استقصاء کیا جائے اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے اور اس کی تہہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے اور ان کے متعلق صریح احکام دیئے جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اس کی توضیح کے لیئے امر و نہی دونوں کی ایک ایک دو دو مثالیں کافی ہوں گی۔

صدقہ و خیرات تمام مذہبوں میں ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے لیکن توراہ نے اس کو صرف عشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اس میں نہیں ملتا۔ انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے اور ہر ایک کے ایک ایک جز کی تفصیل کر دی۔ توراہ میں یہ مبہم تھا کہ کتنے غلے یا سونے چاندی کے مالک پر عشر یا زکوٰۃ فرض اور کن کن چیزوں میں فرض ہے۔ شریعت محمدی ~ صل ۳ ~ نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد اور زمانہ کی پوری طرح پوری تعیین کر دی۔ وہ اجناس مقرر کر دیے جن میں عشر یا زکوٰۃ واجب ہے ان کی تحصیل کا طریقہ بتا دیا' ان کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتوں کی تشریح کر دی' اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم سب کچھ راہ خدا میں لٹا کر خود مفلس اور کنگال بن جاؤ بلکہ یہ کہا:

یسئلونک ماذا ینفقون۔ قل العفو (بقرہ:۲۷)

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں وہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دے کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھا کر دوسروں کی حاجت پوری کرو۔ تو یہ تمہارے سے مال خلق کی دلیل ہے انصار جنہوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مہاجرین کی مصیبتیں دور کیں' ان کی تعریف میں خدا نے فرمایا:

یوثرون علی انفسھم ولو کان بھم

خصاصہ ہت۔(حشر: ۱)

وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود ان کو حاجت ہو۔

صحابہ کی مدح میں فرمایا:

یطعمون الطعام علی حبہ مسکینا و یتیما واسیرا۔(دہر: ۱)

خود کھانے کی خواہش کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔

قرآن پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے۔

اکثر لوگ وہ چیز خدا کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں جو سڑی گلی، خراب اور نکمی ہو۔ قرآن پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجائے جو اس خیرات کا مقصد ہے، نفس کی اور دناعت اور آلودگی۔ ظاہر کرتا ہے۔ فرمایا:

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون و ما تنفقوا من شی ء فان اللہ بہ علیم۔(آلعمران: ۱)

تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک اس میں سے تم خرچ نہ کرو جو تم کو محبوب ہے اور جو بھی تم خرچ کرو۔ خدا کو اس کا علم ہے۔

پھر فرمایا:

یایہا الذین امنوا انفقوا من طیبت ما کسبتم و مما اخرجنا لکم من الارض و لا تیمموا الخبیث منہ تنفقون ولستم بلخذیہ الا ان تغمضوا فیہ ط واعلموا ان اللہ غنی حمید۔(بقرہ:۲۶۷)

اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو اس میں کی اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لیئے زمین سے نکالتے ہیں اس میں سے کچھ

خدا کی راہ میں دو اور اس میں سے خراب چیز دینے کا قصد بھی
نہ کرو۔ کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے تو نہ لو۔ مگر یہ کہ چشم پوشی کرو
اور یقین کرو کہ اللہ بے پرواہ اور خوبیوں والا ہے۔

اس آیت پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ وہ بے پرواہ اور خوبیوں والا ہے۔ یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی اس کا یہ سبب نہیں کہ نعوذ باللہ خود خدا کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کو ضرورت ہے کہ وہ تمہاری ہر اچھی سے اچھی چیز سے۔ بے نیاز اور بے پرواہ ہے بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے اس لیئے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے۔

سب سے پہلے تمہاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں جن کی کفالت کا بار تم پر ہے اہل و عیال، دست نگر عزیز و قریب، پھر دوسرے محتاج و مسکین اور یتیم اور مسافر۔

یسئلونک ماذا ینفقون قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتمی والمسکین وابن السبیل وما تفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم۔ (بقرہ: ۲۶)

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کریں، کہہ دے کہ جو
کچھ تم نیکی کا مال خرچ کرو وہ ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں،
مسکینوں، اور مسافر کے لیئے اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو اللہ
اس سے واقف ہے۔

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کر دے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ ''ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے'' لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو تو فرمایا مزدوری کرے اور جو ملے اس میں سے کچھ خود کھائے کچھ محتاجوں کو کھلائے، صحابہؓ نے عرض کی اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو فرمایا تو غم رسیدہ، حاجت مند کی کوئی جسمانی خدمت کرے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی تعلیم

دے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچے' یہ بھی صدقہ ہے (۱)۔۔ دوسرے موقع پر فرمایا ''اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے' کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے' کسی اندھے کی دستگیری بھی صدقہ ہے' راستہ سے پتھر' کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے' اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ (۲)۔۔'' غور کیجئے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے۔

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کر کے اس کو یاد مت دلاؤ' نہ احسان اس پر جتاؤ' نہ اس کے اس کے شکریہ کے طالب ہو۔ نہ نمائش مقصود ہو کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوسری ہی وحی میں یہ نکتہ بتایا گیا۔ فرمایا:

ولا تمنن تستکثر (مدثر: ۱)

اور اپنا احسان نہ جتا کہ تو اور زیادہ چاہے۔

عام مسلمانوں کو تاکید کی گئی۔

یایھا الذین امنوا لا تبطلوا صدقتکم بالمن و الاذی کالذی ینفق مالہ رئاء الناس و لا یئومن باللہ و الیوم الاخر۔ (بقرہ: ۲۶۴)

اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھ کر اور جتا کر برباد مت کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے کھانے کے لیئے خرچ کرتا ہے اور خدا' اور پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا۔

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی سی نیکی بہتر ہے۔

---

(۱) ادب المفرد امام بخاری باب ان کل معروف صدقہ ص ۴۶ مصر (۲)۔ جامع ترمذی ابواب البر و الصلتہ صنائع المعروف۔

قول معروف و مغفرہت خیر من صدقہت یتبعھا اذی و اللہ غنی حلیم۔ (بقرہ: ۲۶۴)

اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس

اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہ کر اور اپنا دل پکا کر کے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو۔

بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ اس سے مقصود خود خدا ہو۔

وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله وما تنفقوا من خير يوف اليكم وانتم لا تظلمون۔(بقرہ:۲۷۲)

اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر اور خیرات کروگے وہ تم کو پوری ملے گی، تمہارا حق کچھ دبا نہ رہے گا۔

صدقہ وخیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔

مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ ::

احکام میں یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مثلاً مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہیں کیا ہے مگر اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے تذبذب اور شک اور وہاں اور انہیں کے تمام پہلوؤں کو دور کر کے اس بارہ میں ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کر دیا۔ اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگوں نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی، اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو ان کے نقصانات سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا، اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیہ محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مثلاً ایک شخص شراب نہیں پیتا لیکن اس کی تجارت کرتا ہے، ایک شخص ان دونوں چیزوں سے احتراز کرتا ہے لیکن ان برتنوں کو استعمال میں لاتا ہے جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے، لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لعن الله الخمر

وشاربها وساقيها وبائعها ومبتاعها وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولہت الیہ۔):(

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا' خدا شراب پر' اس کے پینے والے پر' اس کے پلانے والے پر' اس کے بیچنے والے پر' اس کے خریدنے والے پر اس کے نچوڑنے والے پر اس سے اپنے لیئے نچڑوانے والے پر' اس کے لے جانے پر والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لے جائی جائے' لعنت کرتا ہے۔

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (ڈیفینیشن) بتائے' عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی' اس کے مختلف نام تھے اور ان کا اثر بھی مختلف تھا۔ قرآن مجید میں حرمت شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے' اس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعین نہایت ضروری تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تعین فرمادی۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من العنب خمرا وان من التمر خمرا وان من العسل خمرا وان من البر خمرا وان من الشعیر خمرا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: انگور سے بھی شراب بنتی ہے' کھجور سے بھی' شہد سے بھی' گیہوں سے بھی' اور جو سے بھی۔

قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان الخمر من العصیر والزبیب والتمر والحنطہت والشعیر والذرہت وانی انہاکم عن کل مسکر۔

راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ شراب انگور' منقی' کھجور' گیہوں' جو' جوار اور ہر چیز کے نچوڑنے سے بنتی ہے اور میں تم کو ہر نشہ آور چیز سے

منع کرتا ہوں۔

عرب کے مختلف حصوں میں انہی چیزوں کی شراب بنتی تھی' اس لیئے یہ تعریف عرب کے تمام اصناف شراب کو حاوی تھیں' لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا' اور یہ ممکن تھا کہ دنیا کے اور حصوں میں شراب کی دوسری قسمیں استعمال کی جائیں اور تحدید ان کو شامل نہ ہو' اس لیئے آپ نے شراب کی ایک کلی تعریف کی' جو تمام اقسام شراب پر حاوی تھی۔

کل مسکر خمر و کل مسکر حرام

ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

کل شراب اسکر فھو حرام۔

ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے وہ حرام ہے۔

لیکن حیلہ جو لوگوں کیلئے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا۔ حرمت شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستنبط ہوتی ہے۔ نشہ ہے لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی جائے کہ نشہ نہ آئے اس لیئے فرمایا:

ماالسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔):(

جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو نشہ نہیں لاتیں۔ تاہم اعصاب میں ایک خدر کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے' بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں اور تمدن کے زمانہ میں مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرجات کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ممانعت فرمائی:

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کل مسکر ومفتر۔):(

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر منشی ومخدر چیز سے منع فرمایا۔

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس کی منشی چیزیں استعمال

کریں جن پر عرفاً خمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو۔ عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی، جس کو داوی کہتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا:

یقول یشربن ناس من امتی الخمر یسمونها بغیر اسمها۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال کریں گے۔

اس کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی، شروع میں ان کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی۔

نهی عن الدباء والحنتم والمزفت والنقیر۔

آپ ﷺ نے کدو، سبز و سیاہ رنگ کے مرتبان اور کھجور کی جڑ سے جس میں سوراخ کر کے شراب رکھی جاتی، منع فرمایا۔

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی۔ اس لیئے آپ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرما دیا۔ اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں، ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے، دوسرے یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان دونوں صورتوں میں بھی شراب کی ممانعت فرمائی چنانچہ چند یتیم بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی، حرمت خمر کے بعد وہ بیکار چیز ہوگئی۔ حضرت ابوطلحہؓ نے آپ ~ صل۳~ سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیوں نہ بنالیا جائے لیکن آپ ~ صل۳~ نے اجازت نہ دی۔ (۱)۔

ایک بار دیلم حمیری نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں اور سخت کام کرتے ہیں اس لیئے گیہوں کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے، آپ نے فرمایا کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا تو اس کو چھوڑ دو، انہوں نے کہا لیکن اور لوگ نہیں چھوڑیں گے، ارشاد ہوا کہ "اگر نہ چھوڑیں تو ان سے جہاد کرو۔ (۲)۔

اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیوں سے سود لینے کی ممانعت کی تھی، انجیل نے بھی ''ناروا نفع'' سے لوگوں کو روکا ہے۔ تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے، لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت، ربا کے اقسام، کن کن چیزوں میں کس کس قسم کا ربا ناجائز ہے۔ اس کی پوری تفصیل کی، اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا۔ اس ظلم میں لوگ کسی طرح بھی شریک ہوں، ان سب کو شریک جرم ٹھہرایا۔

(۱)۔ابوداؤد جلد ۲، ص ۸۰ کتاب الاشربۃ اس مسئلہ کے جواز و عدم جواز میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ (۲)۔ ابوداؤد جلد ۲، ص ۸۰ کتاب الاشربہ۔

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربوا وموکلہ وشاھدہ و کاتبہ۔

آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے سود کھلانے والے، اس پر گواہی دینے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی۔

رشوت کی حرمت میں استقصاء ::

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات میں بھی اس قسم کی تفصیل، استقصاء اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے کیونکہ جس چیز کا رواج پیدا ہو جاتا ہے۔ اسکی نہایت کثرت سے مختلف صورتوں کو مٹا نہ دیا جائے اس چیز کا کلیۃً قلع وقمع نہیں ہوسکتا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوری ::

مسیحی فلسفہ اخلاق نے دنیا میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی کہ اس نے حسن اخلاق کا انحصار اخلاق کی صرف منفعل اور ہر دو قسم میں کر دیا تھا، یعنی تواضع، خاکساری، فروتنی، عاجزی، خواری، بردباری، مسکینی، غمگینی، وغیرہ منفعل قوتوں کو

اخلاق کا درجہ دیا تھا اور اس کے مقابل کی قوتوں کی سخت توہین کی تھی۔ حالانکہ دنیا کے امن وسلامتی اور ترقی وخوشحالی کے لیئے دونوں قسم کی مناسب قوتوں کے امتزاج کی ضرورت ہے جس قدر ایک مقام پر تواضع وخاکساری کی ضرورت ہے اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزت نفس کی حاجت ہے' جس طرح عفوودرگذر بلند ہمتی کا کام ہے اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی بسا ضروری ہے محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندوں کے لیئے ضروری سہی۔ مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہئے کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے۔

نٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر ::

جرمن فلاسفر نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جا وبیجا اعتراضات کے جو تیر برسائے اور ان مسیحی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چیرہ کا داغ ٹھہرایا ہے۔ وہ اسی لیئے ہے کہ وہ صرف کمزوری' عاجزی' خواری اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہیں' جن سے لوگوں میں عزم' بلند ہمتی' استقلال' ثبات قدم' عزت نفس اور خودداری کے جوہر پیدا نہیں ہو سکتے۔ وہ کہتا ہے:

مسیحیت نے ہمیشہ کمزور' پست اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے۔ مسیحیت نے طبائع انسانی کی تمام خوددارانہ قوتوں کا استیصال کر دینا' اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ مسیحیت نے زبردست دماغوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ (۱)۔

اسلامی اخلاق کا اعتدال ::

لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیح علیہ السلام کے ۵۷۵ برس بعد اس نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور ہوا ہے جس نے مسیحی نظام اخلاق کی غلطیوں کی تصحیح کر دی اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا جو ہر شخص' ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے۔ اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہیں گزری تھی کہ محکوموں نے حاکموں کی' پست نے بلند کی' ادنیٰ نے اعلیٰ کی' اور تنزل نے ترقی کی

جگہ حاصل کر لی۔ مسیحی یورپ کو ان میں سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی جب تک اصلاح وتجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریتاً قبول نہیں کیا۔

(۱)۔نٹشے از ایم اے مگے' مترجمئہ مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے باب سوم۔

نفوس کا اختلاف استعداد ::

اخلاقی تعلیم کوئی ایسی طب نہیں ہے جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریوں کا علاج ہو۔ تمام انسانوں کی اندرونی کیفیتیں' اخلاقی استعدادیں اور نفسانی قوتیں یکساں نہیں ہیں۔ انسانوں میں کمزور و پست ہمت بھی ہیں اور قوی و بلند حوصلہ بھی۔ خاکسار و متواضع بھی ہیں اور مغرور و خوددار بھی' بزدل بھی ہیں اور بہادر بھی' بردبار بھی ہیں اور غضبناک بھی۔ بخیل بھی ہیں اور فضول خرچ بھی' گداگر بھی ہیں اور فیاض بھی' ناامید بھی ہیں اور پرامید بھی' ضعیف الارادہ بھی ہیں اور قوی دل بھی۔ ظالم و زبردست بھی اور ذلیل و خوار بھی الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہیں کہ سب کے لیئے ایک دوا کبھی کارآمد نہیں ہوسکتی۔ بہترین اخلاقی معالج وہ ہے جس نے ہر شخص' ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیئے ہوں اور ہر قسم کے مریضوں کو صحیح و تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو۔

ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح ::

صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم اور کیفیت کو دیکھ کر جو عنصر کم ہو اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کر کے قوتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے۔ وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل' پست ہمت کو بلند ارادہ اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق کو نہ غضب کرنے والا بنائے وہ ناامید کو پرامید کرے اور امید سے بھرے ہوئے کہ یہ سمجھائے کہ جو کچھ تم مل رہا ہے وہ خدا سے مل رہا ہے۔ وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کر کے خدا سے مانگنے والا کر دے۔ وہ

ذلیل وخوار کو خوددار اور خوددار کو غیر مغرور بنا دے، وہ اچھی قوتوں کو نشوونما دے اور بری قوتوں کا رخ اچھے مقصدوں کی طرف پھیر کر ان کی برائی کو کم کر دے۔

قدیم فلسفہ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے قوت غضب اور قوت شہوت، غضب نام ہے اپنے نفس کے مناسب امور کے پیش آنے پر ان کی مدافعت کی قوت کا اور شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا۔ ان دونوں قوتوں کی افراط نہ تفریط اور اعتدال اور ان کے مختلف مراتب سے سینکڑوں اچھے برے اخلاقی جزئیات پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے۔ غضب کی قوت اگر افراط و تفریط سے پاک ہو اور عقل کے قابو میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے اور وہ حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے مثلاً خودداری دلیری، آزادی حق گوئی، بلند ہمتی، بردباری، استقلال، ثبات قدم، وقار، صبر وسکون، مطالبہ حق، جدوجہد، سعی ومحنت، جہاد، پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی ہے تو تہور بن جاتی ہے اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور، نخوت، خود پرستی، تکبر، ترفع، دوسروں کی تحقیر، ظلم، قتل نفس وغیرہ کی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جب قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے تو ذلت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف اور دناعت کے قالب میں ظہور کرتی ہے، اسی طرح شہوت کی قوت میں جب کامل اعتدال ہوتا ہے تو اس کو عفت کہتے ہیں۔

یہی صفت مختلف سانچوں میں ڈھل کر مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ یعنی پاکدامنی، پرہیزگاری، جودوسخا، شرم وحیا، صبر وشکر۔ قناعت، بے طمعی، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل واولاد کی آرزو، خانگی مسرت کی مناسب طلب وغیرہ، پھر یہ صفت جب افراط وتفریط کی طرف مائل ہو جاتی ہے تو اس سے حرص وطمع، بے شرمی فضول خرچی، بخل، ریا، اوباشی، تملق، حسد، رشک وغیرہ اوصاف ذمیمہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق ::

مسیحیت کی تعلیم کا منشاء انسان کی دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط و تفریط سے ہٹا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے۔ مسیحیت کے نزدیک نفس کی یہ دونوں قوتیں بذاتہ بری ہیں اور اسلام کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بجائے خود بری نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع و محل برا ہوتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ اپنی قوت غضب کو فنا کر کے ''دشمن کو پیار کرو'' اور نہ یہ کہ اپنی قوت خواہش کو فنا کر کے مجرد رہو اور مفلس و غمگین بن کر زندگی گزار دو۔ بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو بہتر یہ ہے کہ معاف کرو اور خدائی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرو۔ کہ انہیں ہدایت ملے اور خدا کے حلال کیئے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو۔ امام غزالی کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے۔ غصہ کے مٹانے والے کی نہیں' اس نے والکاظمین الغیظ کہا ہے والفاقدین الغیظ نہیں کہا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوریاں ::

دنیا میں علم و ہنر خوشی و مسرت' ولولہ و انبساط' رونق' جد و جہد' جو کچھ ہے' وہ انہی دونوں قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں' اگر یہ دونوں قوتیں یک قلم مٹ جائیں' یا ان میں افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو نیکی' سعادت اور خوش بختی کی آدھی دنیا مر جائے' نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو' نہ عصمت کے کوئی معنی ہوں' نہ عدل کا وجود ہو نہ امن و امان کا نشان ملے' نہ کسی کی ملک محفوظ اور نہ کسی کی جان سلامت رہے' نہ انسان کی بلند ہمتی' استقلال' ثبات قدم اور سعی و محنت کے جوہر نمایاں ہوں' قوموں کی ترقی اور ملکوں کا نظام درہم برہم ہو جائے اور خدا کی یہ دنیا ایک ایسا ویرانہ بن جائے جس میں حرکت و جنبش کا نام نہ رہے۔

مسیحی اخلاقی تعلیم میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا ہے کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہیں ہے بلکہ بے جا غصہ اور ناجائز خواہش بری چیز ہے۔ نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہشیں بری چیزیں ہیں اسی طرح وہ معائب بھی جو ان دونوں قوتوں کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بے آبروئی، بے غیرتی، ذلت پسندی، دناعت، بے طاقتی تملق کم حوصلگی، بے عملی، مستی، فاقہ زدگی بھی برے ہیں۔ اسلام نے اپنے پیروؤں میں ان دونوں قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اس نے جہاں ان کو رحماء بینھم (اپس میں رحمدل) اذلہت علی المومنین۔ (مومنوں کے فرمانبردار) کی تعلیم دی، وہیں اشداء علی الکفار۔ (کافروں پر بھاری) اور اعزہت علی الکافرین۔ (کافروں پر گراں) بننے کی بھی تعلیم دی، اور ان کو بتایا کہ عزت صرف خدا اور رسول اور ان کے فرمانبرداروں کے حصہ میں ہے وللہ العزہت ولرسولہ وللمومنین۔ مسیحی قوموں کو اس وقت تک ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا جب تک اسلامی فلسفہ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بن کر انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔

لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر ::

لیکی تاریخ اخلاق یورپ کی دوسری جلد میں کہتا ہے۔

''لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے، اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزوں اور مناسب رہا۔ تاہم تمدن کی روز افزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا۔ ترقی تمدن کے لیئے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری اور حریت کے جذبات موجود ہوں اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہیں۔ خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل، فوجی طرز زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو۔ تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی و خودداری موجود ہوتی ہے لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ طرز زندگی کا مطمع نظر ہے، کسی طرح ترقی تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا، اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور رفضائل پیدا ہوتے

بھی رہتے ہیں لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مترادف ہو جاتا ہے۔ اسی کو دیکھ کر متاخرین حکمائے اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا اور اس کے دو مظاہر ہیں۔ ایک مردانگی اور دوسرے خودداری انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی، آزادخیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت وحمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے، وہ کیتھولک علاقوں میں نہیں پائی جاتی بلکہ ان کے بجائے دناعت، پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ ارائیاں ہیں، ان سے آخر الذکر یکسر خالی ہیں۔ (فضل ۱۱)

اسلام اور بلند اخلاق ::

لیکن اس کے بالمقابل معلم اسلام علیہ السلام کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا اندازہ آپ کے صرف ایک سبق سے ہو سکتا ہے۔ ان اللہ یحب معالی الامور ویبغض سفافھا۔ (بیشک اللہ معالی امور کو پسند اور محقرات امور کو پسند کرتا ہے۔)

''معالی امور'' سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام اور ''محقرات'' سے مراد چھوٹی اور ادنیٰ باتیں ہیں اس حدیث میں گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو خدا کا دوست بننے کے لیئے ضرورت ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے اور دناعت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے۔

اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کر دینے کے لیئے کافی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

المئومن القوی خیر واحب الی اللہ من المئومن الضعیف وفی کل خیر احرص علی ما ینفعک واستعن باللہ ولا تعجزوان اصابک شئی فلا تقل لوانی فعلت کان کذا وکذا ولکن قل قدراللہ وما

شاء فعل فان لو تفتح عمل الشیطان۔

کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان زیادہ بہتر اور خدا کے نزدیک پیارا ہے اور ہر ایک میں بھلائی ہے۔ ہر وہ چیز جو تجھے نفع دے اس کی پوری خواہش کر اور خدا سے مدد چاہ' اس راہ میں کمزوری نہ دکھا اور اگر تجھے اس میں کچھ تکلیف پہنچ جائے تو یہ نہ کہہ "اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا" بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر کر دیا ہے اور جو چاہا اس نے کیا کیونکہ یہ اگر (اور مگر) شیطان کا کاروبار کھولتا ہے۔

تقدیر' توکل صبر اور شکر ::

یہ حدیث ان تمام مسائل کی شرح کرتی ہے جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر' توکل صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے' اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قضاوقدر کے ضمن میں جلد چہارم میں اور عبادات قلبی کے تحت عنوان جلد پنجم میں کی جا چکی ہے اور بتایا گیا ہے کہ چاروں تعلیمات اسی لیئے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی' پرامیدی' استقلال اور ثبات قدم پیدا ہو۔ مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہئے پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ خدا پر بھروسہ اور توکل کر کے کام شروع کر دینا چاہئے۔ اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر وغرور کی بجائے دل سے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے اور یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ اسی کے فضل وکرم سے ہوا' اور اگر ناکامی ہو تو دل میں یاس اور ناامیدی کے بجائے صبر وثبات پیدا ہونا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ خدا کا منشاء یہی تھا (یہی تقدیر ہے۔)

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے:

فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین' ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم وان یخذلکم فمن ذاالذی ینصرکم من م بعدہ وعلی

الله فليتوكل المئومنون۔ (آلعمران:۱۷۰)

جب تو پکا ارادہ کرلے پھر خدا پر بھروسہ کر' بیشک اللہ متوکلوں کو پیار کرتا ہے' اگر خدا تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں اور اگر وہ چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد کرسکتا ہے۔ خدا ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے۔

ما اصاب من مصيبهت في الارض ولا في انفسكم الا في كتاب من قبلا ان نبراهاط ان ذلك على الله يسيرج لكيلا تاسوا على ماافاتكم ولا تفرحوابما اتكمط والله لا يحب كل مختال فخور۔(حدید:۳)

کوئی مصیبت نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب (الٰہی) میں درج ہوتی ہے۔ یہ اللہ پر آسان ہے یہ اس لیئے تا کہ اس پر جو تم سے جاتا رہے' غم نہ کرو' اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ کرو اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر' توکل اور صبر وشکر کی تعلیم اسلام میں پستی اور دناعت کے لیئے نہیں بلکہ مسلمانوں میں ہمت' جرات' بہادری اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لیئے ہے۔ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہ نے تمام خطرات سے نڈر ہوکر بڑی بڑی سلطنتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا' اور کامیاب رہے ان کو مشکلات میں خدا کے دوسرے برگزیدوں کی یہ دعا سنائی گئی۔

ربنا افرغ علينا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا على القوم الكفرين۔ (بقرہ:۳۴۳)

اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر وثبات کا پانی بہا اور ہمارے پاؤں کو مضبوط گاڑ اور ہم کو کافر لوگوں پر فتحیاب کر۔

اور بتایا کہ مشکلات میں دوسرے پیغمبروں کے ساتھیوں نے کیا کیا۔

وكاين من نبى قتل معه ربيون كثير جفما وهنوا لما

اصابهم فی سبیل الله و ما ضعفوا و ما استکانوا واللہ یحب الصبرین و ما کان قولهم الا ان قالو ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی الکافرین۔(آلعمران:۱۵)

اور کتنے نبی تھے کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے لڑائی لڑی' تو خدا کی راہ میں جو مشکل یا مصیبت پیش آئی اس سے وہ سست نہ ہوئے اور نہ کمزور ہوئے اور خدا ثابت رہنے والوں کو پیار فرماتا ہے اور ان کا کہنا تھا لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا معاف فرما اور ہمارے پاؤں مضبوط رکھ اور ہم کو کافروں پر فتح دے۔

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے:

یایها الذین امنوا اصبروا و صابروا ورابطوا واتقوا الله لعلکم تفلحون۔(آلعمران:۳۰)

اے وہ جو ایمان لائے۔ ثابت قدم رہو اور دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقوی کرو تا کہ کامیاب ہو۔

ان آیتوں سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی' عالی حوصلگی' بلند ہمتی اور مشکلات میں صبر و ثبات قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع' فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے۔ اسی طرح سطوت اور بہادری و حکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے۔

اپنے دشمنوں سے پیار کرو ::

مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زریں اصول یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کو پیار کرو اس میں شک نہیں کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینوں کی آنکھوں خیرہ

ہو جاتی ہیں لیکن اہل معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خود انجیل کے مضمروں (۱)۔ نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے' تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو' دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو' دشمن کے حق میں دعائے خیر کر سکتے ہو مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہیں کر سکتے۔ کہ یہ دل کا فعل ہے جس پر تم کو قدرت نہیں۔

اخلاق محمدی ﷺ نے اس کی بجائے وہ تعلیم دی جن پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے' اور اللہ کے بندوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے یعنی دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ برا چاہنے والوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ جو تم کو بد دعائیں دیں ان کو دعا دو' جو تمہارا قصور کریں۔ ان کو معاف کرو اور جو تم پر ظلم کریں ان کے ساتھ انصاف کرو' فرمایا:

یایھا الذین امنو کونوا قوامین للہ شھدا بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون۔ (مائدہ: ۲)

اے ایمان والو! خدا کے لیئے کھڑے ہو جایا کرو۔ انصاف کے ساتھ گواہ بن کر' اور کسی قوم کی دشمنی تم کو عدل و انصاف کرنے سے باز نہ رکھے۔ انصاف کرو کہ انصاف کرنا پرہیز گاری سے بہت نزدیک ہے اور خدا سے ڈرو کہ اس کو تمہارے کاموں سے خبر ہے۔

ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم وما یلقھا الا الذین صبروا وما یلقھا الا ذوحظ عظیم۔ واما ینزغنک من الشیطن نزغ فاستعذ باللہ انہ ھو السمیع العلیم۔ (حم السجدہ: ۵)

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کو بھلائی سے دفع کرو، تو دفعتہ وہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے؟ رشتہ دار دوست کے مانند ہو جائے گا، اور اس پر عمل کی توفیق انہی کو ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور انہی کو یہ سعادت ملتی ہے جو بڑی قسمت والے ہیں اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو خدا کی پناہ مانگو۔ کہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

(۱)۔اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی۔

۱۔اس آیت پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے۔

۲۔اس آیت پاک میں جس نیکی اور حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے جو تمہارے دشمن ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہی کہ تمہارے اس نیک طرز عمل سے تمہارا دشمن دوست بن جائے گا۔

۳۔دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاق محمدی ﷺ کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے۔

۴۔دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو اس شیطانی تحریک بتایا گیا ہے اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے حضرت ابن عباسؓ جو صحابہؓ میں بڑے مفسر ہیں اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں۔(۱)۔

''اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ وغضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کے برائی کرنے پر حلم اور عفو و درگذر کرنے کا حکم دیا ہے وہ ایسا کریں گے تو خدا ان کو شیطان کے پنجہ سے چھڑائے گا اور ان کا دشمن بھی دوست کی طرح ان کے آگے سر جھکا دے گا۔''

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جو آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے گالی دی، وہ سن کر چپ رہے، اس نے دوبارہ وہی حرکت کی، وہ پھر بھی چپ رہے، اس

نے پھر تیسری دفعہ بدزبانی کی' تو وہ چپ نہ رہ سکے اور کچھ بول اٹھے۔ یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوراً اٹھ گئے حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی' یا رسول اللہ! کیا آپ مجھ سے خفا ہوئے؟ فرمایا ''اے ابوبکر! جب تک تم چپ تھے' خدا کا فرشتہ تمہاری طرف سے کھڑا تھا' جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا۔ (۲)۔''

آپ ﷺ نے فرمایا ''صلہ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحم کرو بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اس کے ساتھ صلہ رحم کرو۔ (۳)۔'' یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں بلکہ دشمنوں کے ساتھ دوستی اصلی خوبی ہے۔

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمت نبوی میں آ کر عرض کی یا رسول اللہ! مجھے وہ بات بتایئے جس کے کرنے سے جنت مل جائے۔ آپ ۔ صل ۳ ۔ نے اس کو چند باتیں بتائیں۔ منجملہ انکے فرمایا ''ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتوں کی بارش کرو۔ (۴)۔''

اسلام کی نظر میں کافر و مشرک سے بڑھ کر تو کوئی دشمن نہیں ہو سکتا لیکن دیکھو کہ قرآن پاک مسلمانوں کو اپنے ایسے دشمنوں کے ساتھ بھی عفو و درگذر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے۔

قل للذین امنوا یغفرو اللذین لا یرجون ایام اللہ لیجزی قوما بما کانوا یکسبون (جاثیہ: ۲)

(اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہہ دے کہ ان کو جو خدا کے دنوں پر یقین نہیں رکھتے' معاف کر دیا کریں' تا کہ خدا ایسے لوگوں کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ دے۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری جلد ۲' ص ۷۱۲ و ابن جریر جلد ۲٤' ص ٦٨ مصر۔ (۲)۔ سنن ابی دائود کتاب الادب۔ باب فی الاختصار۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲' ص ۸۸٦۔ (٤)۔ مستدرک حاکم کتاب المکاتب ج ۲ ص ۲۱۷ حیدر آباد دکن۔

اگر عملی مثالیں چاہتے ہو تو وہ ''ریاکار فریسیوں'' اور ''سانپوں اور سانپوں کے بچوں۔ (۱)۔'' والی مسیحیت کے واعظ میں نہیں بلکہ اسلام کے اس اولین داعی و

ہے۔

کفار ومشرکین سے عدم موالات ::

اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے ان احکام کو پیش کرتے ہیں، جن میں مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل علیحدہ چیز ہے۔ یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروؤں کو اس کے ان مخالفوں کے میل جول، رازداری اور رفاقت سے روک دے جو زور یا سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کر دینے کے درپے ہوں۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹا دینے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی سی حالت قائم ہو۔ یا غلط شبہے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیروؤں کو برگشتہ کرنا چاہتے ہوں چنانچہ اس قسم کی آیتیں:

---

(۱)۔ انجیل متی ۲۳، ۲۵، ۳۳۔ (۲)۔ صحیح بخاری باب فتح مکہ۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الهجرہ۔ (٤)۔ صحیح بخاری باب فتح خیبر و ذکر وفات نبوی ﷺ۔ (٥)۔ صحیح بخاری فتح طائف۔ (٦)۔ صحیح بخاری باب فتح مکہ۔ (۷)۔ کتب سیر و طبقات صحابہ ذکر اشتہاریان فتح مکہ دسیار بن اسود۔ (۸)۔ جامع ترمذی کتاب التفسیر سورئہ فتح ص ٥٤٠۔ (۹)۔ صحیح بخاری کتاب الجهاد ص ۲۰۸۔ (۱۰)۔ ابن سعد غزوہ طائف۔ (۱۱)۔ فتح الباری ج ۷، ص ۲۸٦ باب احد۔ (۱۲)۔ صحیح بخاری مبعث النبی ﷺ مشکوٰہ اخلاق النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحوالہ مسلم۔

لا یتخذ المئومنون الکفرین اولیاء من دون المومنین ومن یفعل ذلك فلیس من الله فی شئی الا ان تتقوا منهم تقتد۔(آل عمران:۳)

ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں تو جو ایسا کرے گا تو اس سے کوئی علاقہ نہیں مگر یہ کہ تم

ان سے بچاؤ چاہو۔

یاایھا الذین امنوا لا تتخذوا اباء کم و اخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمانط ومن یتولھم منکم فائولئک ھم الظلمون۔ (توبہ:۳)

اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھیں، اپنا دوست نہ بناؤ اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہی حد سے گزرنے والے ہوں گے۔

اسی موقع کی ہی ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آراہوں تو اہل حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی، فطرتاً ''ان اہل باطل سے اسی قدر بیزاری اور علیحدگی ہوگی جو اس حق کے مٹانے کے لیئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں۔ اس لیئے حق کی حفاظت کی خاطر اہل باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے، اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہیں جو ''شہزادۂ امن'' کے اس اعلان کے ہیں۔

''یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا، صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ، اور بیٹے کو اس کی ماں، اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں، آدمی کے دشمن اس کے گھر کے لوگ ہوں گے جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔'' (متی کی انجیل باب ۱۰۔۳۴)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی، رحم دلی اور رفیق القلبی نہ تھی، جو دوسرے نادان بت پرستوں اور گنہگاروں کے ساتھ تھی۔ وہ یہودیوں کے بے تکلف سخت سے سخت الفاظ کا خطاب کرتے تھے۔ جب حجاز کے یہودیوں اور سرحد شام کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی جنگ چھڑی اور بظاہر مال و دولت ساز و سامان اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پلہ مسلمانوں سے زیادہ

بھاری نظر آتا تھا تو مدینہ کے منافقوں اور کمزور دلوں کی۔ عاقبت بینی اور دور اندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے ان دشمنوں سے ساز باز رکھیں تا کہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے' اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دین اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے' اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہل کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا۔ فرمایا:

یایھا الذین امنوا لا تتخذوا الیھود و النصری اولیاء بعضھم اولیاء بعضط و من یتولھم منکم فانہ منھمط ان اللہ لا یھدی القوم الظلمین۔ فتری الذین فی قلوبھم مرض یسارعون فیھم یقولون نخشی ان تصیبنا دآئرہتط فعسی اللہ ان یاتی بالفتح او امرتن عندہ فیصبحوا علی ما اسروا فی انفسھم

اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو رفیق نہ بناؤ' وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان سے رفاقت کرے وہ انہی میں ہے' اللہ بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں دیتا اب تو ان کو دیکھتا ہے جن کے دل میں بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان سے ملے جاتے ہیں' کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آ جائے۔ تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی) فتح یا' (ان کی کامیابی کی) کوئی اور بات اپنے پاس سے بھیجے'

ندمین۔ ویقول الذین امنوا اھئولاء الذین اقسموا باللہ جھد ایمانھم انھم لمعکمط حبطت اعمالھم فاصبحوا خسرین۔ یایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلہ علی المومنین اعزہت علی الکافرین۔ (مائدہ: ۱)

زبانیں کھولیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ۔ تم کو تمہاری قرابت اور تمہاری اولاد قیامت کے دن نفع نہیں پہنچائے گی۔

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنیئے:

فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المسطین انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدینط واخرجوکم من دیارکم وظاھروا اعلی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظلمون (ممتحنہ: ۲)

خدا تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے باز نہیں رکھتا جو تم سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں، خدا انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔ وہ انہی سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے جو تم سے مذہب میں لڑائی اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور تمہارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار بنیں۔ جو ان سے دوستی کا دم بھرے گا تو وہی بے انصاف ہوں گے۔

اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ عنقریب تمہاری فتح ہوگی اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائے گی۔ فرمایا:

عسی اللہ ان یجعل بینکم و بین الذین عادیتم منھم مودۃ واللہ قدیر۔ (ممتحنہ: ۲)

امید ہے کہ اللہ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے اور اللہ قدرت والا ہے۔

ان آیتوں کا مطلب ان کے شان نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہو جاتا ہے، انہی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بے خبری میں مکہ پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے۔ تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ایک مسلمان حاطبؓ بن ملتبعہ نے اپنی ذات

وہ تمہارے لیئے پھندے اور دام اور تمہاری بغلوں کے لیئے
کوڑے اور تمہاری آنکھوں میں کانٹے ہوں گے یہاں تک
کہ تم اس پر اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمہارے خدا نے
عنایت کی ہے نابود ہو جاؤ گے۔" (یشوع باب ۲۳۔۱۲)

قرآن پاک اور احادیث میں بعض احکام ایسے بھی ہیں جن کو منکروں، ظالموں، بدکاروں اور گنہگاروں سے علیحدہ رہنے کی نصیحت ہے۔

وذوالو تکفرون کما کفروا فتکونون سوآء فلا تتخذوا منهم اولیاء حتی یهاجروا فی سبیل الله۔ (نساء: ۱۲)

وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جس طرح انہوں نے کفر کیا تو
ان میں سے اپنے دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ خدا کی راہ
میں ہجرت نہ اختیار کریں۔

واذا رایت الذین یخوضون فی آیتنا فاعرض عنهم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہط واما ینسینك الشیطن فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظلمین۔ (انعام: ۸)

اور جب تو ان کو دیکھے کہ جو میری آیتوں کے شان میں لغو
بکتے ہیں تو ان سے کنارہ کرلے یہاں تک کہ وہ اس کے سوا
دوسری بات میں لگ جائیں اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے تو
یاد آنے کے بعد پھر ان گنہگار لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھ۔

وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم ایت الله یکفربها ویستهزابها فلا تقعدوا معهم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہط انکم اذا مثلهم۔ (نساء: ۱۴)

اور تم پر کتاب میں یہ حکم اتار چکا کہ جب سنو اللہ کی آیتوں
سے انکار ہوتے اور ان پر ہنسی ہوتے تو ان کے ساتھ جب

تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں نہ بیٹھو ورنہ تم بھی ان ہی کے جیسے ہو جاؤ گے۔

یہ احکام اس لیئے ہیں تا کہ بری صحبت کا برابر اثر مسلمانوں پر نہ پڑے' ان کے معنی قریب قریب وہی ہیں جو سینٹ پال کے ان فقروں کے ہیں۔

''میں نے خط میں تم کو لکھا کہ حرام کاروں میں مت ملے رہو' لیکن نہ یہ کہ بالکل دنیا کے حرام کاروں یا لالچیوں یا ٹھگوں یا بت پرستوں سے نہ ملو۔ نہیں دنیا سے نکلنا ضرور ہوتا' پر میں نے اب تمہیں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار یا لالچ یا بت پرستی یا گالی دینے والا یا شرابی یا ٹھگ ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا بلکہ ایسے کہ ساتھ کھانا تک ۔۔۔۔ غرض کہ تم اس برے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو۔'' (اول قرنتھون: ۵)

''اور تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوئے میں مت جتے جاؤ کہ راستی اور ناراستی میں کونسا ساجھا ہے اور روشنی اور تاریکی میں کونسا میل ہے' ایماندار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے خدا کی ہیکل کو بتوں سے کونسی موافقت ہے۔۔۔۔ اس واسطے خدا یہ کہتا ہے تم ان کے درمیان سے نکل آؤ' اور جدا ہو اور ناپاک کو مت چھوؤ۔'' (۲۔قرنتھوں ۶)

کفار و مشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی اور روحانی غیرت کے باوجود اسلام دنیاوی معاملات اور اخلاق میں مسلمانوں کو ان سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے عین لڑائی کی حالت میں بھی یہ حکم ہے۔

وان احد من المشرکین استجارک فاجره حتی یسمع کلام الله ثم ابلغه مامنه ذلك بانهم لا یعلمون۔ (توبہ: ۱)

اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے' یہاں تک کہ وہ اللہ کے کلام کو سن لے پھر اس کو تو اس کی

امن کی جگہ تک پہنچادے یہ اس لیئے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔

کیا ایک جنگجو مذہبی دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حسن سلوک ہوسکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآن پاک میں یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک وکافر ہوں تو بھی ان کی خدمت بجالانا اور دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہے۔فرمایا:

وان جاھداک علی ان تشرک بی مالیس لک بہ علم فلا تطعھما وصاحبھما فی الدنیا معروفا واتبع سبیل من اناب الی ثم الی مرجعکم فانبئکم بما کنتم تعلمون۔(لقمان:۲)

اور اگر وہ دونوں (والدین) اس پر ضد کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کر اور اس کی راہ چل جو میری طرف جھکا' پھر تم سب کو میری طرف آنا ہے پھر میں تم کو جتاؤں گا جو تم کرتے تھے۔

مذہبی دشمنوں کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہوسکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

سختی کا جائز موقع ::

اس میں شک نہیں کہ اسلام میں نہ صرف کنارہ بلکہ ان کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح میں منافقین کہتے ہیں۔بعض موقعوں پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کو لڑائی درپیش ہو اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانوں کے ساتھ آباد ہیں وہ دھوکے سے دشمنوں کے ساتھ میل اور سازش نہ کر لیں یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کی جماعت میں تفرقہ پردازی کریں اور طرح کے شبہوں اور افواہوں سے مسلمانون کی جمیعت میں پریشانی پیدا کریں۔اس حالت میں ان کافروں اور منافقوں کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ

بھال کی جائے اور مسلمانوں کو ان کے میل جول سے روک دیا جائے اور اگر وہ لڑ پڑیں تو بہادری کے ساتھ ان سے لڑا جائے' یہاں تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز نہ آ جائیں' ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امام وقت کو حاصل ہے۔ اس موقع کی دو آیتیں سورہ توبہ میں ہیں:

یایھا النبی جاھد الکفار والمنفقین واغلظ علیھم وماوئھم جھنم وبئس المصیرہ یحلفون باللہ ما قالوا ولقد قالوا اکلمہت الکفرو کفروا بعد اسلامھم وھمتو بمالم ینالوا وما نقموا الا ان اغنھم اللہ ورسولہ من فضلہ فان یتوبوا یك خیرالھم وان یتوبوا یعذبھم اللہ عذابا الیما فی الدنیا والاخرہت ومالھم فی الارض من ولی ولا نصیرط (توبہ: ۱۰)

اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کی جائے پناہ دوزخ ہے اور وہ کتنی بری بازگشت کی جگہ ہے۔ یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ حالانکہ انہوں نے یقیناً کفر کی بات کہی اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کیا' اور اس بات کا مقصد کیا تھا۔ جس کو وہ نہ پا سکے اور انہوں نے عیب نہیں کیا لیکن یہی کہ خدا اور اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے ان کو دولت مند کر دیا' تو اگر وہ باز آ جائیں تو ان کیلئے یہ بہت اچھا ہے اور اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ ان کو اس دنیا میں اور آخرت میں دردناک سزا دے گا اور زمین میں ان کا کوئی دوست ہوگا نہ مددگار۔

یہ آیتیں اس سختی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہیں اور ان کے آگے اور پیچھے جو اور آیتیں ہیں' وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہیں۔ تین رکوع کے بعد سورہ کے خاتمہ میں مسلمانوں کو رومیوں (۱)۔ کے مقابلہ میں اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی

ہدایت کی گئی ہے۔

یاایھا الذین امنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظۃ واعلموا ان اللہ مع المتقین۔ (توبہ: ۱۲۶)

اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے ہم سرحد ہیں اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور یقین کرو کہ اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لیئے ہے تا کہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر ان پر حملہ کی نیت نہ کریں۔

تحریم اور ایلاء کے موقع پر جب بعض منافق اہل بیت نبوی ﷺ میں پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی جماعت میں اختراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا:

یاایھا النبی جاھد الکفار والمنفقین واغلظ علیھم وماوبھم جھنم وبئس المصیر۔ (تحریم: ۲)

اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور انکا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بازگشت کی کتنی بری جگہ ہے۔

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کیئے گئے ہیں جو اس انتظام و نظام کی بربادی میں کفار و مشرکین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے۔

قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے جس سے مخالف جو اسلام پر سنگدلی اور بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں' اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں اور وہ سورہ فتح کی حسب ذیل آیت ہے جس میں ایک طرف صحابہؓ کی بہادری اور دوسری طرف ان کی باہمی محبت اور رحمدلی کی تعریف ہے۔

(۱)۔ تفسیر ابن جریر' طبری' ج ۱ ص ۴۶' مصر۔

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا (فتح: ۴)

محمدؐ خدا کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری) ہیں اور آپس میں مہر و محبت رکھتے ہیں۔

اشداء علی الکفار کا یہ ترجمہ کہ ''وہ کافروں پر سخت ہیں'' اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگدلی، بے رحمی اور بداخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور شدت ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفار ان سے مرعوب ہیں اور مقابلہ میں مسلمان پر ایسے بھاری ہیں کہ کفار ان پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیئے محاورہ کے مطابق اشداء علی الکفار کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں بلکہ یہ کرنا چاہئے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں، یعنی ان پر غالب اور ان کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں ان سے کسی طرح دبتے نہیں۔ چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں، ابن حیان اندلسی نے بحر المحیط میں قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیتے ہیں جو سورہ مائدہ کی اس آیت کے ہیں۔

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً سورہ ہود میں ہے:

یقوم ارھطی اعز علیکم من اللہ۔ (ہود: ۸)

اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر خدا سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے۔

دوسری آیت میں ہے:

عزیز علیہ ما عنتم۔ (توبہ: ۱۲۶)

تمہاری تکلیف رسول پر گراں ہے۔

لسان العرب میں ہے:

ورجل شدید قوی والجمع اشداء (ج ۴ ص ۲۱۸ مصر)

مرد شدید، یعنی قوی اور اس کی جمع اشداء ہے۔

قرآن پاک میں اشدقوۃ‘خلقا‘ اشدتثبیتا‘ اشدمنھم بطشاوغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے۔ دوسرے مشتقات میں بھی یہی معنی مراد لیئے گئے ہیں۔

اشددبہ ازری (طہ: ۲)

اس سے میری کمر کو مضبوط کر۔

وبنینا فوقکم سبعا شدادا (بنا: ۱)

اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔

وشددنا ملکہ۔ (ص: ۲)

اور ہم نے ان کی سلطنت مضبوط کی۔

فشدوا الوثاق (قتال: ۱)

پھر مضبوط باندھو۔

شدید کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے بلکہ اس کے مقابلہ میں مضبوط اور سخت رہے اور یہی صحابہ کرامؓ کی صفت تھی۔ انہوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پرواہ نہ کی تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پرزور مقابلہ کیا۔ دشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھ دیا‘ ان کے نیزوں کو سینوں میں جگہ دی‘ ان کے تیروں کی بوچھاڑ سے لہولہان ہوئے۔ مگر جس کو ایک کہا تھا۔ پھر اس کو دو نہ کہا‘ اور جس کی تصدیق کر چکے تھے‘ پھر اس سے انکار نہ کیا آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود ان سے دبنے لگے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کا رعب ان پر بیٹھ گیا۔ قرآن نے جو پیشن گوئی کی تھی کہ:

کہ میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کی رعب بٹھا دونگا۔ وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا:

وقذف فی قلوبھم الرعب (احزاب و حشر: ۱)

ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔

مخالفوں کے دلوں میں اسی رعب کے بٹھانے کے لیئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو

ہمیشہ سامان جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے:

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ۔(انفال:۸)

ان کیلئے تم سے جو طاقت ہو سکے اور گھوڑوں کا باندھنا وہ تم تیار رکھو۔ کہ اس سے دشمنوں کو مرعوب کرو۔

اس آیت کا مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو بلکہ یہ ہے کہ تمہارا ساز و سامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رعب کھائے۔ اس لیئے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے۔ فرمایا جو شخص گھوڑا خدا کی راہ میں باندھتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے وہ اس لیئے ثواب کا موجب ہے جو ضرورت کے لیئے باندھتا ہے اس کے لیئے پردہ پوش ہے اور جو نمائش کے لیئے باندھتا ہے وہ اس کے لیئے عذاب (۱)۔ ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہ میں نیت کا سوال سب سے اہم ہے' اس لیئے ضروری ہے کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے اس کا منشا ذاتی و قومی نفرت اور بیزاری نہ ہو بلکہ وہ صرف حق کی نفرت کی خاطر اور خدا کے لیئے ہو' لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک و برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیروؤں کو نہیں روکا ہے۔

خدا کے لیئے محبت اور خدا کے لیئے ناراضی ::

یہاں کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا' لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے۔ محبت اور عداوت موافقت اور مخالفت' رضامندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہیں اور دنیا کے تمام کام' تمام تحریکیں' اور تمام جدوجہد' انہی دو برابر

جذبات کے نتیجے ہیں' اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرمجوشیاں سرد پڑھ جائیں' اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبادت ہے' برف کا تودہ بن جائے۔ اس لیئے یہ ناممکن ہے اور نا مناسب ہے کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے بلکہ جو ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس غیظ و غضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو۔ جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے۔ چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آرزدگی' ذاتی خودغرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لیئے نہ ہو بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت' نیکی کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لیئے ہو۔ دوستی و دشمنی' رضامندی اور ناراضی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو خدا کے لیئے ہو۔ الحب فی اللہ والبغض فی اللہ۔

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الجہاد۔

یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی و ناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے۔ ناخوشی و ناراضی کو سرے سے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ جو ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کی جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے۔ وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے نفرت بھی کرے گا۔ وہ ایمان کو چاہئے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا' وہ نیکیوں سے دوستی کرے گا تو شریروں سے علیحدہ بھی ہوگا' مومن سے خوش ہوگا تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا۔ انسان کے سینہ میں صرف ایک دل ہے اور ایک ہی دل میں ایک شے کی اور پھر اس کی ضد کی دونوں کی محبت یکجا نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ قرآن نے کہا:

ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ۔ (احزاب: ۱)

خدا نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔

سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

اسی مفہوم کو حضرت مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

''کوئی آدمی دو آقاؤں کی خدمت نہیں کرسکتا اس لیئے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا یا دوسرے سے دوستی یا ایک کو مانے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔تم خدا اور مال دونوں کی خدمت نہیں کرسکتے۔'' (متی ۶۔۲۴)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے پولوس (۱)۔نے خدا اور آدمی یعقوب نے خدا (۲)۔اور دنیا' یوحنا (۳)۔ نے خدا اور دنیا کے برے کاموں کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کرے گا وہ دوسرے سے نہیں۔

یہی مفہوم احادیث کے ان الفاظ میں ہے کہ محبت اور عداوت دونوں صرف خدا کیلئے ہونی چاہئیں' اپنی ذات کیلئے نہیں۔ بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابوذرؓ سے پوچھا کہ ''ایمان کی۔کونسی زنجیر زیادہ مضبوط ہے'' عرض کی ''خدا اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے'' فرمایا ''یہ کہ باہمی میل جول خدا میں ہو' محبت بھی خدا میں ہو اور ناراضی بھی ہو تو خدا میں ہی ہو۔'' مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ ''کونسی نیکی خدا کو زیادہ پیاری ہے۔'' کسی نے نماز کہا' کسی نے زکوٰۃ کہا' کسی نے جہاد بتایا' آپ ﷺ نے فرمایا' ''تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ خدا کو یہ نیکی پسند ہے کہ خدا کیلئے محبت اور خدا ہی کیلئے مخالفت ہو۔(۴)۔''

اسلام میں کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں ::

خدا کے لیئے کسی سے ناخوشی یا مخالفت یا ناراضمندی کے یہ معنی ہیں کہ نفسانی غرض و غایت کو اس جذبہ میں کوئی دخل نہ ہو' نیز یہ کہ شخص سے تشخیص کی حیثیت سے مخالفت یا

بیزاری نہ ہو بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو، اور اس کے سبب سے اس شخص سے علیحدگی و بیزاری ہو۔ جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں۔ قرآن پاک کی ایک آیت ہے:

(۱)۔ گلیتوں کے نام (۱۔۱۰) (۲)۔ یعقوب (٤۔٤) (۳)۔ یوحنا (۲۔٥) (٤)۔ مشکوٰۃ الادب باب الحب فی اللہ۔

حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم و کرہ الیکم الکفرو الفسوق والعصیان (حجرات: ۱)

خدا نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا، اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک مکروہ بنایا۔

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مومن یا فاسق و عاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور فسق و فجور اور عصیان کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و نا رضامندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کفر و نفاق ہے۔ یہ دور ہو جائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے۔ فرمایا:

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ، فاخوانکم فی الدین۔ (توبہ: ۳)

تو اگر وہ کفر سے توبہ کرلیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

یہی سبب ہے کہ صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعتہً کراہت محبت سے، دشمنی دوستی سے اور نا رضامندی رضامندی سے بدل جاتی ہے کیونکہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائش یا دائمی نفرت و کراہت کا وجود نہیں، نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابل نفرت اچھوت ہے، نہ ملچھ ہے نہ چنڈال ہے نہ یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے اور نہ غیر قوم ہے اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد اور بدگہر کی تفریق ہے اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے گورے اور یورپین اور غیر یورپین

کی تقسیم ہے۔ جو کچھ ہے وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے۔ ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابوجہل و ابولہب ہو سکتا ہے اور ایک معمولی حبشی و عجمی مسلمان و موحد ہو کر بلال حبشیؓ صہیب رومیؓ اور سلمان فارسیؓ کا رتبہ پا سکتا ہے۔ وہی عمرؓ وہی سفیانؓ وہی عکرمہ، وہی خالدؓ جو کل تک کفر کے علمبردار بن کر مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے۔ بیک نظر ان کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرگروہ ہو گئے اور مسلمان ان کے فدائی بن گئے اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا:

اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا(آل عمران: ۱۰۳)

(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی اور تم اس کے فضل کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔

ناپسندیدگی و بیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے جس کی بنا کسی انسان کی گنہگاری اور عصیان کاری پر ہے تو یہ ندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت و شفقت سے مبدل ہو جاتا ہے۔ مبشر عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے گنہگار کو خدا کی زبان سے یہ مژدہ سنایا کہ:

یعبادی الذین اسرفوا علی انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله ان الله یغفر الذنوب جمیعا انه هو الغور الرحیم۔(زمر:۶۰)

اے میرے وہ بندو جنہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ خدا سب گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔ وہ بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

آپ نے فرمایا۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب له "گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو۔" (۱)۔ یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نہیں ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون کی چھینٹیں اڑ کر حضرت خالدؓ بن ولید کے منہ پر پڑیں' انہوں نے عورت کو برا کہا۔ آنحضرت ﷺ نے سنا تو فرمایا ''خالد چپ رہو'' اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس نے وہ توبہ کی ہے اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا۔'' (۵)۔

ترک ہوی ::

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نکتہ سکھایا ہے کہ انسان کے نیک سے نیک فعل کی اچھائی بھی اس کی غرض و غایت پر موقوف ہے یعنی یہ کہ اگر وہ خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لیئے ہے تو وہ نیک اور اچھا ہے اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لیئے ہے تو وہ نیکی نہیں' اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآن پاک میں ہوی ہے۔ ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال و اخلاق کو ہوی سے پاک رکھے کہ انسان کا حقیقی خدا وہی ہے جس کے لیئے وہ کام کرتا ہے۔ اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دین حق کے پیرو نہیں اور اپنے کاموں کی بنیاد اخلاص پر نہیں رکھتے یہ کہا کہ ان کا دین و مذہب اپنی خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور ان کے سینوں کے اندر اغراض نفسانی اور خواہش وہوی کے بت چھپے۔ قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتوں میں متنبہ کیا:

افرایت من اتخذ الھہ ھوبہ۔ (جاثیہ:۳)

اے پیغمبر! کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔

---

(۱)۔ابن ماجہ باب ذکر التوبہ۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الحدود۔ (۳)۔ فتح الباری شرح حدیث مذکور۔ (٤)۔ صحیح مسلم کتاب الحدود۔ (۵)۔ کتاب الحدود۔

اسی لیئے نفس کے تزکیہ و صفائی اور روح کی بلندی و پاکی کیلئے شریعت

محمدی ۔ صل ۳ ۔ نے ترک ہوی کا طریقہ پیش کیا۔ بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بری خواہش سے پاک ہو جائے کیونکہ اگر وہ ہر اچھی اور بری خواہش سے پاک ہو جائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض و غایت نہ ٹھہرے گی اور نہ اس کا کوئی محرک باقی رہے گا۔ اسی لیئے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں بلکہ ہر بری خواہش، ہر باطل غرض اور نفسانی ہوا و ہوس کے ترک کا مطالبہ ہے کیونکہ اسکی پیروی سے گمراہی و ضلالت پیدا ہوتی ہے۔ وحی محمدی ۔ صل ۳ ۔ نے فرمایا:

ومن اضل ممن اتبع هويه بغير هدى من الله (قصص: ۵)

اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے خدا کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی۔

پھر فرمایا:

ولا تتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله۔ (ص: ۲)

اور خواہش نفسانی کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔

عدل و راستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے وہ اسی ہوی کے زہر قاتل سے مر جاتی ہے۔ فرمایا:

فلا تتبعوا الهوى ان تعدلوا (نساء: ۲)

عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

ہوائے نفسانی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا اور اس کے امن کی جگہ جنت ہے۔ فرمایا:

واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى فان الجنة هى الماوى (نازعات: ۲)

اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو بری خواہش سے روکا تو بیشک جنت ہے اس کے امن سے رہنے کی جگہ۔

اخلاق اور محبت الٰہی ::

دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے۔ خاص کردہ محبت اور پیار جو خدا کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو۔ یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہوسکتی ہے' ان میں دیگر ضروریات دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے۔ عقائد کے باب میں محبت الٰہی کے زیرعنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو راہ اور انجیل میں بھی ہے مگر اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے_ اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں داعی خیر کی پیروی محبت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے فرمایا:

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ (آل عمران: ۴)

کہہ دو اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم سے محبت کرے گا۔

اس لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات' ارشادات' احکام' اخلاق اور اعمال کی پیروی محبت الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لیکن قرآن پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے بلکہ نام بنام اس نے بتایا ہے کہ خدا کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں۔ اس سے اسلامی اصول اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آیا ہے کہ ان کاموں سے جو خدا کی محبت کا ذریعہ ہیں' حسن خلق بھی ہے اور ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے بداخلاقی اور

بدکرداری بھی ہے۔

واللہ ولی المومنین (آل عمران:۷)

اور خدا ایمان والوں کو دوست رکھتا ہے۔

ان اللہ یحب المحسنین (بقرہ ۲۴، مائدہ:۳)

خدا اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان اللہ یحب التوابین (بقرہ:۲۸)

خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان اللہ یحب المتوکلین (آل عمران:۷)

خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان اللہ یحب المقسطین (مائدہ،۶:حجرات،۷)

خدا انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان اللہ یحب المتقین۔(توبہ:۱)

خدا تقوی والوں کو پیار کرتا ہے۔

واللہ یحب الصابرین (آل عمران:۱۵)

اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

واللہ یحب المطہرین (توبہ:۱۳)

اور خدا پاک صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ (صف:۱)

خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔

ان آیات پاک میں نو باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو محبت الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقوی، صبر، پاکیزگی، جہاد۔

فان اللہ لا یحب الکافرین (آل عمران:۴)

تو خدا کافروں کو پیار نہیں کرتا۔

ان اللہ لا یحب المعتدین (بقرہ ۲۴، مائدہ،۲۰)

خدا حد سے بڑھنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

ان اللہ لا یحب من کان مختالا فخورا (نساء:۶)

خدا اس کو پیار نہیں کرتا جو اترانے والا اور شیخی مارنے والا ہو۔

ان اللہ لا یحب من کان خوانا اثیما(۱۶)

خدا اس کو پیار نہیں کرتا جو خیانت گار اور گنہگار ہو۔

ان اللہ لا یحب الکافرین (آل عمران:۴)

خدا خیانت کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

ان اللہ لا یحب کل خوان کفور(حج:۵)

خدا کسی خیانت کار ناشکرے کو پیار نہیں کرتا۔

ان اللہ لا یحب المفسدین (قصص)

زخدا فساد کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

ان اللہ لا یحب المسرفین (انعام:۷)

خدا فضول خرچ لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔

انہ لا یحب المستکبرین (نحل:۳)

خدا مغروروں کو پیار نہیں کرتا۔

انہ لا یحب الظلمین (شوری:۴)

خدا ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔

واللہ لا یحب کل کفار اثیم (بقرہ:۳۸)

خدا ناشکر گنہگاروں کو پیار نہیں کرتا۔

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جانا، فخر و غرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ وہ بداخلاقیاں ہیں جو انسان کو محبت الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں۔

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب میں محبت الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے۔

تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لیئے ہوئی، یعنی لوگوں کو سکھانا اور بتانا اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی ان کو اچھی باتوں کا پابند اور بری باتوں سے روک کر، آراستہ و پیراستہ بنانا اس لیئے آپ ﷺ کی خصوصیت یہ بتائی گئی، کہ:

یعلمھم الکتب و الحکمت ویز کیھم۔(بقرہ:۱۵)

وہ (رسول) ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا اور پاک و صاف کر کے نکھارتا ہے۔

اور اسی لیئے حدیث میں آیا ہے کہ:

وانما بعثت معلما(ابن ماجہ باب فضل العلماء)

اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلم ربانی نے کن طریقوں سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا۔

ایک کامیاب معلم کیلئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں ہوں۔ وہ ایک جراح ہے جس کے ہاتھ میں نشتر ہو جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تندرست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو، اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ زخم کو نہ تو پاک کر سکتا ہے اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ تندرست گوشت و پوست پیدا کر سکتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے، حضرت عائشہ لکھتی ہیں کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیئے کسی سے بدلہ نہیں لیا مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود

کوتوڑے تو اس کی سزا دیتے تھے۔(۱) قریش کی ایک بی بی چوری کے جرم میں پکڑی گئی، بعض مسلمانوں نے ان کی سفارش کرنی چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا، تم میں سے پہلے کی قومیں اسی لیئے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو اس کو سزا دیتی تھیں اور جب بڑے لوگ تھے ان کے حکام ٹال جاتے تھے۔ (۲)۔

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں، نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبوی ﷺ میں ایک بدوی آیا، اتفاق سے اس کو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا، صحابہؓ یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اس کو مارنے کو دوڑے۔ آپ ﷺ نے روکا اور فرمایا، تم سختی کے لیئے بلکہ نرمی کے لیئے بھیجے گئے ہو، اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا کہ یہ عبادت کے گھر ہیں، یہ نجاست کے لیئے موزوں نہیں، یہ خدا کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لیئے ہیں۔ پھر لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہادو (۳)۔

(۱)۔صحیح بخاری باب قول النبی ﷺ بسردا ولاتعسردا۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الحدود۔ (۱)۔ صحیح بخاری کتاب الادب بسردا ولاتسرداد کتاب الطھارہ و صحیح مسلم باب وجوب غسل البول۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان میں بحالت روزہ ایک غلطی ہوگئی، اس نے لوگوں سے کہا مجھے حضور ﷺ کے پاس لے چلو، انہوں نے کہا یہ ہم سے نہ ہوگا، تو وہ اکیلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچا اور واقعہ عرض کیا، فرمایا ایک غلام آزاد کردو، عرض کی یارسول اللہ میرے پاس تو ایک غلام بھی نہیں، فرمایا دو مہینے لگاتار روزے رکھو، عرض کی روزہ ہی میں یہ گناہ ہوا، فرمایا تو اچھا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلادو۔ عرض کی ہم تو خود کنگال ہیں، فرمایا کہ اچھا بنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لیکر پہلے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور جو بچے وہ تم اور

تمہارے گھر والے کھائیں، وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ میں آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے اور حضور ﷺ نے کتنی نرمی کی۔(۱)۔

یہ اور اسی قسم کی اور واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حدود الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا وہاں نرمی نہیں برتی جاتی تھی، لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل اور رذائل کا موقع ہوتا تھا، آپ نرمی سے سمجھا دیتے اور لطف و محبت سے فرما دیتے تھے۔

قاہری با دلبری پیغمبر است

اخلاقی فضائل اور رذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کیئے گئے کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکم خداوندی بنا کر کہیں اچھی اچھی مؤثر تشبیہوں کے ذریعہ، کہیں اس کے اچھے یا برے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمان الٰہی کی صورت اختیار کی، اور کہا:

ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان و ایتای ذی القربی وینھی عن الفحشاء و المنکر و البغی یعظکم لعلکم تذکرون۔(نحل:۱۳)

بیشک اللہ عدل اور احسان کرنے اور رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی کی بات اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی سے منع کرتا ہے تمہیں وہ نصیحت فرماتا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو، اور ان سے بچو، تمام انسانوں کو جو اس قادر مطلق کے عاجز درماندہ بندے ہیں یہ فرض ہے کہ وہ اس حکم کی پوری پوری تعمیل کریں اس تعمیل میں بندوں کے چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اور رذائل کو قبیح منظار

اور قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو جائے۔ مثلاً خدا کی راہ میں دنیا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی تصویر یوں کھینچی گئی کہ کمثل حبہت (بقرہ:۲۶۱) یہ نیکی ایک دانہ ہے، زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اگتا ہے اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔

(۱) ابوداؤد باب فی اظہار۔

ریا و نمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور نہ خدا کے ہاں اس کا کوئی بدلہ ہے قرآن نے اس کو یوں ادا کیا کمثل صفوان (بقرہ:۲۶۱) اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر ڈال دے جو دھل کر صاف ہو گئی، اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا۔

بے ایمانی سے یتیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ ''جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔'' (نساء ۱) پیٹھ پیچھے۔ مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی، ''کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے۔'' (حجرات:۲) کسی کو کوئی چیز دیکر واپس لینا شرافت اور فیاض کے خلاف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی برائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے۔ ''جو دیکر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا ہے۔'' اس سے زیادہ کوئی مکروہ تشبیہ اس بداخلاقی کی ہو سکتی ہے۔ قبیلہ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود آ کر عدالت نبوی ﷺ میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی، حضور ﷺ نے تحقیقات کے بعد اس کے سنگسار کیئے جانے کا حکم دیا جب وہ سنگسار ہو چکا تو آپ ﷺ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ ''اس کو دیکھو کہ خدا نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو نہیں چھوڑا اور کتے کی طرح سنگسار کیا گیا،

حضور ﷺ نے یہ سن کر خاموش رہے تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی' آپ ﷺ نے پکارا کہ فلاں صاحب کہاں ہیں' انہوں نے کہا کہ ہم یہ ہیں۔ یارسول اللہ! فرمایا تم اترو اور گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ انہوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول! اس کو کون کھائے گا' فرمایا تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھنونی بات ہے۔(۱)۔''

غیبت کی برائی کو ذہن نشین کرنے کے لیئے اس سے زیادہ مؤثر طرز کوئی ہوسکتا ہے۔

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور برے کاموں کے برے نتیجے کو کھول کر بیان کردیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور برے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے' اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے مثلاً شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے برے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت بیان کیا ''مسلمانو! شراب' جوا اور پانسے کے تیر ناپاک ہیں' شیطان کے کام' شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے۔'' (مائدہ: ۱۲) شراب اور جوئے کے برے نتیجے یہ ہیں کہ ان کا خاتمہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے اور انسان ان میں پھنس کر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بیکار ہو جاتا ہے' نتیجہ جانی و مالی بربادی ہوتی ہے۔

اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائل اخلاق کو الوہیت' ملکوتیت اور نبوت کے محاسن میں اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے' جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے مثلاً عفو و درگذر کی تعلیم دی تو یوں فرمایا:

ان تبدوا خیرا اوتخفوہ او تعفوا عن سوء فان اللہ کان عفوا قدیرا۔(نساء: ۱۴۹)

اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا کسی برائی کو معاف

کروتو اللہ ہے معاف کرنے والا قدرت والا۔

(۱)۔تفسیر بحر محیط ابی حیان اندلسی زیر آیت مذکورہ ج ثالث ص ۳۸۵۔

قدرت کے باوجود عفو اللہ کا خاص وصف ہے' بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو۔تخلقوا باخلاق اللہ۔گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ! اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں' اس کا جوتا' اچھا ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے فرمایا نہیں۔

ان اللہ جمیل ویحب الجمال (صحیح مسلم و ترمذی)

اللہ جمال والا ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

اس لیئے بندوں کو بھی چاہئے کہ اپنے طور وطریق ولباس میں سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھیں۔

مسلمانوں میں عزم واستقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اس کو قرآن نے اس طرح کہا:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوہت حسنہت (احزاب:۳)

تمہارے لیئے اللہ کے رسول میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔

حق کے مقابلہ میں ماں' باپ رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیم کے نمونہ سے دی گئی۔

قد کانت لکم اسوہت حسنہت فی ابرہیم والذین معہ (ممتحنہ: ۱)

تمہارے لیئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا

نمونہ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں اخلاق کی بعض صفتوں کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کرکے اس کی بڑائی ظاہر کی ہے اور ان کی پیروی کی ترغیب دی ہے۔

فضول خرچی کی بری صفت سے مسلمانوں کو بچانا تھا تو اس کی برائی کو یوں ذہن نشین کرایا۔

ان المبذرین کانوا اخوان الشیطین (بنی اسرائیل:۳)

بے شبہ فضول خرچی شیطانوں کے بھائی ہیں۔

اب کون ہے جو شیطانوں کا بھائی ہونا پسند کرے گا۔

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی برائی جاہل عربوں کے ذہن نشین کر دی۔ جابرؓ بن سلیم ایک صحابی دربار نبوت میں اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مجلس میں ایک شخص بیٹھا ہے، جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجالاتے ہیں۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ سن کر میں نے دو دفعہ کہا اے اللہ کے رسول آپ ~ صل۳~ پر سلام علیک السلام۔ آپ ~ صل۳~ چپ رہے، پھر فرمایا علیک السلام نہ کہو، یہ مردہ کا سلام ہے، السلام علیک کہو، میں نے کہا آپ ~ صل۳~ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا ہاں میں اس اللہ کا رسول ہوں، جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو تو اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور جس سے خشک سالی میں مانگتے ہو تو وہ اگا دیتا ہے اور جس سے تم جب کسی لق و دق بے نشان بنجر میں ہو۔ تمہاری سواری وہاں گم ہو جائے تو دعا کرتے ہو تو وہ اس کو تمہارے پاس لوٹا دیتا ہے، میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، ارشاد ہوا کسی کو برا نہ کہو، جابرؓ کہتے ہیں کہ آپ ~ صل۳~ کے اس فرمان کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام، یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی برا نہیں کہا۔ آپ ~ صل۳~ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ تم کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اس کو کیئے جاؤ اور

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب کاموں میں بہتر کام کیا ہے؟ فرمایا خدا پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا' پھر پوچھا کس غلام یا باندی کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے؟ فرمایا جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر میں پسندیدہ' پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کاموں میں سے کچھ نہ کر سکوں؟ فرمایا تو کسی بے کس کی مدد کرو یا بدسلیقہ کا کام کر دو۔ پوچھا اگر یہ بھی نہ بن سکے' فرمایا شر سے لوگوں کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کر سکتے ہو۔ (ادب المفرد و بخاری ص ۴۵۵ مصر)

کبھی آپ ~ صل ۳ ~ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے' وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے' آپ ~ صل ۳ ~ ان کی اس توجہ کو مفید پا کر وہ جواب دیتے جو ان کے دل میں اتر جاتا' ایک دفعہ صحابہؓ سے آپ ~ صل ۳ ~ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ لوگوں نے عرض کی' ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو' نہ سامان ہو' فرمایا میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گو نماز' روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا' لیکن اس نے اس کو گالی دی ہوگی اس پر تہمت لگائی ہوگی اس کا مال کھا گیا ہوگا' اس کا خون بہایا ہوگا' اس کو مارا ہوگا تو اس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ ان لوگوں کو دے دیا جائے گا اگر اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور اس کے ذمہ کچھ لوگوں کا باقی رہ گیا تو ان کی برائیاں اس کے نام لکھ دی جائیں گی' پھر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (۴)۔

---

(۱)۔عرب امراء فخر و غرور کیلئے ایسا کرتے تھے جیسے عباء کے دامن یا گون کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا دوسری قوموں میں غرور کی نشانی تھی۔ (۲)۔ سنن ابی داؤد باب فی اسبال الازار۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب الخدو من الغضب و الترمذی ماجاء فی کثرت الغضب۔ (٤)۔ صحیح مسلم کتاب البر باب تحریم اظلم۔

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپ ~ صل ۳ ~ نے یہ دریافت کیا کہ پہلوان تم کس کو کہتے ہو؟

لوگوں نے کہا جس کو لوگ کشتی میں پچھاڑ نہ سکیں، فرمایا نہیں یہ پہلوان نہیں ہے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔(۱)۔

اس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہوں، صبر کی تلقین کرنی تھی، تو دریافت فرمایا تم بے اولاد کس کو کہتے ہو، صحابہؓ نے عرض کی جس کے بچہ نہ ہو، فرمایا وہ بے اولاد نہیں، بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہیں بھیجی۔ (۲)۔

(احادیث میں ہے کہ جو بچے کمسنی میں مر جائیں اور ان کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں ان کی شفاعت کریں گے۔) اس طریقہ ادا نے کس خوبی سے یہ دل میں بٹھا دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہیں بلکہ اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی۔

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون ہے؟ حاضرین چپ رہے (شاید یہ سمجھے ہوں کہ آپ ~ صل۳~ اس جماعت کے اچھے اور برے لوگوں کے نام لیں گے) آپ ~ صل۳~ نے دوسری بار یہ سوال کیا، پھر تیسری بار پوچھا، ایک شخص نے کہا، ہاں یا رسول اللہ فرمائیے، ارشاد ہوا تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس سے اچھائی کی امید کی جائے اور جس کی برائی سے لوگ امن میں ہوں اور تم میں سب سے برا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے اور جس کی برائی سے کوئی امن میں نہ ہو۔(۳)۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کریں۔ ابو ہریرہؓ نے کہا میں اے اللہ کے رسول، ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں، گناہوں سے پرہیز کرو تم سب سے بڑے عبادت گذار ہو جاؤ گے، خدا نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو تو سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے

ساتھ احسان کرو تو مومن ہو گے' لوگوں کے لیئے وہی چاہو جو اپنے لیئے چاہتے ہو' تو مسلمان بن جاؤ گے اور زیادہ ہنسا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مر جاتا ہے۔ (۴)۔(یعنی دل کی صلاحیت جاتی رہتی ہے۔)

ایک دفعہ فرمایا ''کون مجھ سے اپنے جبڑوں اور دونوں پاؤں کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے میں اس کے لیئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں۔ (۵)۔'' کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لیئے اٹھے ہوں گے' ان فقروں کی بلاغت پر غور کرو' دونوں جبڑوں کے بیچ میں زبان ہے جو ہر قسم کی قولی برائیوں کی جڑ ہے اور دونوں پاؤں کے بیچ میں انسان کی شرمگاہیں ہیں' جو ہر قسم کے بے حیایوں اور بدکاریوں کی جگہ ہیں۔ ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصہ کی اصلاح ہو جائے۔

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے' میں اس کیلئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں' آپ ﷺ کے غلام ثوبان نے اٹھ کر کہا میں' اے اللہ کے رسول! فرمایا کسی سے کچھ مانگا نہ کرو' چنانچہ انہوں نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا۔ (۶)۔

---

(۱)۔صحیح مسلم کتاب البر باب من یملك نفسه عن الغضب۔ (۲)۔ ایضاً۔ (۳)۔ ترمذی شریف کتاب الفتن۔ (٤)۔ جامع ترمذی ابواب الزهد۔ (٥)۔ صحیح بخاری باب حفظ اللسان۔ (٦)۔ مسند احمد ج ٥ ص ۲۷٥۔

سب کو معلوم ہے کہ ارض حرم کے اندر اور روہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے۔ حجتہ الوداع میں آنحضرت ﷺ منیٰ میں خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا' لوگو! آج کون سا دن ہے؟ لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں' عرض کہ اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے' فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں۔ سب نے کہا جی ہاں' پھر پوچھا یہ کون سا مہینہ ہے پھر سب چپ رہے' سمجھے کہ اس کا نام کچھ اور بتائیں گے فرمایا کہ کیا یہ ذی

الحجہ نہیں' سب نے کہا جی ہاں' پھر فرمایا یہ کونسا مقام ہے پھر سب خاموش رہے کہ آپ ~ صل۳ ~ کوئی اور نام بتائیں گے' فرمایا کہ یہ بلد الحرام نہیں ہے' سب نے کہا جی ہاں' ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا' مسلمانوں کا خون' مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمہارے لیئے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن' اس مقام میں اور اس مہینہ میں ۔(۱)۔

کبھی خاص خاص صاحبوں کو ان کی مناسبت طبع دیکھ کر خاص خاص طور کی نصیحتیں فرماتے' حضرت ابو ذر غفاریؓ گویا فطرتاً تارک دنیا تھے' بڑے ہی زاہد و عابد تھے' ان کے ذوق طبع کو دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا' اے ابو ذرؓ! جہاں رہو خدا سے ڈرتے رہو' برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اس کو مٹا ڈالو گے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو ۔(۲)۔

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا' تو حضرت ابو ذرؓ سے فرمایا تمہارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے' راستہ سے پتھر' ہڈی یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی انڈیل دینا صدقہ ہے۔

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں تھی اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طریقہ ادا سے ان نیکیوں کی کتنی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھا دی۔

کبھی آپ ﷺ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے' چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ جو عورتیں ایمان لانا چاہیں وہ بیعت میں رسول سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی' بدکاری نہ کریں گی' اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں

گی' بہتان نہ باندھا کریں گی اور کسی بھولے میں رسول کی نافرمانی نہ کریں گی۔ (سورہ ممتحنہ ۔۲)

عبادہؓ بن صامت کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ ''ہم ہر حالت میں رسول کی پیروی کریں گے' اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل و انصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے اور خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ (۵)۔''

یہی عبادہؓ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے اور ان میں چند آدمیوں کو چن کر آپ ﷺ نے نقیب بتایا تو ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم نقیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی ہم خدا کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے' بدکاری نہ کریں گے' چوری نہ کریں گے اور ناحق کسی کی جان

---

(۱)۔صحیح بخاری الخطبتہ فی ایام منی۔ (۲)۔ ترمذی باب ماجاء فی معاشرہ الناس۔ (۳)۔ ترمذی باب ماجاء فی معاشرہ الناس۔ (٤)۔ ترمذی فی صنائع المعروف۔ (۵)۔ مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۳۱۸

نہ لیں گے' لوٹ مار نہیں کریں گے' اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملے گی اور اگر اس میں کمی کی تو اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے۔ (۱)۔ اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا۔

بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک سوال کرتے تھے' سوال سن کو لوگ متوجہ ہو جاتے تھے' مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں خود ہی جواب دے دیتے تھے۔ دریافت فرمایا کہ اختراء کس کو کہتے ہیں پھر خود ہی فرمایا۔ ''وہ چغلی ہے لوگوں کے درمیان بات کو ادھر پہنچانا۔ (۲)۔ ایک بار ارشاد ہوا کہ ''تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو

کہتے ہیں۔ لوگوں نے جواب دیا۔ اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے۔ فرمایا تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اس کو ناپسند ہو'' کسی نے کہا اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعہ موجود ہو تو' فرمایا اگر اس میں ہے تب ہی تو وہ غیبت ہے ورنہ پھر وہ بہتان ہے۔ (۳)۔ ایک موقع پر ارشاد ہوا' میں تمہیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں یارسول اللہ فرمایا ہر کمزور' نرم دل جس کو لوگ حقیر جانیں یا جو متواضع ہو (لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) اگر وہ خدا کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھے تو خدا اس کی قسم پوری کر دے' پھر فرمایا کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں یارسول اللہ! فرمایا ہر درشت مزاج شیخی خور مغرور۔ (۴)۔

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اس کو بار بار دہراتے حاضرین بار بار کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے اور مشتاق ہو کر پوچھتے کہ یارسول اللہ! یہ کیا بات ہے' اس وقت آپ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا۔ ایک دفعہ خود سے فرمایا ''خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا' خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا' خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا'' صحابہؓ نے مشتاقانہ پوچھا' کون یارسول اللہ! فرمایا جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہوا۔ (۵)۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

''دینداری اخلاص کا نام ہے' صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ کس کے ساتھ' فرمایا ''اللہ کے ساتھ' اس کی کتاب کے ساتھ' اس کے رسول کے ساتھ' مسلمانوں کے سرداروں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ۔ (۶)۔''

---

(۱)۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۵' کتاب الدیات۔ (۲)۔ صحیح مسلم باب تحریم النمیمۃ۔ (۳)۔ صحیح مسلم باب تحریم الغیبۃ۔ (۴)۔ صحیح مسلم باب جہنم۔ (۵)۔ مشکوٰۃ باب الشفقۃ علی الخلق بحوالہ صحیحین۔ (۶)۔ مشکوٰۃ باب الشفقۃ علی الخلق بحوالہ صحیح مسلم و صحیح بخاری۔

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصول اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کے ان اخلاقی تعلیمات کا استقصاء کیا جائے جو محمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں، ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصول میں تقسیم کر دیا ہے۔ حقوق، فضائل و رذائل اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان پھر ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے اس کا نام فضائل اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے مثلاً سچ بولنا اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔

تیسری قسم کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجالانا ہے اس کو آداب کہتے ہیں مثلاً اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور وطریق، ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے۔

حقوق وفرائض

حقوق کے معنی ::

حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی، لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کر دی جائے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

خلق لکم ما فی الارض جمیعا (بقرہ:۳)

خدا نے تمہارے (کام کے) لیئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

اس لیئے انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے ایک گونہ لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی وحفاظت میں کوشش کی جائے۔ اس شئے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لئے خدا نے اس کو پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں خدا نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے، اور اس کو ہر اس پہلو سے بچا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے، اسی ذمہ داری کا نام ''حق'' ہے جس کو ازخود ادا کرنا ضروری ہے۔ ارشاد ہوا:

وفی اموالھم حق للسائل والمحروط (ذاریات: ۱)

اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔

والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (معارج: ۱)

اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا مقررہ حق ہے۔ جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔

وات ذا القربی حقه والمسکین وابن السبیلط (بنی اسرائیل:۳)

اور قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

فات ذاالقربی حقه والمسکین وابن السبیل (روم:۲)

تو قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے' یہ ان کا حق ہے اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں' پھر غریب پھر مسافر' ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے۔

واتوا حقه يوم حصاده ولا تسرفوا(انعام:۱۷)

اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن ادا کرو' اور فضول خرچی نہ کرو۔

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی اور پھل پھول نکلے' اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے اور اس میں ان کو بھی کچھ دے' جن کو یہ نعمت نہیں ملی' اور اس نعمت کو بے موقع خرچ نہ کرے اور ضائع نہ کرے کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع ومحل کو نقصان پہنچاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

ان لزوجك عليك حقا ولزورك عليك حقا(بخاری' صوم)

تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے اور تیرے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔

ولا هلك عليك حقا(بخاری صوم)

تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ اس کو کھانا کھلائے کپڑے پہنائے اور اس کے چہرہ پر تھپڑ نہ مارے۔ (ابوداؤد نکاح) ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہیں' بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم نے فرمایا:

فان لنفسك عليك حقا(بخاری صوم)

بیشک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔

فان لجسدك عليك حقا ولعينيك عليك حقا(بخاری صوم)

تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے' اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے' جتنی عام طور سے بھی سمجھی جاتی ہے۔

حقوق کی وسعت ::

جب انسان کا تعلق کائنات ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے' تو ظاہر ہے اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے' جمادات سے بھی ان کو بے موقع نہ صرف کیا جائے نباتات سے بھی ان کو نشوونما اور تربیت کا موقع دیا جائے' حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ان کے آرام آسائش کا خیال کیا جائے اور انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضہ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لیئے بنایا گیا ہے اس سے مناسب طور سے کام لے۔

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیط اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔

انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہیں' لیکن انسان کے علاوہ اس کائنات ارضی کی دوسری جان اور جاندار چیزوں کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ توضیح مقصد کے لیئے مفید ہے۔

انسان کے علاوہ دوسری جاندار بے جان چیزوں کے دو حق انسان پر ہیں ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لیئے وہ پیدا کی گئی ہیں ان سے وہی کام لیا جائے' دوسرا یہ کہ ان کے قدرتی نشوونما' پرورش اور ترقی میں وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے' بلکہ اس کے مناسب اسباب فراہم کرے اور اس کے مناسب غذا' سیرابی اور آرام کی فکر رکھے' یہ دونوں حقوق اصل میں قرآن پاک کی اس حقیقت کے کہ :

خلق لکم مافی الارض جمیعا(بقرہ:۳)

زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا نے تمہارے (یعنی انسانوں کے) لیئے پیدا کیا۔

کے صریح نتیجے ہیں کہ جب انسان کے لیئے یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں تو انسان کا فرض ہے کہ ان سے وہی کام لے جس کے لیئے وہ بنائی گئیں اور اس لیئے تا کہ وقت مقررہ تک انسانوں کو اپنا نفع پہنچا سکیں ان کی پرورش وترقی قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے' فرمایا کہ ایک دفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جا رہا تھا کہ دفعتًا اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا میں تو اس کے لیئے پیدا نہیں کیا گیا ہوں ۔(۱)۔اور اسی لیئے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا اور فرمایا گیا کہ ''جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو جو پرندے جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے ۔ (۲)۔'' اسی سبب سے پھلدار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے (۳)۔'' ایک اور تمثیل حکایت میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لیئے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی اور ایک شخص پر صرف اس لیئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کے لیئے کچھ نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مر گئی' ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا' اس پر اس سے باز پرس ہوئی ۔(۴)۔

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لیئے بھی کیئے گئے ہیں، تا کہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے جن کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

(۱)۔صحیح بخاری باب الحرث والمزارعہ جلد اول صفحہ ۳۱۲
(۲)۔ صحیح بخاری مسلم باب مذکور (۳)۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری شرح باب مذکورہ جلد خاص صفحہ ۷ مصر۔
(٤)۔ یہ دونوں واقعے صحیح بخاری میں ہیں

حقوق کی ترتیب ::

مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے جس کی تفصیل ذیل میں ہے:

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو تو راہ انجیل کی طرح مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا لیکن صرف محبت کرنا ''کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہئے۔ جو اس محبت کا تقاضا ہے اور اس کے مظاہر ہیں، یہی تفصیل و تکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لیئے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لیئے رکھتے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جسم و جان اور مال وملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم و جان اور مال وملکیت کے لیئے اور پسند کرتا ہے، وہی دوسروں کے لیئے چاہنا اور پسند کرنا تو راہ و انجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سرعنوان ہے لیکن اسلام میں یہ سرعنوان تشریح کا محتاج ہے اور اس تشریح کے ضمن میں انسانی تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے، جن کو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی دوری و نزدیکی کی تدریجی اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد ایک اجنبی شخص کے

مقابلہ میں ایک دوست کی غیروں اور بیگانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری ونزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی' مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو' تو اس کے مقابلہ میں اس غیر و بیگانہ کی امداد جو حق پر ہے فرض ہے کہ جو مدد محض قرابت اور عزیز داری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے' اس کا نام اسلام کی اصطلاح میں عصبیت (تعصب) ہے جس سے بچنے کی ہر (۲)۔ مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے' انسان اور حیوان کے درمیان بھی خط فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے۔ مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان اور حیوان کے اور پھر انسانوں میں اہل ملک' قوم قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں بلکہ سر سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی' اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر درجہ رکھتا ہے اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پا سکتا ہے' یہودیت اور عیسائیت میں تمام قرابت داروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے برتر انہ اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے' لیکن دوسرے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا ہے' لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ تعلیمات کی وابستگی دوہری تہری ہوتی ہے مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے اس کی ایک غریب بیمار ماں ہے' ایک غریب اور بیمار باپ ہے ایک غریب اور بیمار بھائی ہے ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے۔ پھر اسی حالت میں اس کا ایک ہم محلّہ بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے' تو اس کو کس کی امداد کرنی چاہئے۔ یہی وہ موقع ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش

آتا ہے۔ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے حقوق پہلے ماں کے ہیں'

(۱)۔صحیحین کتاب الایمان (۲)۔ سنن ابی دائود ج ۲ باب فی المعیت۔

پھر باپ کے ہیں پھر بھائی کے ہیں' پھر پڑوسی کے ہیں' پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی ترتیب سے اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے' یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کیلئے آمادہ ہو جائے یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے' ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید مزاحمت گوارہ کر کے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو' اگر ایسا وہ نہ کر سکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا شریعت محمدی ~ صل۳ ~ نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے۔

وبالوالدین احسانا وبذی القربی والیتمی والمسکین والجارذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وما ملکت ایمانکم (نساء:۲)

اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو' اور رشتہ داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ اور ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور لونڈی غلام کے ساتھ۔

قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتمی والمسکین وابن السبیلط وما تفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم (بقرہ:۲۶)

اے پیغمبر۔ان سے کہہ کہ تم جو خرچ کرو وہ اپنے ماں باپ اور عزیزوں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافر کے لیئے اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو اللہ اس سے آگاہ ہے۔

وات ذالقربی حقہ والمسکین وابن السبیلط ولا تبذر تبذیرا (بنی اسرائیل:۳)

اور رشتہ دار کا حق ادا کر اور مسکین کا اور مسافر کا فضول خرچی نہ کر۔

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے اور اسلام میں بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب ہیں۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ تینوں میں ان کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے، اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے۔

''تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو'' (خروج ۲۰۔۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے:

''تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے۔'' (احبار ۱۹۔۳

انتہا یہ ہے کہ تورات نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ:

''اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے۔'' (احبار ۲۰۔۹)

اور وہ جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا (خروج ۲۱۔۷)

حضرت عیسیٰ نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی تعمیل نہ کی جائے بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے۔ فرمایا:

''کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت

کرے' جان سے مارا جائے پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب ہے سو خدا کی نذر ہوا اور اپنے ماں باپ یا ان کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں' پس تم نے اپنی روایت سے۔ خدا کے حکم کو باطل کیا (متی ۱۰۔۴) (۱)۔

نبوت محمدی ﷺ جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لیئے ہوئی ہے اس نے تورات و انجیل کی طرف نہ صرف والدین کی عزت اور ان سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلے کے ہر گوشہ کی تفصیل کی اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔

۱۔ اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے' عورت کی فطری کمزوری' بیچارگی اور حمل' وضع حمل اور تربیت اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا' ماں کی بڑائی اس کی سب سے پہلے دل دہی کرنے اور اس کی فرمانبرداری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

ووصینا الانسان بوالدیه حملته امه وهنا علی وهن وفصله فی عامین (لقمان: ۲)

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی۔ اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا' اور دو برس تک دودھ پلایا۔

ووصینا الانسان بوالدیه احساناط حملته امه کرها ووضعته کرها۔ وحمله وفصله ثلثون شهراط (احقاف: ۲)

اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ نیکی کرے' اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ جنا' پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر

چھڑانا تیس مہینے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی' ایک شخص نے خدمت اقدس میں آ کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں' پوچھا پھر کون فرمایا تیری ماں' اس نے عرض کی' پھر کون' فرمایا تیری ماں' تین دفعہ آپ ~ صل۳ ~ نے یہی جواب دیا' چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا تیرا باپ۔ (۲)۔ ایک دن آنحضرت ﷺ نے چار بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرفہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔ (۳)۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ! میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے' کیا میرے لیئے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا نہیں! دریافت کیا خالہ ہے؟ گذارش کی ہے' فرمایا'' تو اس پر نیکی کر (۴)۔'' یہی اس کی توبہ بتائی ایک اور صحابی نے دریافت کیا

(۱)۔اس کے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں توراہ کے الفاظ کا بعینہ اعادہ ہے مثلاً متی ۱۹۔۱۹ مرقس ۷۔۱۰' ۱۰۔۱۹' لوط ۱۸۔۲۰ (۲)۔ صحیح بخاری ج ۲ کتاب الادب (۳)۔ ایضاً (٤)۔ جامع ترمذی کتاب البر والصلہ

یا رسول اللہ! میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ ~ صل۳ ~ سے مشورہ چاہتا ہوں' فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ جواب اثبات میں دیا فرمایا کہ تم اسی کے ساتھ چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس (۱)۔ ہے۔

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم میں مخلوقات انسانی میں جنس لطیف کی ہی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں۔ وہ خالق اکبر کی علت فاعلہ ذات کے بعد ماں اور باپ ہیں' لیکن باپ کی مادی علمیت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں' مگر

ماں وہ ہستی ہے جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہہ کر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا' پھر اس کے جننے کی۔۔۔۔ نا قابل برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا پھر اس نو پیدا مضغہ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا اور اس کی پرورش اور غور پرواخت میں اپنی ہر راحت قربان اپنا ہر آرام ترک' اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا محتاج ہے؟ اس لیئے شریعت محمدی ﷺ نے اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے وہ اس کی سزاوار ہے۔

۳۔ ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی' بچہ کی تولید و تکوین میں شریک ہے۔ وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں اس لیئے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچتا ہے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے' چنانچہ اسلام نے صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی ''عزت'' کرنے اور ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا کی' بلکہ ان کی خدمت ان کی اطاعت ان کی امداد اور ان کی دلدہی' ہر چیز فرض قرار دی' بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اف تک نہ کرو' ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو' ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو' انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک' نیکی اور خدمت کی تاکید ۱۲ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے' اور اکثر موقعوں پر تعلیم توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ پہلی تخلیق انسانی کی علت فاعلی اور دوسری علت مادی ہے' سب سے پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے' فرمایا:

واذ اخذنا میثاق بنی اسرآئیل لا تعبدون الا اللہ وبالوالدین احسانا(بقرہ: ۱)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔

یہ آیت پاک گو اس حکم کا اعادہ ہے جو توراۃ کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں بلکہ ''نیکی کرنے'' کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے جس سے تعلیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آ گئی ہے اور ہر قسم کی خدمت اطاعت اور عزت کا مفہوم اس کے اندر پیدا ہے۔

اسی صورت میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے۔

(۱)۔ترغیب و ترتیب منذری جلد ۲ صفحہ ۱۲٤ بحوالی بن ماجہ' نسائی' حاکم۔

قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین الایہ (بقرہ:۲۶)

فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں وغیرہ کے لیئے۔

سورہ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی جاتی ہے۔

واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا۔(نساء:۶)

اور اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔

کفار کو جنہوں نے اپنے وہم وخیال اور رسم ورواج سے حلال وحرام کی ہزاروں رسمی و خیالی باتیں پیدا کر لی تھیں اللہ تعالی خطاب کر کے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں آؤ ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں خدا کے ساتھ شرک

کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا۔

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم الا تشرکوا به شیئا وبالوالدین احسانا۔ (انعام: ۱۵۱)

کہہ (اے پیغمبر) آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔

معراج کے احکام دوازدہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ دی جاتی ہے کہ ان کے سامنے اف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، ان کے حق میں دعائے خیر کرو اور بڑھاپے میں ان کی خدمت کرو فرمایا:

وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاه وبالوالدین احسانا ط اما یبلغن عندک الکبر احدهما او کلهما فلا تقل لهما اف ولا تنهرهما وقل لهما قولا کریما واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما کما ربینی صغیرا (بنی اسرائیل: ۳)

اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف بھی نہ کہو اور نہ ان پر خفا ہو اور ان سے ادب سے بولو اور ان کے لیئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ اور کہو کہ اے میرے پروردگار تو ان پر رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے۔

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی

اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی ان کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہیں! بجز اس کے کہ اگر وہ شرک کی دعوت دیں تو ان کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے۔ ارشاد ہوا۔

ووصینا الانسان بوالدیہ حسنا ط وان جاھدک لتشرک بی مالیس لک بہ علم فلا تطعھما ط الی مرجعکم فانبئکم بما کنتم تعلمون (عنکبوت: ۱)

اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ تو خدا کے ساتھ اس شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں تو ان کا کہا نہ مان تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کروں گا۔

اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر تمہارے بت پرست ماں باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دیں تو صرف ان کی دعوت کو قبول نہ کرو، لیکن ان کی دنیاوی خدمت، اور حسن سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے، بلکہ وہ اس حالت میں بھی اپنی جگہ پر قائم رہے فرمایا:

ووصینا الانسان بوالدیہ حملتہ امہ وھنا علی وھن وفصلہ فی عامین ان اشکرلی ولوالدیک ط الی المصیر وان جاھداک علی ان تشرک بی مالیس لک بہ علم فلا تطعھما وصاحبھما فی الدنیا معروفا (لقمان: ۲)

اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے، میرے ہی پاس پھر آنا ہے اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو ان کا یہ کہنا نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی سے گزران کر۔

اس اہتمام کو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسان مندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے اور اس شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب میں ان کی بات اولاد نہ مانے' مگر دوسری باتوں میں ان کا ادب ان کی اطاعت اور ان کی خدمت کا وہی عالم رہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا مگر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً ان کی دعا سے مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لا کر حسن خاتمہ پر مرے۔

ربنا اغفرلی ولوالدی (ابراہیم:٦)

اے میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دعا کی۔

رب اغفرلی ولوالدی (نوح:٢)

میرے پروردگار اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

اس لیئے والدین کے حسن خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیاء علیہم السلام کی پیروی ہے' آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں ان کی خدمت بجالاتے ہیں اور ان کے لیئے خدا سے دعائے خیر کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں ان کے سارے گناہ معاف کر دیتا' اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت ان کو عطا فرماتا ہے۔

ووصینا الانسان بوالدیہ احساناط حملتہ امہ کرھا ووضعتہ کرھاط وحملہ وفصلہ ثلثون شھراط حتی اذا بلغ اشدہ وبلغ اربعین سنہت

اور ہم نے انسان کو تاکید کر کے کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اس کی ماں نے اس کو تکلیف کر کے پیٹ میں اٹھایا اور تکلیف کر کے جنا اور تیس مہینوں تک اس کو پیٹ

(۱)۔مشکوٰۃ الصابیح بحوالہ احمد و نسائی و بیہقی کتاب الادب فی البر و اصلہ

وبلغ اربعین سنۃ قال رب اوزعنی ان اشکر نعمتك التی انعمت علی وعلی والدی وان اعمل صالحا ترضہ واصلح لی فی ذریتی انی تبت الیك وانی من المسلمین اولئك الذین نتقبل عنہم احسن ما عملوا ونتجاوز عن سیئاتہم فی اصحب الجنۃ وعد الصدق الذی کانوا یوعدون۔(احقاف:۲)

میں رکھنا اور دودھ چھڑانا' یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان ہو'اور چالیس برس کا ہو اس نے کہا کہ میرے پروردگار مجھ کو توفیق دے کہ تیرے اس احسان کا شکریہ کروں جو تو نے مجھ پر میرے ماں باپ پر کیا'اور اس کی کہ میں وہ کام کروں۔ جس کو تو پسند کرے اور میری اولاد نیک کر میں تیری طرف لوٹ کر آیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں ہوں یہی وہ ہیں جن کے پچھلے کام ہم قبول' اور ان کے برے کاموں سے درگذر کرتے ہیں یہ جنت والوں میں ہوں گے یہ سچائی کا وہ عہد ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا۔

ان آیتوں نے والدین اور خصوصًا ماں کی خدمت و اطاعت و رضامندی کو وہ پانی بتایا ہے جس سے گناہوں کی فرد دھل کر صاف ہو جاتی ہے' احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی منشائے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے' کہیں فرمایا ہے کہ "ماں کے پاؤں نیچے جنت ہے" کبھی ارشاد ہوا "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے۔" کسی نے پوچھا یا رسول اللہ! میرے حسن معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے فرمایا تیری ماں' دریافت کیا پھر کون' فرمایا تیری ماں' عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں' گذارش کی پھر کون' چوتھی بار فرمایا' تیرا

باپ اور اس کے بعد جو اس سے قریب ہے' پھر جو اس سے قریب ہے ایک دفعہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجلس قدس میں تشریف فرما تھے' جان نثار حاضر تھے فرمایا وہ خوار ہوا' وہ خوار ہوا' وہ خوار ہوا صحابہ نے پوچھا کون یارسول اللہ! ارشاد ہوا' وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت نہ حاصل کر لی ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے' فرمایا وقت پر نماز پڑھنا' عرض کی پھر کون؟ ارشاد ہوا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا' دریافت کیا پھر کون' فرمایا خدا کی راہ میں محنت اٹھانا (جہاد۔)

ایک دفعہ آپ ﷺ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت مموثر حکایت میں بیان فرمایا ارشاد ہوا کہ تین مسافر راہ میں چل رہے تھے اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا' تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی' قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسی گری کہ اس سے اس غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب ان کی بے کسی و بیچارگی اور اضطراب و بیقراری کا کون اندازکر سکتا ہے' ان کی موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی اس وقت انہوں نے پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دربار الٰہی میں دعا کے لیئے ہاتھ اٹھائے' ہر ایک نے کہا اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہئے' ایک نے کہا بارالہا تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے' میں بکریاں چراتا تھا اور انہی پر ان کی روزی کا سہارا تھا۔ میں شام کو جب بکریاں لیکر گھر آتا تھا تو دودھ دوہ کر اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کو دور نکل گیا' لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے۔ میں دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہوا نہ ان کو جگاتا تھا کہ ان کی راحت میں خلل آ جاتا اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور دودھ مانگیں بچے بھوک سے بلک

توراہ میں حقوق والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بے حد سخت تھے وحی محمدی ﷺ نے بعض حیثیتوں سے ان میں تخفیف کر دی ہے اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے، مثلاً توراہ کا یہ حکم تھا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے۔ اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانون سزا کے بجائے اخروی سزا کا موجب قرار دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں اور مجرم کو اپنے فعل پر نظر ثانی کی تا زندگی مہلت ملتی ہے، لیکن اگر اس نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے، اسلام کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگ دل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتوں میں وہ اس کے قصاص میں قتل نہ ہوگا بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہوگا، کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے فعل کو قتل بالقصد کے بجائے اتفاقی سمجھا جائے تا کہ اس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو۔ (۲)۔

---

(۱)۔ یہ تمام واقعات اور اقوال عام کتب حدیث میں مذکورہ ہیں، خصوصیات کے ساتھ دیکھو صحیح بخاری کتاب الادب صحیح مسلم کتاب البر والصلہ، جامع ترمذی کتاب البر والصلہ، مشکوٰۃ باب مذکور۔ (۲)۔ فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں،

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ تورات نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دے کر دوسری طرف بیوی کے سامنے ان کو بالکل بے قدر کر دیا ہے لکھا ہے:

اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔ (پیدائش ۲۔۲۴)

حضرت عیسیٰ نے بھی جو گو (انجیل کے بیان کے مطابق) ماں باپ اور بیوی تینوں سے نا آشنا تھے تاہم جیسا کہ انجیل کے باوجود نسخہ میں ہے ماں باپ کے مقابلہ میں

بیوی کی طرف داری اور حمایت کی' اور اسی لیئے طلاق کو ناجائز قرار دیا' (مرقس ۔۱۔۷۔۸) مگرسوال یہ ہے کہ اگر بیوی اوروالدین کے درمیان ناقابل حل اختلاف ہو' اوراس لیئے ان دونوں میں سے کسی کو مجبوراً ترجیح دینا پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے ۔اسلام کا حکم ہے کہ اس حال میں بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کا قانون اورعہد نے پیدا کیا جوٹوٹ کرجڑ سکتا ہے' اورمٹ کربدل سکتا ہے' لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابل شکست اورناقابل تغیر ہے' حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھیں جن سے وہ راضی تھے' مگران کے پدربزرگوار حضرت عمرؓ کو بہو پسند نہ تھیں' اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن عمرؓ کومشورہ دیا کہ وہ باپ کی اطاعت کریں۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ) احناف اور شوافع کے نزدیك لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا امام مالك کے نزدیك اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہے ورنہ نہیں اور ظاہر یہ کہ اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے' اصل یہ ہے کہ باپ کے وفور شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلا قصد سمجھا گیا ہے اس لئے اکثر فقہاء نے اس کو قتل خطا سمجھ کر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے الا یہ کہ دلال و قرائن باپ کے قصد کو ظاہر کرتے ہوں۔

اولاد کا حق

اصول تعلیم ::

جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں اسی اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں اور یہ وہ عنوان ہے جس کا سراغ آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا اور اس سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے' مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا' لیکن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو مذہب لے کر تشریف لائے اس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں' وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے' اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتا دیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے ان حقوق کی جس طرح تشریح کی جائے یہ متن ان سب پر محیط ہے فرمایا:

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا (ترمذی)

جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں' یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے' اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں' بڑوں افسروں' ماتحتوں' آقاؤں' نوکروں اور بزرگوں اور عزیزوں کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آرزدگی پیدا نہ ہونے پائے' جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے کہ

ترازو کے ان دونوں پلڑوں میں توازن قائم نہیں رہا ہے' حکیموں اور مقننوں کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدوں کا بے پایان دفتر جو کام نہیں کرسکتا وہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں' اور دیتے ہیں اگر واقعتاً کسی جماعت میں یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانونوں کا بار گراں بھی پھر اس کو برابر نہیں کرسکتا۔

اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے۔ تو وہ بالقصد اس کے نقش زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنیں بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کی نشوونما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہیں یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کا بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے اور ذریعہ حمل کے ضائع کرنے (عزل کو) اچھا نہیں سمجھا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔

اولاد کشی کا انسداد ::

عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی و سنگ دلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے ایک تو مذہبی تھا' یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیئے خود ذبح کرکے ان پر چڑھا دیتے تھے' منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہوگا تو اپنے بچہ (۱) کی قربانی کریں گے یہ قابل نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی۔ رومتہ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کا بالکل اختیار تھا اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج تھا (۲)۔ اور سب سے زیادہ۔ ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی

شادی کی شرم و عار سے بچنے اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں' دیوتاؤں کی خوشی اور نذرانے کے لیئے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے لیئے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے۔ (۳)۔

وکذالك زین لکثیر من المشرکین قتل اولادهم شرکائهم لیردوهم ولیلبسوا علیهم دینهم ولوشاء الله ما فعلوه فذرهم وما یفترون (انعام:۱۳۷)

جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں خدائے برحق کے ساتھ ان کے دیوتاؤں نے اپنا حصہ لگا لیا ہے اس طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے دیوتاؤں نے یہ بات خوبصورت کر کے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں تا کہ یہ دیوتا ان کو (ہمیشہ کے لیئے) ہلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں اور اگر اللہ چاہتا ہے تو وہ ایسا نہ کرتے تو ان مشرکوں کو اور جو کچھ وہ خدا پر وہ اختراء کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو ایسا حکم دیا ہے۔ اس کو چھوڑ دے۔

اسی سلسلہ میں آگے چل کر خدا فرماتا ہے:

قد خسر الذین قتلوا اولادهم سفها بغیر علم۔ (انعام:۱۴۰)

گھاٹے میں ہیں' وہ جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بیجا قتل کیا۔

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عرب فقر و فاقہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی۔ تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہوگا اس لیئے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے' نبوت محمدی ~ صل ۲ ~ نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لیکر آتا ہے' ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا بلکہ وہ خدا ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور وہی ہر جاندار کی روزی کا

میر سامان ہے۔

وما من دآبۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا(ہود: ۱)

اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن یہ کہ اس کی روزی کا فرض خدا ہی پر ہے۔

---

(۱)۔سیرہ ابن ہشام' و طبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ کتب سیر میں عبدالمطلب کا عبداللہ کو قربانی دینے کا واقعہ' نیز موطا امام مالك باب مالا یجوز من النذور فی معصیتہ اللہ۔ (۲)۔ نیکی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول ص ۲۳۰۔ (۳)۔ کشاف زمخشری تفصیل آیت دیں۔

اس لیئے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی۔

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم ان قتلھم کان خطاء کبیرا(اسراء: ۴)

اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالا کرو ہم ہی ہیں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں ان کا مار ڈالنا بے شبہ بڑا گناہ ہے۔

قتل اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنہوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنالی ہیں بتادو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں۔

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم الا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا ولا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاھم(انعام: ۱۹)

کہہ دے اے پیغمبر! میں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے' خدا کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور مفلسی کے ڈر سے

اپنے بچوں کو نہ مار ڈالو ہم تم دونوں کو روزی دیتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا یا رسول اللہ سب سے بڑا گناہ ہے؟ فرمایا شرک پوچھا اس کے بعد فرمایا والدین کی نافرمانی پھر عرض کی اس کے بعد فرمایا کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔(۱)۔ یہ جواب حقیقت میں آیت بالا کی تفسیر ہے انہی تعلیمات اور نبوت کے اس پرتو فیض نے دلوں میں یقین پیدا کر دیا کہ رزاق خدا ہے اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لیکر آتا ہے اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لیئے ختم کر دیا اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لیئے پاک ہوگئی۔

اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابل افسوس تھی وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کر دینا تھا۔ کہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا اہل عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی لڑکیاں ہیں قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمہاری شرم کا باعث ہوا خدا کو لڑکیوں کا باپ کہو تو شرم نہ آئے۔

واذ بشر احدھم بما ضرب للرحمن مثل ظل وجھہ مسودا وھو کظیم(زخرف:۲)

اور جب ان میں کسی کو اس کے ہونے کی خوشخبری دی جائے جس کی وہ رحمت والے خدا پر تہمت باندھتے ہیں تو اندر ہی اندر غصہ کے مارے اس کا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم و عار کے مجسمہ کو پردہ خاک میں چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکریں کرتا قرآن مجید نے اہل عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

واذا بشر احدھم بالانثی ظل وجھہ مسودا وھو کظیمط یتواری من القوم من سوء ما بشر بہ

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے۔تو
اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے

(۱)۔صحیح بخاری کتاب التوحید و تفسیر سورہ بقرہ' و سورہ فرقان' و کتاب الادب و کتاب المابین و صحیح مسلم کتاب الایمان۔

ایمسکه علی هون ام یدسه فی الترابط (نحل:۷)
اس خوشخبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے
کہ آیا ذلت اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی
میں چھپا دے۔(یعنی زندہ دفن کر دے۔)

یوں تو اس رسم بد کا رواج تمام عرب میں تھا۔مگر اخبار عرب کے بعض واقف کہتے ہیں کہ ایک خاص سبب سے بنو تمیم میں اس کا رواج سب سے (۱)۔زیادہ تھا' بنو تمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرار کیا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا (۱)۔ہے' یہ رسم جس شقاوت اور سنگدلی کے ساتھ انجام دی جاتی تھی اس کا حسرتناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے خود اپنی آپ بیتی سنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے چین ہو گئے۔

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت (۳)۔ ہے کہ ایک شخص نے آ کر خدمت اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے' بتوں کو پوجتے تھے اور اولاد کو مار ڈالتے تھے۔

میری ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی' میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے چلی آئی میں آگے بڑھتا چلا گیا' جب ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا اور لڑکی اس کے قریب پہنچی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا' وہ ابا ابا کہہ کر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری پکار تھی' رحمت کونین صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم اس پر دردافسانہ کوسن کر آنسو ضبط نہ کر سکے ایک صحابی نے ان صاحب کو ملامت کی تم نے حضور ۔ صل ۲ ۔ کوغمگین کر دیا۔ فرمایا اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے۔ پھر ان صاحب سے فرمایا ''ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر سناؤ'' انہوں نے دوبارہ پھر بیان کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریش مبارک تر ہوگئی' پھر فرمایا'' جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو۔''

قبیلہ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! میں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں' فرمایا اے قیس ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرو' عرض کی یارسول اللہ میرے پاس اونٹ ہیں فرمایا ''اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ کی قربانی کرو۔(۴)۔''

مردوں کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتیں بھی اس جرم میں مردوں کی شریک تھیں' مائیں خود اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کیلئے حوالہ کرتی تھیں' ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے۔

---

(۱)۔مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران صفحہ ۴۸ و کتاب مجمع الامثال میدانی جلد اول صفحہ ۲۸۷ مطبعہ خیریہ مصر' زیرمثل افصل من موئودہ۔ (۲)۔ ابن جریر ابن کثیر و درمنثور سیوطی بحوالہ سنن بیہقی و مسند بزاز (مصنف عبدالرزق زیر تفسیر سورئہ تکویر) (۳)۔ سنن و رامی صفحہ اول' روایت گو مرفوع اور قوی نہیں' لیکن اس لیئے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آ جائے۔ (۴)۔ تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق و بزاز و درمنثور سیوطی بحوالہ مسند بزار و حاکم فی الکنی و بیہقی فی السنن زیر سورئہ الشمس کورت۔

کم القیت ذھل جمیعا و عامر

زندہ دفن ہونے والے بچہ نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ

تکلیف نہیں اٹھائی جو ذیل اور عامر نے اٹھائی۔

حضرت عبداللہؓ بن عباس کی خدمت میں ایک عورت نے آ کر کہا میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی' فرمایا ''ایسا نہ کرو بلکہ کفارہ دے دو۔''

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لیئے صرف اس قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیوں نے ایسی لڑکیوں کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا اور ان کی پرورش کی۔ چنانچہ مشہور شاعر فرزوق کے دادا صعصعہ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا تھا' اسلام کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا تو عرض کی یا رسول اللہ! میں نے اسلام سے پہلے ۳۶۰ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا ہے کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا۔ فرمایا ہاں تم کو اس کا ثواب ملے گا' کہ خدا نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے۔ (۱)۔ اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل جو بعثت نبوی سے پہلے دین ابراہیم کے پیرو تھے وہ بھی اس قسم کی لڑکیوں کو اپنے آغوش شفقت میں لیتے تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے' جب وہ بڑی ہو جاتی تھیں تو وہ ان کے باپ کو کہتے کہ کہو تو میں تم کو واپس کروں' چاہے ان کو میرے پاس ہی رہنے دو۔ (۲)۔ یہ شخصی کوششیں تھیں جو ملک میں بار آور نہ ہوئیں' لیکن بعثت محمدی ﷺ کی رحمت عالم کی جب بہار آئی تو ان شقاوتوں کے موسم پر ہمیشہ کے لیئے خزاں چھا گئی۔

لوگ عموماً لڑکیوں کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے نبوت محمدی ﷺ نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنا دیا کہ وہ نجات اخروی کا ذریعہ بن گئیں' ''فرمایا جو کوئی ان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کی مصیبت میں مبتلا ہوا اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچا لے گی' وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی۔ (۳)۔'' نیز فرمایا ''جو دو لڑکیوں کی بھی پرورش کرے' یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت میں میرا اور اس کا

اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے۔" (۳)۔

حضرت عبادہؓ بن صامت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربار رسالت میں حاضر تھے' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ گے' چوری نہ کرو گے' بدکاری نہ کرو گے' اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے' جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کا معاوضہ خدا پر ہے اور اگر کسی نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا میں مخفی رہا تو خدا کو اختیار ہے چاہے بخش دے چاہے عذاب (۴)۔ دے عبادہ سے فرمایا کہ خدا نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے۔

ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآن پاک کی ایک مختصر سی آیت نے عرب کی ان تمام قساوتوں ان تمام سنگدلیوں اور ان تمام سفاکیوں کو مٹانے کیلئے وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہیں کر سکتی تھیں' قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے' مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں' غضب الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے' اعمال نامے شہادت میں پیش ہیں کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیاں خون سے رنگین کپڑوں میں آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ شہنشاہ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے' اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم میں ماری گئیں۔

واذا الموءدۃ سئلت بای ذنب قتلت۔ (کورت: ۹)

یاد کرو جب (قیامت میں) زندہ دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا تو کس جرم میں ماری گئی۔

کس درجہ بلیغ اور مؤثر طرز ادا ہے' اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیتے تھے یا یہ زمانہ آیا کہ ادائے عمرہ کے موقع پر

آنحضرت ﷺ مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں' سید الشہدا حمزہؓ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھی چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہیں' حضرت علیؓ ہاتھوں میں اٹھا لیتے اور حضرت فاطمہ زہراؓ کے حوالہ کرتے ہیں کہ یہ لو تمہارے چچا کی بیٹی ہے' حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہئے کہ حمزہؓ میرے مذہبی بھائی تھے' حضرت علیؓ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے آنحضرت ﷺ اس دل خوشکن منظر کو دیکھتے ہیں' پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ کہہ کر اس کی خالہ کی گود میں دے دیتے ہیں کہ خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔(۵)۔

---

(۱)۔ترمذی و نسائی و ابن ماجہ باب مصافحتہ النسائو مسند امام احمد حدیث امیمہ بنت رقیقہ و مسلمی بنت قیس۔ (۲)۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۹ صفحہ ۴۴۳ برحاشیہ فتح البیان بحوالہ ابن ابی حاتم و مستدرك حاکم جلد ۲ صفحہ ۶۲۴ علی شرط۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الایمان و باب وفود الانصار و مسلم کتاب الحدود و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۳۱۴ (مستدرك حاکم جلد ۳ صفحہ ۳۱۸) (۴)۔ صحیح بخاری کتاب الادب و کتاب فی الاستقراض و صحیح مسلم باب النہی عن کثرہ المسائل۔ (۵)۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۰ باب عمرہ القضاء۔

کیا یہ وہی جنس نہ تھی جن کی ہستی شرم و عار کا موجب تھی جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں کے مجمع میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا' یہ حال ہے کہ ایک ایک لڑکی کی پرورش کے لیئے دفعتہً چار چار گود خالی ہو جاتے ہیں' اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے' وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنتی ہے۔

والذین یقولون ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریتنا قرہت اعین (فرقان:۶)

(جنت ان کو بھی ملے گی جو) اور جو کہتے ہیں کہ ہمارے

پروردگار ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

اور آخر وہ زمانہ آیا ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا۔

غدا الناس مذقام النبی الجواریا

پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہے کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔

رضاعت وحضانت ::

اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشوونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے اس کی خبر گیری کی جائے اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے' چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے تنہا باپ پر رکھا ہے' رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے' مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا اور اس شیر خوار کی مدت بھی دو برس کی مقرر کر دی گئی ہے۔

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعتہ ط وعلی المولود لہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف ط (بقرہ:۳)

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں' یہ مدت اس کے لیئے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرے اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا

اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔

اور شیر خوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے قانوناً اس اہمیت کو قبول کیا' اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے۔ فرمایا:

وامہاتکم التی ارضعنکم واخواتکم من الرضاعتہ۔(نساء: ۴)

اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشوونما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہے کہ نسبی رشتہ داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ پر ہے اور باپ نہ ہو تو دادا پر' اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ورثہ پر ہے۔

تعلیم و تربیت ::

ظاہری اور جسمانی نشوونما کے بعد اولاد کی باطنی و روحانی تربیت کا درجہ ہے قرآن پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے' اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے۔ کہ اس کی تفصیل و تشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں' فرمایا:

یایہا الذین امنوا قوا انفسکم واہلیکم نارا۔(تحریم: ۱)

اے ایمان والو تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

اپنے اہل واعیال کو آگ سے بچانا بزرگ خاندان کا فرض ہے' یہ آگ جہنم کی آگ ہے' مگر اس سے مقصود ان تمام برائیوں' خرابیوں اور ہلاکتوں سے ان کی حفاظت ہے' جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں' اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت' دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے۔

خدا نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بارالٰہا تو ان کو ظاہر و باطن کا حسن' صورت و سیرت کی خوبی اور دین و دنیا کی بھلائی دے کر میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا فرمایا:

والذین یقولون ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریتنا قرت اعین۔(فرقان:٦)

اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیک و سعادت مندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہئے' ایک سورہ میں خدا ارشاد فرماتا ہے کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور ان کی خدمت کی توفیق چاہتے ہیں' اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دعا کرتے ہیں۔

واصلح لی فی ذریتی انی تبت الیك انی من المسلمین۔(احقاف:٢)

اور (اے خداوند) میرے لیئے میرے کاموں کو میری اولاد میں صالح بنا میں اپنے گناہوں سے تیری طرف باز آیا اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے باپ میں وحی الٰہی کے مقصود کو تعلیم ربانی پا کر مختلف طریقوں سے واضح فرمایا:

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربار نبوی ﷺ میں آیا' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کر رہے تھے' اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی اس نے کہا کیا آپ ﷺ بچوں کو پیار کرتے ہیں' میرے دس بچے ہیں۔ میں نے ان میں سے کسی کو پیار نہیں کیا' حضور ﷺ نے اس کی طرف نظر اٹھائی' پھر فرمایا ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا (۱)۔ جاتا۔'' دوسری روایت میں ہے کہ آپ ~ صل ۳ ~ نے فرمایا ''اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم و شفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ (۲)۔'' ان دونوں کا منشا یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا چاہئے کہ جو اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔

ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی' اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیاں بھی تھیں' اس وقت کاشانہ نبوی ﷺ میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا' ام المومنینؓ نے وہی ایک کھجور اس کے نذر کر دی۔

ماں کی مامتا نے گوارا نہ کیا وہ کھجور آپ کھالے اور ان ننھی جانوں کو اس سدرمق سے محروم رکھے' اس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا۔ حضرت عائشہؓ کو غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا' حضور ﷺ نے سن کر فرمایا جب کسی کو لڑکیوں کی کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ ان کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لیئے آڑ بن جائیں گی۔'' نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اس کا یہ رتبہ ہوگا کہ وہ اور میں (دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا)

اس طرح ملے ہوں گے۔(۳)۔'' اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہوسکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے' ایک دفعہ یہ فرمایا کہ کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔(۴)۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے سبب سے ترجیح نہ دے ارشاد ہوا کہ جس کے لڑکی ہو' وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے' اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ (۵)۔ باہم لڑکوں میں چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعت محمدی ﷺ میں قائم نہیں' اسی لیئے دنیا کی اکثر شریعتوں اور قانونوں کے خلاف اسلام میں بڑی اور پہلوٹے لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلاوجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا' ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا' اور چاہا کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت ہو' انہوں نے خدمت اقدس میں حاضر ہوکر اپنی خواہش ظاہر کی دریافت کیا کہ کیا تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے' عرض کی نہیں' فرمایا' تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا۔ (۶)۔

اس سے اس قانون کی جو اسرائیلیوں' رومیوں' ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائیداد کا مالک بنے' یا اس کا کوئی ترجیحی حق ہو' اصلاح کر دی گئی' اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا' اور چھوٹوں پر ظلم کا جو مسلسل قانون طریقہ جاری تھا۔ اس کا خاتمہ ہوا۔

---

(۱)۔و (۲)۔ یہ دونوں روایتیں صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمتہ' الوالدین میں' نیز دیکھو ابوداؤد کتاب الادب باب قبلتہ الرجل ولدہ۔ (۳)۔ صحیح مسلم کتاب البر والصلتہ باب فضل الاحسان الی

النبات۔ (٤)۔ ترمذی کتاب البر و الصلہ باب ماجاء فی ادب الولد سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیما۔ (٥)۔ ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل۔ (٦)۔ انجیل قرینتون ٧۔٨

حقوق زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ زن وشوہر کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھوں کی تسکین روحانی کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا' اسی طرح حقوق زوجین کی تشریح پر جوان کے بلکہ ہر گھر کے عیش ومسرت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے ان سب میں عورت کو اور عورت ومرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقی مدارج کے لیئے عائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا' ہندوستان میں بودھ' جین' ویدانت' جوگ اور سادھوپن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے۔ عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بےتعلقی ہی کمال روحانی کا ذریعہ تھا' اسلام نے آ کر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرد میں ہوسکتی ہے۔ اس کے بدرجہا زیادہ تعلق ازدواج میں ممکن ہے کہ اخلاق نام حسن معاملہ اور حسن سلوک کا ہے' جو کسی کا شوہر نہ ہو' جو کسی کی بیوی نہ ہو' جو کسی کا باپ نہ ہو' جو کسی کی ماں نہ ہو' جو کسی کا بھائی نہ ہو' اور نہ کسی کی بہن ہو' نہ کسی سے رشتہ ناطہ رکھے اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لیئے اس کو کون سے فطری موقعے مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت وعصمت کی موت جو اخلاق قالب کی روح ہے اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے۔ مذہبی تجرد کی پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے۔

کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کر لے' فرمایا:

ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنت المئومنت فمن ما ملکت ایمانکم من فتیاتکم المومنتو اللہ اعلم بایمانکمط بعضکم من بعض (نساء: ۴)

جو تم میں سے اس کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح کر سکے تو تمہاری ان مومن باندیوں میں سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہو اور اللہ تعالیٰ ایمان زیادہ جانتا ہے تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے' یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو کسی باایمان باندی ہی سے نکاح کر لو' اب یہاں سے دو شبے پیش آتے ہیں ایک یہ کہ کیا نومسلم باندیاں پرانے مسلمانوں کے برابر ہو سکتی ہیں؟ تو فرمایا کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا خدا ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا اور خدا کے نزدیک قبول ہے۔ دوسرا شبہ یہ تھا کہ یہ نومسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم رتبہ کیسے ہونگی تو فرمایا یہ تفریق بھی غلط ہے۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں۔

یہ اہتمام بیان اس لیئے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسوں میں پڑ کر نکاح سے باز نہ رہیں اس سے اندازہ ہوگا کہ شخصی مسرت کی تکمیل میں کسی رفیقہ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس (ا)-منی

میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں' تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہیں۔

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لئے اپنے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے چنانچہ زن وشوہر کے باہمی اخلاص ومحبت کو خدا نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے فرمایا:۔

ومن ایته ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودبت ورحمته ط ان فی ذالك لایت لقوم یتفکرون۔(روم:۳)

اور اس (خدا کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیئے کتنی نشانیاں ہیں۔

(۱)۔صحیح بخاری و مسلم کتاب النکاح۔

قرآن پاک نے ایک لفظ ''سکون'' سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے' وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے' اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش' دنیا کے حوادث اور مشکلات کے طلاطم میں امن اور سکون اور چین کا گوشہ ہے' اس لیئے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشگواری ہونی چاہئے کہ اس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لیئے خدا نے اس زن شوہر کے تعلق کو اپنے عجیب وغریب آثار قدرت میں شمار کی ہے' پورے ہوں' یعنی باہمی اخلاص اور پیار مہر ومحبت اور سکون اور چین' اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں سے ایک کا قصور ہے۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت برائی کی ہے۔جو زن وشوہر کے باہمی میل جول اور مہر ومحبت میں فرق ڈالیں' فرمایا:

فلیتعلمون منهما ما یفرقون به بین المرء و زوجه ماله

فی الاخرۃ من خلاق (بقرہ: ۱۰۲)

تو وہ (یہود) ان سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں اس کے لیئے آخرت کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر بیوی کی دل جوئی کرے' زن وشوہر باہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہیں لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لیئے زیادہ دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے۔

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض و بما انفقوا من اموالھم ط فالصلحت قنتت حفظت للغیب بما حفظ اللہ ط (نساء: ۶)

مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں اس لیئے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے اور اس لیئے کہ مرد اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں تو نیک بیبیاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں کہ خدا نے ان کی حفاظت کی ہے۔

اس آیت کے آخیر کا حصہ کا مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بیبیاں شوہر کی غیر حاضری میں اپنی اور شوہر کی عزت وآبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے' اللہ تعالی نے ان میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کرکے ان کو محفوظ کر دیا ہے اب اگر کسی سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلاف فطرت ہے۔

مرد وعورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالی نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے' اس لیئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم' ایک دوسرے کی پردہ پوشی ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں' قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو

صرف ایک تشبیہ میں ادا کردیا ہے۔

ھن لباس لکم وانتم لباس لھن (بقرہ:۲۳)

عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں تم ان کے ستر پوش ہو وہ تمہارے لیئے تم ان کی زینت ہو' تمہاری وہ تم ان کی خوبصورتی ہو' وہ تمہاری تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہو' وہ تمہاری یہی نکاح کے اغراض ہیں' اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوق زوجین کو ادا کرنا ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق' اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے فرمایا:

یایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا و نساء ج واتقوا اللہ الذی تساء لون بہ والارحام ط ان اللہ کان علیکم رقیبا' (نساء: ۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار کا لحاظ کرو' جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا' اس خدا کا جس کا واسطہ دیکر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو' اور رحمتوں (رشتوں) کا لحاظ رکھو' اللہ تمہاری دیکھ بھال کررہا ہے۔

آنحضرت ﷺ ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے ان آیتوں میں انسانیت انسان کی بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک پہچان بتادی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے' جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کرسکتا وہ دوسروں سے کیا کرسکتا ہے' کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہئے۔

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے' لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر فرمایا:

ولزوجک علیک حقا (بخاری کتاب النکاح)

اور تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے۔

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدر ومنزلت نہ تھی، وہ ہر وقت معمولی معمولی باتوں قصوروں پر ماری پیٹی جاسکتی تھی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا، پھر وہ کہتے ہیں کہ ''ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار وقطار میں نہیں سمجھتے تھے اسلام آیا تو اس نے ان کے بارہ میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کیئے۔ (۱)۔''

اسلام نے ان کی قدر ومنزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا۔ البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی۔ ارشاد ہوا کہ:

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھم درجہت (بقرہ: ۲۸)

اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے۔

لیکن یہ منزلت بھی ان کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے، یہ اس لیئے ہے تا کہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں، یعنی گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں، یہ نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میاں بیوی کے خانگی جھگڑوں کو دور کرنے کے سلسلہ میں ہے، گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں کے قانونی حقوق یکساں ماننے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے تا کہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے۔

اس اعزازی منصب کیلئے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں قرآن پاک نے اس کی مصلحتیں بھی بتادی ہیں۔ فرمایا:

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم(نساء:٦)

مرد عورتوں کے نگران ہیں' اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے اور اس لیئے کہ انہوں نے اپنا مال خرچ کیا۔

یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالی نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم و طاقت اور عقل و فراست وغیرہ میں جسمانی و ذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے' طبی تحقیقات' انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں' اس لیئے اس کو اس صدارت کا حق فطرتاً ملنا چاہئے' دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دین مہر' نان و نفقہ اور پرورش اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے اس لیئے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے' تا کہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات' کی خوشگواری قائم رہے۔

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے' جو شاید ان کی فطری کمزوری یا عدم تربیت کا نتیجہ ہو' بعض مرد یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتی سے کام لے کر ان کی یہ ٹیڑھ نکال دیں آپ ﷺ نے ان کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر نصیحت فرمائی کہ ''عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو کہ ان کی پیدائش پسلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی ٹیڑھا پن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو' اگر اس کو سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے۔ (١)۔'' آپ ﷺ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع و راضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا فرمایا' ''اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو' کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات نکل آئے گی۔ (١)۔'' یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس

آیت کی تعمیل ہے۔

وعاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسی ان تکرھوا شیئا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا۔(نساء:۳)

اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ سے گزران کرو اگر تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور خدا نے اس میں بہت خوبی رکھی۔

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے' خانگی اور اندرونی خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر' اور بیرونی مشغولیتوں کا بارگراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے' اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون' موالات اور یکجہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے اپنے لیئے خود روزی کمانا اور سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں' بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے اور مرد پر واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان ونفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومت وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے' اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار (۳)۔ حاصل ہے۔ انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

(۱)۔صحیح بخاری و مسلم نکاح۔ (۲)۔ صحیح بخاری مسلم کتاب النکاح باب الوصیتہ بالنساء۔ (۳)۔ اس اختیار کی تشریح میں فقہاء مختلف تفصیلات کیلئے فقہ کی کتابوں میں کتاب النفقہ دیکھنا چاہئے نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی جلد ۶ ص ۲۶۳ مصر۔

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لیئے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اس کی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدر ضرورت لیا کرے فتح مکہ کے دن ابوسفیان کی بیوہ ہندہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی یارسول اللہ ﷺ ابوسفیان بخیل آدمی

ہیں، وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لوں فرمایا تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو۔(۱)۔

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے، فرمایا تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور تم میں سے اس کی نسبت ہر ایک سے باز پرس ہوگی، مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے اس سے اس کی پوچھ ہوگی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی۔ (بخاری اول صفحہ ۷۹ باب) (قوا انفسکم اھلیکم) نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے ::

قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے، وہ آیت یہ ہے:

والتی تخافون نشوزھن فعظوھن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا (نساء:۲)

اور جن بیویوں کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور خواب گاہوں میں ان سے علیحدگی برتو، اور ان کو مارو، تو اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں تو پھر ان پر راہ مت تلاش کرو۔

لغت میں ''نشوز'' کے معنی، اٹھ جانے، کے ہیں اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں، وہ مفسر ابن جریر کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:

ومعنی ذلک اذا رائیتم منھن ما تخافون ان ینشزن علیکم من نظرالی ما لا ینبغی لھن ان ینظرن الیہ ویدخلن ویخرجن واستربتم (۲)۔ بامرھن (تفسیر طبری ۵.۳۸:مصر)

اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو ان کے ''نشوز'' کا ڈر ہو' یعنی ادھر دیکھنا جدھر انہیں دیکھنا نہیں چاہئے' اور وہ آئیں اور نکل جائیں اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے۔

عن محمد بن کعب القرظی اذا رای الرجل تفصیرھا فی حقه فی مدخلھا و مخرجھا قال یقول لھا بلسانه قد رایتك منك کذا و کذا فانتھی (ایضًا)

محمد بن کعب قرضی سے ہے کہ جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر) سے باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی ہے تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی' یہ دیکھی تو اب باز آ جا۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری باب اذا لم ینفق الرجل صفحه ۸۔۸ (۲)۔ اصل متن تفسیر میں واستبریتم غلط چھپا ھے۔

فقہ کی کتابوں میں ہے:

الناشزہت ھی الخارجہت عن منزل زوجھا المانعہت نفسھا منه (عالمگیری' نفقات)

نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد نہ ہونے دے۔

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بد اخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں' کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے' اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے اس کا حکم نہ مانے اس سے بے رخی اور اس سے بغض رکھے۔ (تفسیر بن کثیر)

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہیں' آیت مذکور پوری یہ ہے:

الرجال قوامون علی النساء بما فضل الله بعضھم

علی بعض و بما انفقوا من اموالهم فالصلحت قنتت حفظت للغیب بما حفظ الله و التی تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن فی المضاجع واضربوهن فان اطعنکم فلا تبغوا علیهن سبیلا ط(نساء:٦)

مرد عورتوں کے نگران ہیں (ایک) اس لیئے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے اور (دوسرے) اس لیئے کہ مرد اپنا مال (ان پر) خرچ کرتے ہیں' تو نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں' اور (شوہر کے) پیٹھ پیچھے (شوہر کے گھر بار اور عزت (ا)ـو آبرو) کی حفاظت کرتی ہیں' کہ اللہ نے ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے اور جن کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ' اور ان کو خواب گاہوں میں علیحدہ کر دو' اور ان کو مارو' تو اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں تو پھر ان پر راستہ تلاش نہ کرو۔''

اس آیت پاک میں مرد کی ترجیح کی جو باتیں بیان کی ہیں' ان کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے ان کے گھر بار اور عزت اور آبرو کی حفاظت کرتی ہیں' اس کے بعد ہے کہ اب جس عورت سے تمہیں نشوز کا ڈر ہو تو اس کو پہلے سمجھاؤ' نہ مانے تو خلوت میں اس سے کنارہ کر دیا اس سے بات کرنا چھوڑ دو' اس پر بھی نہ مانے تو اس کو ذرا مارو' اب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لیئے حیلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو۔

اب جب اوپر میں بتا چکا کہ مردوں کو عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے' پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور شوہروں کے پیچھے ان کے گھر بار' مال و دولت اور عزت آبرو کی حفاظت کرتی ہیں اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمہیں عورت کے نشوز کا ڈر ہو تو یہ کرو' اس سے معلوم ہوا کہ

وصیت کو قبول کرو وہ تمہارے قبضہ میں ہیں تم کو اس کے سوا
ان پر کوئی اختیار نہیں، مگر یہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں اور
اگر ایسا کریں تو ان کو خواب گاہوں میں علیحدہ کر دو اور ان کو
اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو، تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں ان پر
کوئی راستہ نہ ڈھونڈو۔''

شوہر کے بستر کو روندوانے کا کہنا یہ اس طرف ہے، کہ ایسے لوگ اس کے گھر میں آنے جانے نہ پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو اور ''کھلی بے حیائی'' سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہیں، لیکن بعض نے اس میں بھی توسیع کی ہے، یعنی عورت کی نافرمائی اور بدزبانی اور مشتبہ چال چلن سب کو فاحشہ، کی تفسیر میں داخل کیا ہے۔ (تفسیر سورۂ نساء رکوع: ۲)

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے اور شرح کی تصریح ہے۔ کہ یہ ضرب غیر مبرح یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے۔ بلکہ یہاں تک تصریح ہے۔ کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے۔ (تفسیر طبری جلد ۵ صفحہ ۴۱ مصر) جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آتی۔ ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔ یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایاس بن عبداللہ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ حکم دیا کہ خدا کی بندیوں (اپنی بیویوں) کو مارا نہ کرو۔ تو حضرت عمر نے آ کر عرض کہ یا رسول اللہ! بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہو گئیں تو آپ نے مارنے کی رخصت عطا کی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اہل بیت نبوی ﷺ کے سامنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے لے کر آئیں، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''آل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہیں جو اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئیں تھیں، یہ (یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں ہیں۔'' (ابوداؤد و ابن ماجہ و

دارمی)

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپ ﷺ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا' آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں (۱)۔اتارتا''یعنی وہ مار پیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اس کے فعل کو ناپسند فرمایا۔

ایک صحابی نے آ کر شکایت کی کہ یارسول اللہ !میری بیوی بدزبان ہے'فرمایا طلاق دے دو'عرض کی اس سے میری اولاد ہے اور مدت سے میرے ساتھ ہے فرمایا تو اس کو سمجھایا کرو' اس میں صلاحیت ہو گی تو قبول کرے گی لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو۔(۲)۔ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔''کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے''یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہم بستر ہو۔(۳)۔''

(بقیہ حاشیہ(۱)۔یہ پیش نظر رہے کہ یہ خانگی سزا مشکوک ومشتبہ حالت میں عورت کی اصلاح کے لیئے ہے ورنہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سنگ ساری یا تازیانہ ہے جس کا اجراء قاضی کا فرض ہے۔

(حاشیہ صفحہ ھذا) (۱)۔صحیح مسلم المطلقہ ثلثا ۱۲ (۲)۔مشکوٰہ کتاب النکاح باب عشرہ النساء بحوالہ ابوداؤد۔(۳)۔مشکوٰہ کتاب النکاح باب عشرہ النساء بحوالہ صحیح بخاری و مسلم۔

اہل قرابت کے حقوق

ماں باپ' اولاد اور زن وشوہر کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہل قرابت کا حق ہے۔ عربوں کے محاورہ میں اس کا نام صلہ رحم ہے۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخلاقی تعلیم میں صلہ رحم اور حقوق قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے یہی سبب ہے کہ وحی محمدی ﷺ میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔

قرآن پاک میں کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے' اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے چنانچہ فرمایا:

فات ذا القربی حقه (روم: ۴)

تو قرابت دار کو حق ادا کرو۔

وات ذا القربی حقه (اسرائیل: ۳)

اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کرو۔

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی ہے کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضروریات اور خواہش کے باوجود صرف خدا کی مرضی کے لیئے خود تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے۔

واتی المال علی حبه ذوی القربی۔(بقرہ: ۲۲)

اور اصل نیکی اس کی ہے۔ جس نے اپنے مال کو اس کی محبت پر قرابت مندوں کو دیا۔

والدین کے بعد اہل قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں فرمایا:

قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین (بقرہ: ۲۶)

فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو۔ تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیئے۔

ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک خدائے تعالیٰ کے ان خاص احکام میں ہے جن کا انسان سے عہد لیا گیا۔

وبالوالدین احسانا وذی القربی۔(بقرہ: ۱۰)

(اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ خدا ہی کو پوجنا) اور ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرنا۔)

سورۂ نحل میں اہل قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا۔

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ی ذی القربی۔(نحل: ۱۳)

مندوں کا حق ادا کرو اور ان سے لطف و محبت سے پیش آؤ' فرمایا:

قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربی۔ (شوریٰ:۳)

کہہ اے پیغمبر! کہ میں تم سے اس پر بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ ناتے میں محبت اور پیار کرو۔

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصل رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں۔ اسی لفظ کی دوسری معروف شکل قطع رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہیں کہ رحم مادری ہی تعلقات قرابت کی جڑ ہے۔ کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوق محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے۔ یہ اشتراک کہیں ہم عمری' کہیں ہم درسی' کہیں ہم سائیگی' کہیں ہم مذاقی' کہیں ہم پیشگی' کہیں ہم وطنی' کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے' اس اشتراک کے عقد محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیئے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے' لیکن ان تمام بندھن کے ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن' رحم مادر ہے۔ یہ ہم رحمی خالق فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے' اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے۔ اس لیئے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ان لوگوں کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں۔ وحی محمدی ﷺ نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور ان کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے۔

وما یضل بہ الا الفاسقین الذین ینقضون عہد اللہ من بعد میثاقہ ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل۔ (بقرہ:۳)

اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے جو حکم نہیں مانتے جو خدا کا عہد باندھ کر توڑتے ہیں' اور خدا نے جس کے جوڑنے کو کہا' اس کو کاٹتے ہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانوں کی اسی طرح فطری

گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے۔اس لیئے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا ''جس نے تجھ کو ملایا۔ اس کو میں نے ملایا۔جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا۔(۱)۔'' اسی مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں ادا فرمایا کہ ''رحم انسانی عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے۔'' جو مجھے ملائے اس کو خدا ملائے' اور جو مجھے کاٹے اس کو خدا کاٹے۔(۲)۔ایک اور موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسن تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا۔ارشاد ہوا کہ جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن (اصل میں حقوہ ہے) تھام لیا' خدا نے فرمایا ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا۔جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا۔کیا تم اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں' جو تجھ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں۔(۳)۔یعنی رحم مادر اور اس رحمان کے رحم (وکرم) کے درمیان حرفوں کا یہ اشتراک' محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کر دیتا ہے' اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہل قرابت کی ہے۔

رحم اور رحمان کے اس جوڑ کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت میں بھی اشارہ ہے سورۂ نساء میں فرمایا:

واتقوا الله الذی تساء لون به والارحام۔(نساء: ۱)

اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس کا' اور رشتوں کا خیال رکھو۔

اس آیت پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھئے:

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آ کر عرض کی یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جو مجھے جنت میں لے جائے۔فرمایا خدا کی بندگی کرو۔کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ۔نماز پوری ادا کرو۔زکوٰۃ دو' اور قرابت کا حق (صلہ

رحم) ادا کرو۔(۴)۔

جبیرؓ بن مطعم صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو صلہ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رکا رہے گا۔ جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہو لے گا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا۔)

ابو ہریرہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے۔ (۶)۔اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور عمر میں زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ صلہ رحم کی دو ہی صورتیں ہیں' ایک یہ کہ ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے دوسری یہ کہ خدا کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے۔ پہلے کا نتیجہ خدا کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صورت میں ملتا ہے۔ اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کی جا سکتی ہے۔ انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اس کے لیئے اضمحلال' تکدر اور دلی پریشانی کا سبب

---

(۱)۔صحیح بخاری کتاب البر والصلہ۔ (۲)۔ صحیح بخاری و مسلم البر و الصلہ۔ (۳)۔ صحیح بخاری و مسلم البر و الصلہ۔ (٤)۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلتہ الرحم۔ (٥)۔ ایضاً باب باب اثم القاطع۔ (٦)۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب من بسط لہ فی الرزق لصلتہ الرحم۔

ہوتے ہیں لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ صلہ رحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں۔ ان کی زندگی میں خانگی مسرت' انشراح اور طمانیت خاطر رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی دولت اور عمر دونوں میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے۔ ترمذی میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے۔ ''صلہ رحم سے قرابت والوں میں

محبت، مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔"

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلہ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلہ رحم کا جواب صلہ رحم سے دے۔ بلکہ یہ ہے کہ قطع رحم کرتا ہے اس کے ساتھ صلہ رحم (ا)۔ کیا جائے۔ یعنی جو قرابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں ان کا حق ادا کیا جائے۔

ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں۔ انسانیت اور اس کے تمدن کی بنیاد ہی باہمی اشتراک عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے۔ اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اس کو بھی کھلائے۔ اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہو اس کی تیمارداری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے، اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو جائے۔ ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علیحدہ اور بجائے خود مستقل ہے اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہو اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو۔ اسی لیئے ہر مذہب نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اور دن سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اس لیئے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے۔ تاکہ برائیوں کا سدباب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ

ہو اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے گھر سے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہمسائیگی کے حقوق کی دفعات بنا لی ہیں۔ عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائیگی کے حقوق نہایت اہم تھے۔ بلکہ وہ عزت و افتخار کا موجب تھے۔ اگر کسی پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوسی کے لیئے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا اور اس لیئے اس کی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا اسلام نے آ کر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور اصلاحوں

(۱)۔صحیح بخاری کتاب الادب باب لیس الواصل بالمکافی۔

کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا وحی محمدی ﷺ نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے۔ مگر وہ ہمسایہ کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے جیسے ایک سفر کے دو رفیق' ایک مدرسہ کے دو طالبعلم' ایک کارخانہ کے دو ملازم ایک استاد کے دو شاگرد' ایک دوکان کے دو شریک کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائیگی ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے ان سب قسموں کے ہمسایوں میں تقدم اس کو حاصل ہے۔ جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت' یا ہم مذہبی کا' یا کوئی اور دوہرا تعلق بھی ہو۔ قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے۔ ارشاد ہے:

والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب۔ (نساء:۶)

اور (خدا نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ (نیکی) کا حکم دیا ہے۔

اس ''قریب اور بیگانہ'' کے معنوں میں اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے' اور کہا ہے کہ ''قریب کے معنی رشتہ دار عزیز اور بیگانہ کے معنی اور اجنبی کے ہیں دوسرے کی رائے

ہے۔

(۱)۔ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الادب الاثم من لا یامن جارہ بوائقہ۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الادب۔ (٤)۔ صحیح بخاری کتاب۔ (٥)۔ ترمذی ابواب البر والصلتہ' باب ماجاء فی حق الجار۔ (٦)۔ صحیح بخاری کتاب الادب۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی' اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے دو پڑوسی ہیں تو ان میں سے کس کے پاس بھیجوں۔ فرمایا جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو۔ (۱)۔ اس ہدیہ اور تحفہ کے لیئے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں' بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لیئے کافی ہیں۔ کچھ نہ ہو سکے۔ تو گوشت کا شوربا ہی ہو اور زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو نصیحت فرمائی کہ ''اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہمسایہ کی خبر گیری کرتے رہو۔ (۲)۔ ان تحفوں کے بھیجنے بھیجانے کا زیادہ موقع عورتوں کو پیش آتا ہے اس لیئے آپ ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا ''اے مسلمانوں کی بیویو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لیئے حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کی کھر ہی کیوں نہ ہو۔ (۳)۔ یہ نصیحت دونوں بیویوں کے لیئے ہے۔ یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے اور دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اس کی حقارت کرے۔

ایک مسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ اقتضاء نہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروا نہ کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''مومن وہ نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے۔ (۴)۔''

برائی برائی ہے جہاں بھی ہو اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہئے تھی۔ تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور برائی کا درجہ عام گناہوں اور برائیوں سے بدرجہا زیادہ ہے۔ بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کر سکتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ پڑوسن کے مکان میں چوری کرنا کتنا برا ہے۔ بدکاری ہر جگہ اس سے ممکن ہے مگر پڑوس کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمد و رفت ہے اور جہاں کے مرد پڑوس کے شریف مردوں پر بھروسہ کر کے باہر جاتے ہیں۔ اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے اس لیئے تو راہ میں یہ حکم تھا:

''تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام' اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ نہ کر۔'' (خروج ۲۰۔۱۷) ''تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر اس سے کچھ چھین لے۔'' (احبار ۱۹۔۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبان حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ میں فرمائی۔ جن میں تورات کی طرف صرف ممانعت پر بس نہیں کی ہی۔ بلکہ اس کو دس گناہ زیادہ برا کر کے دکھایا' ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

''زنا حرام ہے خدا اور رسول نے اس کو حرام کیا ہے' لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی

---

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الجوار فی قرب الابواب۔ (۲)۔ صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب ما جاء فی الجوار۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب لا تحقرن جارہ لجارتہا۔ (٤)۔ مشکوٰۃ از بیہقی الفرد امام بخاری باب لا یشبع دون۔

اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ چوری حرام ہے۔ خدا اور رسول نے اس کو حرام کیا ہے' لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرا لے۔ (۱)۔''

دو صحابیہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں دن کے روزے رکھتیں۔صدقہ وخیرات بھی بہت کرتیں مگر زبان کی تیز تھیں۔زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں۔لوگوں نے ان کا حال آپ ﷺ سے عرض کیا۔تو فرمایا ان میں کوئی نیکی نہیں ان کو دوزخ کی سزا ملے گی۔پھر صحابہؓ نے دوسری بیوی کا حال سنایا۔جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں' اور معمولی صدقہ دے دیتیں' مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں۔فرمایا یہ بیوی جنتی ہوگی۔(۱)۔

حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا (تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو۔'' (مرقس ۱۲۔۳۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تکمیل تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قناعت فرمائی بلکہ جو نہ کرے اس کی سب سے بڑی دولت' یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا' ارشاد ہے:

''تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لیئے وہی پیار نہ رکھے' جو خود اپنی جان کے لیئے پیار رکھتا ہے۔(۲)۔''

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں۔بلکہ خدا اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا' فرمایا:

''جس کو یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسول اس کو پیار کرے۔یا جس کو خدا اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے۔(۳)۔''

اسی لیئے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ پیش ہوں گے۔جو پڑوسی ہوں گے۔(۴)۔انسان کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو۔چنانچہ ایک دن صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا برا۔فرمایا جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو تو سمجھو کہ اچھا کر

رہے ہو اور جب برا کہتے سنو تو سمجھو کہ برا کر رہے ہو۔(۵)۔

کوئی پڑوسی اگر برائی کرے تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو۔مگر اس کی برائی کے بدلہ میں تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو۔یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا۔چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آ کر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے۔فرمایا جاؤ صبر کرو۔اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے پھر یہی نصیحت کی۔وہ پھر آئے اور یہی عرض کی۔فرمایا جا کر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو (یعنی گھر منتقل ہونے کی صورت بناؤ) ان صحابی نے یہی کیا۔آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے۔انہوں نے حقیقت حال بتائی۔سب نے ان کے پڑوسی کو برا بھلا کہا۔یہ دیکھ کر وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ وہ ان کو منا کر پھر گھر میں لایا اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ نہ ستائے (۶)۔گا۔ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گزار بن گیا تھا۔ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا بڑا ٹوکرا لٹکائے جا رہے ہیں۔پوچھا کیا ہے؟ عرض کی امیر المومنین' گوشت کھانے کو جی چاہا تھا۔

---

(۱)۔ادب المفرد امام بخاری باب حق الجار۔(۲)۔ادب المفرد امام بخاری باب لایوذی جارہ۔(۳)۔صحیح مسلم کتاب الایمان۔(٤)۔مشکوٰۃ بیہقی۔(۵)۔احمد بن حنبل' مسند حقبہ بن عامر۔(۶)۔ادب المفرد بخاری باب شکایتہ الجار و ابوداؤد کتاب الادب۔باب حق الجوار۔

تو ایک درم کا گوشت خریدا ہے' فرمایا' اے جابرؓ! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو' کیا یہ آیت یاد رہی۔(۱)۔

یوم یعرض الذین کفروا علی النار اذھبتم طیبتکم فی حیاتکم الدنیا و استمتعتم بھا۔(احقاف)

جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں گے۔ان سے کہا جائے گا۔ تم اپنے مزے اپنی دنیا کی زندگی میں لے چکے اور اس سے

فائدہ اٹھا چکے۔

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو وہ دنیا کی مکروہ لذت قرار پاتی ہے جس کے مواخذہ کا ان کو ڈر لگتا ہے۔

ہمسایوں میں دوست و دشمن اور مسلم و غیرہ مسلم کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی۔ ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا۔ انہوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبرائیلؑ ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنا دیں گے۔ (۲)۔

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن جو باپ کے سایہ محبت سے محروم ہے جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوش محبت میں لے' اس کو پیار کرے' اس کی ہر طرح خدمت کرے اس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے۔ اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے۔ عقل و شعور کے پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائیداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے' یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی۔ مگر جیسا کہ چاہئے ان کے غور و پرواخت کا سامان نہ تھا۔ وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے۔ کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے (۳)۔ تھے' اور نہ سنگدل عربوں میں عام طور سے ان کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا' قرآن پاک میں ان کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار ہے۔

ارایت الذی یکذب بالدین۔ فذلک الذی یدع الیتیم۔ (ماعون)

کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف کو جھٹلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

ایک اور آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وارثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہیں۔

(۱)۔ممموطا امام مالك باب ماجاء فی کل امم۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب الادب حق الجوار۔ (۳)۔ تفسیر ابن جریر طبری، سورئہ نساء ج ٤ صفحہ ۱۷۰۔

کلا بل لا تکرمون الیتیم ولا تحضون علی طعام المسکین، وتاکلون التراث اکلا لما وتحبون المال حبا جما (الفجر: ۱)

نہیں یہ بات نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیا کے مال و دولت پر جی بھر کر رتجھتے ہو۔

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے توراہ میں عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہو وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں۔ (استثنا ء ۱۴، ۲۹، ۲۶، ۱۲) انجیل نے ان بیچاروں کی کوئی دادرسی نہیں کی ہے، اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دین کامل کی شریعت لیکر دنیا میں آیا۔ وحی الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے یاد دلا دیا۔

الم یجدك یتیما فاوی ۔۔۔۔ فاما الیتیم فلا تقھر (الضحی)

کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا، تو اس نے پناہ دی ۔۔۔ تو یتیم کو نہ دبا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں بے بسی کے عالم میں رہے یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بے کس گروہ پر رحم وکرم کی دعوت دیتے رہے۔ چنانچہ مکی آیتوں میں یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں، دولت مندوں کو غریبوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے۔ اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کر سکتے ہو؟ ظلم وستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر، بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے۔

او اطعام فی یوم ذی مسغبہت یتیما ذا مقربہت۔(بلد: ۱)

یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھلانا۔

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا، کہ یہ وہ ہیں جو:

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا و یتیما(دھر: ۱)

اور اس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی غریب اور یتیم کو کھلاتے ہیں۔

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی۔ سورۂ نساء میں اس بے کس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے۔ ان کو وراثت کا حق دلایا گیا، اور متولی جو جاہلیت میں طرح طرح کی بددیانتی کرتے تھے ان سے کہا گیا۔

واتوا الیتمی اموالھم ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب ولا تاکلوا اموالھم الی اموالکمط انہ کان حوبا کبیرا۔(نساء: ۱)

اور یتیموں کو ان کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دے دو، اور ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے بدلا نہ کرو اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر ان کا مال کھا جاؤ۔ یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔

دولت مند یتیم لڑکیوں کو ان کی جائیداد پر قبضہ کر لینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح میں لے آتے تھے اور بے والی وارث پا کر ان کو ستاتے تھے۔ اس پر حکم آیا:

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتمی فانکحوا ماطاب لکم من النساء (نساء: ۱)

اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو (ان کو چھوڑ اور) عورتوں سے جو تمہیں پسند ہو نکاح کر لو۔

یتیم بچوں کے مال کو بد دیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہئے اور نہ جب تک ان کو پورا شعور آئے وہ ان کے سپرد کیا جائے۔ بلکہ ان کے سن رشد کو پہنچنے کے بعد ان کی عقل کو دیکھ بھال کر ان کی یہ امانت ان کو واپس کی جائے فرمایا:

ولا تئوتوا السفہاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیما وارزقوھم فیھا واکسوھم وقولوا لھم قولا معروفا۔ وابتلوا الیتمی حتی اذا بلغوا النکاح فان انستم منھم رشدا فادفعوا الیھم اموالھم۔ (نساء: ۱)

اور بیوقوفوں کو اپنے مال جس کو خدا نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ نہ پکڑا دو اور ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو اور ان سے معقول بات کہو اور یتیموں کو جانچتے رہو جب وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں تو ان میں اگر ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔

ان آیات پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے۔ غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو ناسمجھ یتیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے۔ وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے۔ کہ تم اپنا مال ان کو نہ دو اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سن رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کا مال واپس کر دینے کا حکم ہے۔ وہاں اس مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی کہ تم ان کا مال ان کو واپس کر دو

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہئے۔ جیسی اپنے مال کی' اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چن کر واپس کیا جائے' جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے۔ جس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے' متولیوں کو جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلد خرچ کر کے برابر کر دیتے ہیں کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا نہ کر بیٹھیں' اس بد دیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی۔

ولا تاکلوھا اسرافا وبدارا ان یکبروا۔(نساء: ۱)

اور اڑ کر اور جلدی کر کے ان کا مال نہ کھا جاؤ یہ بڑے نہ ہو جائیں۔

صاحب جائیداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں' تو ان کے لیئے ان یتیموں کی جائیداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلاف اخلاق قرار دیا گیا اور اگر تنگدست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی۔

ومن کان غنیا فلیستعفف ومن کان فقیرا فلیاکل بالمعروف(نساء: ۱)

اور جو (متولی) بے نیاز ہے۔ اس کو چاہئے کو بچتا رہے اور جو محتاج ہے تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی۔

وان تقوموا للیتمی بالقسط۔(نساء: ۱۹)

اور یہ کہ یتیموں کے لیئے انصاف پر قائم رہو۔

سورۂ انعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی' اور جانوروں کی حلت وحرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی روحانی واخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی ان میں ایک یہ ہے کہ:

ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن حتی یبلغ اشدہ(انعام: ۱۹)

زاور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچے۔

سورۂ اسراء کے آٹھ اخلاقی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحب جائیداد کو یتیموں کی جائیداد کے پاس کسی اور غرض سے نہ پھٹکنا چاہئے' اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہئے۔(سورۂ اسراء۔۴)

یہ تو صاحب جائیداد یتیموں کی نسبت تعلیم ہے۔ جو یتیم غریب و مفلس ہوں۔ ان کی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے بقرہ' نساء' انفال اور حشر میں بار بار ان کی پرورش اور ان کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی والیتمی والمساکین خیرات وصدقات کے بہترین مصرف قرار دیئے گئے۔

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بےوالی ووارث امت کے سرپرست ﷺ نے اپنی امت کے ان نیک دلوں کو جو بےوالی ووارث یتیموں کے کفیل ہوں۔ خود اپنے برابر جگہ دی' فرمایا ''میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والے ان جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب (۱)۔ ہوں گے۔'' یہ بھی فرمایا کہ ''جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے اور اس کو کھلائے پلائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا۔ بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشائش کے لائق نہ ہو۔(۲)۔ نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ ''مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جا رہی ہے' اور سب سے بدتر گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔(۳)۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی۔ وہی دل جو بیکس و ناتواں یتیموں کیلئے پتھر سے زیادہ سخت تھے۔ وہ موم سے زیادہ نرم

ہو گئے ۔ ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کیلئے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے' اور ہر ایک اس کی پرورش اور کفالت کیلئے اپنے آغوش محبت کو پیش کرنے لگا۔ (۴)۔ بدر کے یتیموں کے مقابلہ میں جگر گوشہ رسول فاطمہ بتول اپنے دعویٰ کو اٹھا لیتی ہے۔ (۵)۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ اپنے خاندان (۶)۔ اور انصار (۷)۔ وغیرہ کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لیجا کر دل و جان سے پالتی ہیں ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لیئے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔ (۸)۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری باب فضل من یعول یتیما و صحیح مسلم باب فضل الاحسان الی الیتیم۔ (۲)۔ ترغیب و تربیت منذری جلد ۲ صفحہ ۱۳۲ و صفحہ ۱۳۳ بحوالہ ترمذی (حدیث حسن صحیح۔) (۳)۔ ترغیب و تربیت منذری جلد ۲ صفحہ ۱۳۲ و صفحہ ۱۳۳ بحوالہ ماجہ و ادب المفرد باب من یعول یتیما۔ (٤)۔ صحیح بخاری باب عمر القضاء۔ (٥)۔ ابوداؤد باب مواضع قسم الخمس۔ (٦)۔ مموطا امام مالك كتاب زكوة اموال اليتمى و زكوة الحلى و كتاب الطلاق۔ (٧)۔ مسند احمد جلد ٦ صفحہ ٢٦٩ (٨)۔ تذکرہ الحفاظ ذهبى ذكر مسروق بن اجدع تابع او مسند جلد ٦ صفحہ ٣٢۔

صحابہؓ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو ان کا حصہ دینے اور ان کے مال و دولت کی تولیت اور نگرانی میں دیانتداری برتنے لگے ان کی جائیدادوں کی حفاظت میں فیاضی اور سیر چشمی کا پورا ثبوت دیا۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعویٰ پیش کیا مگر وہ دعویٰ ثابت نہ ہو سکا' اور آپ ﷺ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا۔ وہ یتیم اس پر رو پڑا' آپ کو رحم آیا اور اس مدعا علیہ سے فرمایا کہ تم نخلستان اس کو دے دو۔ خدا تم کو اس کے بدلہ جنت دے گا۔ وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا' ابوالدحداحؓ صحابی حاضر تھے انہوں نے اس شخص سے کہا کیا تم یہ نخلستان میرے فلاں باغ سے بدلتے ہو۔ اس نے آمادگی ظاہر کی انہوں نے فوراً بدل دیا اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا۔

(۱)۔

آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں۔ مگر اگر یہ سوال کیا جائے' کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی عرب پہلی سرزمین ہے جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی' اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور عرب' مصر' شام' عراق' ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں۔ ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیئے بھی امن و راحت کے گھر بنائے۔ ان کے وظیفے مقرر کیئے۔ مکتب قائم کیئے۔ جائیدادیں وقف (۲)۔ اور دنیا میں ایک نئے انسٹیٹیوشین کی طرح ڈالی اور قانوناً اپنے قاضیوں کو یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی وسرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں۔ ان کی جائیدادوں کی نگرانی' ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا انتظام کریں' (۳)۔ اور یہ وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے' اور لندن کے لارڈ میر یا آفس کورٹ کے حکام مسلمانوں قاضیوں کے ان فرائض (۴)۔ کی نقل کرتے ہیں۔

بیوہ کے ساتھ حسن سلوک

یتیموں کے بعد اصناف انسانی میں سب سے ناچار اور ناتواں گروہ جنس لطیف کے ان افراد کا ہے۔ جن کو قدرت نے شوہروں کے سایہ سے محروم کر دیا۔ اب وہ بے یارومددگار' اور بے مونس ومنخوار ہیں۔ نہ ان کے کھانے پینے کا کہیں سہارا ہے اور نہ ان کے تن ڈھانکنے اور ستر پوشی کی کسی کو فکر ہے۔ عورت کو خدا نے دنیا کی عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا اور اس کی ذمہ داری اس کے شوہر کے حوالے کر دی تھی۔ اب وہ ناچار ان سے دوچار ہے۔ اب غم والم اور فکر وتردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ

درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر' نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے' بلکہ اس کے روحانی اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلاتے رہتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ دنیا کے روزمرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعیں کافی سے زیادہ ثبوت ہیں۔

(۱)۔ادب المفرد امام بخاری باب فضل من یعول یتیما۔ (۲)۔ استیعاب ابن عبدالبر تذکرہ ابوالدحداحؓ۔ (۳)۔ تاریخ اسلام میں یہ واقعات مذکور ہیں۔ (٤)۔ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا السلطان ولی لاولی لہ (کتاب النکاح) فقہ کی کتابوں میں قاضیوں کے یہ فرائض لکھے ہیں۔ قاضیوں کو جو شاہی فرامین تقرر کے وقت ملتے تھے ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ ان کی تصریح ہوتی تھی۔

یہودی مذہب میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بھائی کی ملک ہو جاتی تھی وہ جس طرح چاہتا تھا اس سے معاملہ کر سکتا تھا۔ عورت کی مرضی کو اس زن وشوئی کے مجبورانہ تعلق میں کوئی دخل نہ تھا۔ عیسوی مذہب میں یہ جبری قانون تو جاتا رہا مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو پیش نہ کر سکا۔ ہندوؤں میں اب اس کی زندگی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اب اس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مر جانا چاہئے' اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام آرائشوں اور لذتوں سے علیحدہ ہو کر ساری عمر سوگ میں گزار دے۔ عربوں میں رواج یہ تھا کہ وہ شوہروں کے وارثوں کی ملکیت بن جاتی تھی اور وہ جو چاہتے اس کے ساتھ کر سکتے تھے۔ اس کو تکلیفیں دے دے کر اس سے دین مہر معاف کراتے تھے اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہیں شادی نہیں کرنے دیتے تھے۔

اسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی فرمانبرداری ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کر دیا اور اسے اتنی مدت تک کے لیئے رکھا جس میں تھوڑا بہت اس کا طبعی غم فراموش ہو سکے اور یہ بھی پتہ لگ سکے کہ اس کو اپنے شوہر سے کوئی حمل تو نہیں اس کے لیئے سوگ کا ایک زمانہ متعین کیا جس کی حد چار

ام سلمہؓ جویریہؓ ام حبیبہؓ میمونہؓ اور صفیہؓ بیوہ تھیں۔ جن کی کفالت کا بار آپ ﷺ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا اور اس طرح اپنے پیروؤں کے لیئے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا۔ یہ تو آپ ﷺ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ ﷺ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس فرقہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا بیا سانی کر سکتا ہے فرمایا:

الساعی علی الا رملہت والمسکین کالساعی فی سبیل اللہ و احسبہ قال کالقائم لایفترو کالصائم لا یفطر (۱)۔

بیوہ اور مسکین کے لیئے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسا خدا کی راہ میں دوڑنے والا اور راوی کہتا ہے کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اور جیسا وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا اور وہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

الساعی علی الارملہت والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ و کالذی یصوم النھار و یقوم اللیل۔ (کتاب الادب)

بیوہ اور غریب کے لیئے دوڑ دھوپ کرنے والا، خدا کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے، اور اس کے برابر ہے۔ جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں اور اس لیئے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں، لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں۔ جب تک وہ بڑے ہو کر ان سے علیحدہ نہ ہو جائیں اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں۔ یہ فرمایا

''میں' اور محنت و مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانے والی بیوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے وہ حسن و جمال اور جاہ وعزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے' لیکن اپنے ننھے یتیم بچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائیں یا مر جائیں (۲)۔ اسی مقصد کو ابو یعلی کی مسند میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح ایک واقعہ کی صورت میں بھی بیان فرمایا کہ ''قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے۔ میں پوچھوں گا تو کون ہے۔ تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ ہوں جس کے چند ننھے۔ یتیم بچے تھے۔ (۳)۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم و مئوطا امام مالك بحواله مشكوٰه باب الشفقه و الرحمته على الخلق۔ (۲)۔ سنن ابوداؤد كتاب الادب باب فضل من عال يتيما۔ (۳)۔ حاشيه سنن ابی داؤد بتحشيته ابی الحسنات محمد بن عبدالله ابن نور الدين بنجابی مطبوعه ۱ صح المطابع لكهنؤ۔

حاجت مندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحب دولت اور بے نیاز ہو۔ کسی نہ کسی وقت اسی پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے۔ اس لیئے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی حاجت مند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ قرآن پاک میں دو موقعوں پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے:

فی اموالھم حق للسائل والمحروم (ذاریات)

جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کیلئے حق ہے۔

فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (معارج: ۱)

جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیئے مقرر حق ہے۔

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں، لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف ''بھیک مانگنے'' کے لینا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس سے ہر وہ ضرورت مند مراد ہو سکتا ہے۔ جو تم سے کسی مالی مدد کا خواستگار ہو۔ محروم کی تشریح میں اہل تفسیر کا اختلاف ہے۔ بعض اس کو محروم کہتے ہیں۔ جس کا مال غنیمت میں کوئی حصہ نہیں۔ کسی نے اس کے ظاہر معنی لیئے ہیں کہ جو دولت سے محروم ہو۔ کوئی منفعت کے لیتا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو اور اب وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو۔ اسی معنی کی تائید اہل لغت اور بعض اہل تفسیر کے بیان اور قرآن پاک (۱)۔ سے ہوتی ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے۔ یا عام صدقہ' مفسرین دونوں آیتوں میں دونوں طرف گئے ہیں مگر صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات میں جس میں ''حق کا بیان ہے' مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے' اور معارج میں جس میں مطلق ''حق'' کا نہیں' بلکہ ''مقررہ حق'' کا بیان ہے ''زکوٰۃ'' مراد ہو' کیونکہ ''مقررہ حق'' کا مفہوم عام صدقہ پر نہیں ہے' بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجت مندوں کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو۔ دونوں طرح سے مدد مسلمانوں کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔ قرآن پاک میں دوسرے موقع پر ہے:

واما السائل فلا ینھر (ضحی: ۱)

اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر۔

یہاں سوال کرنے والے کے معنی اعنی کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں۔ مگر لفظ کا عموم' وسعت کو چاہتا ہے۔ یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواستگار ہو' خواہ وہ جسمانی ہو' مالی

---

(۱) دیکھو لسان العرب لفظ محروم المحارف اور تفسیر ابن جریر میں سورئہ ذاریات و معارج کی آیت مذکور اور سورہ قلم میں اصحاب الجنہ کے فتنہ میں محرومون اور سورہ واقعہ میں محرومون کے معنی۔

ہو۔ علمی ہو۔ (۱)۔ یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو۔ بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو' اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو۔ مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منھا و من یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منھا و کان اللہ علی کل شئی

مقیتا۔(نساء: ۱۱)

جو نیک بات کی سفارش کرے گا۔تو اس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہے' اور جو بری بات کی سفارش کرے گا تو اس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائے گا اور اللہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔

اگر چہ یہ آیت عبارت کے نظم و نسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے' یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقتور قبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کی جائے تو اس نیک کام میں اس کی سفارش کی جائے اور وہ قبول کی جائے' تاہم الفاظ قرآنی کی وسعت ہر نیک کام کی سفارش کی جائے تک وسیع ہے' اور اس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جدوجہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں شریک ہوگا۔ایسی ہی برے کام کی جدوجہد میں حصہ لینا اس کے گناہ میں شریک ہونا ہے ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان' واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب۔(مائدہ: ۱)

اور نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو' اور گناہ اور زیادہ کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو' اور ڈرو اللہ سے بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

غرض یہ کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری ضرورت مندوں کی ضرورت پورا کرنا اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اسکو دینا۔ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے۔جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے الفاظ میں فرمائی ہے:

من کان فی حاجت اخیہ کان اللہ حاجتہ و من

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے۔ بیماروں اور مریضوں کا ہے۔ یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبر گیری اور خدمت آپ نہیں کر سکتے۔ ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال' خدمت' تیمارداری' اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے اور اس فرض کا نام عربی میں عیادت ہے۔ (۵)۔ ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ سکھائی ہے کہ وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں یا جن کے ادا کرنے سے ان کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے ان کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے اور قرآن نے اس کیلئے ایک کلی اصول بنا دیا ہے:

ولا علی المریض حرج (نور:۸)

اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔

---

(۱)۔صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المومنین و باب قول اللہ من یشفع شفاعته حسنته۔ (۲)۔ ایضًا کل معروف صدقه۔ (۳)۔ ترمذی کتاب البروالصلته۔ (٤)۔ ترمذی کتاب البروالصلته۔ (۵)۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادہ المریض کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہیں یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت میں دیکھنے کو جانا لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے' بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہیں' اور اس کی تیمارداری غم خواری اور خدمت گزاری کے بھی۔ بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادت کی معمولی قسم ہے اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غم خواری کرے اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی پوری تیمارداری اور خدمت گزاری کرے۔ عرب کا ایک قدیم شاعر حو حجاج کے زمانہ میں تھا کہتا ہے:

ذهب الرقاد فما یحسس رقاد

مما شجاك وفاست العواد

تجھے جو غم پہنچا اس سے نیند چلی گئی تو نیند معلوم نہیں ہوتی اور

عبادت کرنے والے سو گئے۔ قاعدہ یہ ہے کہ کسی تیماردار اور خدمت گذار اس کی آخری حالت میں شب و روز اسکی خدمت میں جاگتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی کئی کئی راتیں کٹ جاتی ہیں' لیکن جب بیمار سے مایوسی ہوجاتی ہے اور وہ موت کے قریب قریب ہو جاتا ہے۔ یا مر جاتا ہے تو پھر ان پر نیند طاری ہوجاتی ہے' اور وہ سو جاتے ہیں۔ اب اگر ''عیادت'' کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کو سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ''عیادت'' کی وسعت میں خدمت گذاری اور تیمارداری سے لیکر بیمار پرسی تک سارے مدارج داخل ہیں' اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کے دیکھنے کو جانے ہی کے ہوں تب یہ سمجھنا چاہئے کہ جب صرف اس کے دیکھنے جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمارداری کا ثواب کتنا ہوگا۔

لیس علی الاعمی حرج ولا علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج (فتح: ۲)

نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد میں شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر۔

لیس علی الضعفاء ولا علی المرضی

نہ کمزوروں پر نہ بیماروں پر (جہاد کے عدم شرکت کی باز پرس ہے۔)

بیماروں کے لیئے وضو معاف ہے وان کنتم مرضی (یا تم ہو تو تیمم کرو) اسی طرح ان سے تہجد کی لمبی نمازیں معاف ہیں علم ان سیکون منکم مرضی (سرمل: ۲) (خدا کو معلوم تھا کہ تم میں کچھ بیمار بھی ہوں گے) اسی طرح حج کے احکام میں بھی بیمار کے لیئے

(۷)۔آنحضرت ﷺ اور آپ کی تعلیم سے صحابہ کرام کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے۔ بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان کی تفریق نہ تھی آپ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی (۸)۔ ہے۔ منافقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں (۹)۔اور اسی سے علماء نے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے۔(۱۰)۔

---

(۱)۔صحیح مسلم باب ثواب المومن فیما یصیبہ و سنن ابوداؤد' اوائل کتاب الجنائز۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب الادب فی المعونتہ للمسلم۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الجنائز۔ (٤)۔ ایضاً۔ (٥)۔ سنن ابی داؤد کتاب الجنائز۔ (٦)۔ صحیح مسلم باب عیادہ المریض' بطریق مختلفتہ۔ (۷)۔ سنن ابی داؤد کتاب الجنائز۔ (۸)۔ صحیح بخاری کتاب الجنائز۔ (۹)۔ ایضاً۔ (۱۰)۔ مجمع الجار علامہ طاہر فتنی لفظ عیادت۔

حضرت سعد بن معاذؓ جب زخمی ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کا خیمہ مسجد میں نصب فرمایا تا کہ بار بار ان کی عیادت کی جا سکے۔ (۱)۔رفیدہؓ ایک صحابیہ تھیں جو ثواب کے خاطر زخمیوں کا علاج اور ان کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ان کا خیمہ بھی اس مسجد میں رہتا تھا تا کہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کریں۔ (۲)۔غزوات اور لڑائیوں میں بھی بعض ایسی بیبیاں فوج کے ساتھ رہتی تھیں۔جو بیماروں کی خدمت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔(۳)۔آپ ﷺ نے اپنے پیروں کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ ''بھوکے کو کھلاؤ''قیدی کو چھڑاؤ اور بیمار کی عیادت کرو۔ (۴)۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و دلکش طرز ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ ''اے آدم کا بیٹا! میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی۔''وہ کہے گا اے میرے پروردگار تو تو سارے جہاں کا پروردگار ہے میں تیری عیادت کیونکر کرتا فرمائے گا'' کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار ہوا مگر تو نے اس کی عیادت

نہ کی اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔(۵)۔تعلیم کی یہ طرز ادا بیمار پرسی، بیماروں کی تیمارداری اور غم خواری کی کیسی دلنشین تلقین ہے اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا کے سرہانے کھڑا، اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو ان بیماریوں کی خدمت کر کے خدا کا قرب پاتے ہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبيل وما ملكت ايمانكمطوالله لا يحب من كان مختالا فخورا۔(نساء:٦)

اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور عزیز پڑوسی اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ اور پہلو کے رفیق کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور اس کے ساتھ جس کے تمہارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں اور اللہ غرور اور فخاری کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے' لیکن اسلام نے اس کی بھی ممانعت کردی' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عبد نہ کہے' بلکہ فتای میرا جوان کہے اور اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ وہ اپنے آقاؤں کو رب نہ کہیں بلکہ مولی کہیں۔(۲)۔اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کردیا اور

(۱)۔صحیح مسلم کتاب الایمان۔ (۲)۔ صحیح بخاری جلد دوم کتاب الأدب باب الهجرة۔ (۳)۔ یہ دونوں تعداد میں امیر اسماعیل نے شرح بلوغ المرام کتاب العتق میں نقل کی ہیں۔ (٤)۔ صحیح بخاری کتاب العتق۔

فرمایا کہ یہ جن کو تم غلام کہتے ہو یہ بھی تمہارے بھائی ہیں۔جن کو خدا نے تمہارے تحت میں کردیا ہے۔پس جس کو خدا نے تمہارے تحت کردیا ہے۔تو اس کو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو' اور اس کو اتنا کام دے دو' جو اس پر بھاری نہ ہو جائے اور بھاری کام بھی دے تو اس کے کام میں خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے۔(۱)۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس حکم پر صحابہؓ نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہوگئی تھی۔(۲)۔اس بے خانمان افراد کو

ان کے آقاؤں کے گھروں کا غلام بنا کر نہیں ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا رکھا ہے کہ جس غلام کو آزاد کرے گا وہ اسی کے علاقہ مندوں (موالی) میں شمار (۳)۔ ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں۔ ان کو ان کے قدیم آقاؤں کے خاندانوں میں شمار کرو۔ جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو' اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنالیں۔ (۴)۔ ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں بلکہ اسلام کا سردار اور مملکتوں کا بادشاہ بنا دیا' اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے جس کی تفصیل آئندہ جلد میں اپنے مناسب موقع پر آئے گی۔

مہمان کے حقوق

موجودہ نظام تمدن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریسٹرانون نے اپنے سر لے لی ہے۔ مگر گذشتہ نظام تمدن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے خمیر میں داخل ہے' اور مغربی تمدن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے۔ اس لئے کہنا چاہئے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلہ اخلاق کی ہے۔ آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے تو کل وہ ہمارے ساتھ کرے گا۔ گذشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں لیکن اہل عرب میں مہمان کا حق بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا۔ مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھایا۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا ذکر سورۂ ذرایات کی ان آیتوں میں آیا ہے۔

---

(۱)۔صحیح بخاری جلد دوم کتاب الأداب مایہی عن السباب۔

(۲)۔ صحیح بخاری جلد دوم کتاب الأداب مایہی عن السباب۔

(۳)۔ حدیث میں ہے انما الولاء لمن اعتق دلار کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے۔ دوسری حدیث میں او تنمی الی غیرموالیہ فعلیہ لعنہت اللہ الخ جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے تو اس پر خدا کی لعنت' امام نووی شرح میں لکھتے ہیں بل لحمتہ کلمتہ النسب یعنی آزام غلام اور آقا کے درمیان دلاء تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے۔ صحیح مسلم کتاب العتق۔ (٤)۔ کتاب الاموال ابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ٢٢٤ھ مطبوعہ مصر ٢٣٥۔

هل اتك حديث ضيف ابراهيم المكرمين اذدخلوا عليه فقالوا سلما' قال سلم قوم منكرون فراغ الى اهله فجاء بعجل سمين' فقربه اليهم قال الا تاكلون

فاوجس منھم خیفۃ ط قالوا لاتخف و بشروہ بغلم علیم۔(ذاریات:۲)

(اے پیغمبر) ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے کہ جب (یہ لوگ) ان کے پاس آئے تو (آتے ہیں) سلام علیک کی ابراہیم نے سلام کا جواب دیا (اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ) اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہیں۔پھر جلدی سے اپنے گھر جا(ایک) موٹا تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کے لئے) لائے اور ان کے سامنے رکھا'تو انہوں نے تامل کیا(ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں (اس پر بھی انہوں نے کھانے سے انکار کیا تب) تو ابراہیم ان سے جی ہی جی میں ڈرے انہوں نے (ان کی حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا اندیشہ نہ کریں اور ان کو ایک ہوشیار فرزند کی خوشخبری بھی دی۔)

اس حکایت سے آداب مہمانداری کے متعلق حسب ذیل نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔ (۱) مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتدا باہمی سلام سے ہونا چاہئے۔(۲) مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہئے کیونکہ ''روغان'' کے معنی سرعت کے ہیں۔(۳) روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا وزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں۔اس لئے مہمانوں کے کھانے کا سامان مخفی طور پر ان کی نگاہ سے بچا کر کرنا چاہئے۔کیونکہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے لئے کچھ سامان کیا جا رہا ہے۔تو وہ ازراہ تکلف اس کو روکیں گے۔اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اہل وعیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو۔بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے۔(۴) کسی بہانے تھوڑی دیر کے لئے مہمانوں سے الگ ہو جانا چاہئے تاکہ ان کو آرام کرنے یا دوسرے ضروریات سے

فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو۔اسی لیئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لئے ان سے الگ ہوگئے۔(۵)مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہئے ان کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہئے۔اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھائیں۔(۷)مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہئے کیونکہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ کھائے تا کہ وہ کھانا ان کے اور ان کے اہل وعیال کے کام آئے۔اسی لئے جب ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا' اور ان کے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں۔(۸)نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کی عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہئے اسی لئے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوف زدہ نہ ہونا چاہئے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے کیونکہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے۔اسی لئے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوط علیہ السلام نے:

قال ان ھٰؤلاء ضیفی فلا تفضحون واتقوا اللہ ولا تخزون (حجر:۵)

کہا یہ میرے مہمان ہیں۔تو (ان کے بارے میں) مجھ کو فضیحت نہ کرو' اور خدا سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکارم اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمان کامل کا ایک جزو قرار دیا' اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے۔'' کہا گیا ہے کہ یا

رسول ﷺ اللہ اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے اس کے آگے مہمان پر صدقہ (۱)۔ ہوگا ''نیز فرمایا کہ جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے۔ اس کو چاہئے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے (۲)۔ رکھے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو' اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا' بیشک فرمایا ایسا نہ کرو۔ نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو کیونکہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے۔ (۳)۔ ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے۔ پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے چاہئے وہ لے لے چاہے چھوڑ دے۔ (۴)۔

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لئے بہر حال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے۔ وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوان کرم سے حد ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے چنانچہ احادیث میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے یہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے کیونکہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوگی اور اس پر بار پڑے (۵)۔ گا۔ اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہو جائے گی۔ جس کو خود غیور اور خوددار مہمان پسند نہ کرے گا۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتوں تک جا کر لیتے تھے۔اس طرح خاندانوں

(۱)۔بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم الاخر فلا یوذ جارہ۔ (۲)۔ بخاری کتاب الادب اکرام الضیف و خدمتہ ایاہ بنفسہ و قولہ تعالیٰ ضیف ابراھیم المکرمین۔ (۳)۔ بخاری کتاب الادب باب حق الضیف۔ (٤)۔ ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف۔ (٥)۔ بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف و خدمتہ ایاہ بنفسہ۔

میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا اور اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے' اور وہ دین کا رشتہ تھا۔جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا۔دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا اور خاندانی وقبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی ان کے اندر پیدا کر دی جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دشمنوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلا دیا کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی ہو گئے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یایھا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون۔

اے مسلمانوں! خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ تم مرو لیکن مسلمان۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء ہ فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔(آل عمران: ۱۰۳)

اور خدا کی رسی سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو، اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے۔ تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا پھر تم بھائی بھائی ہو گئے۔

مسلمانوں کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روئے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنوں کو باہم ملا کر ایک نہیں کر سکتا تھا۔

والف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم انہ عزیز حکیم۔ (انفال: ۸)

اور خدا نے مسلمانوں کے دل ملا دیئے! اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتا۔ تب بھی تو ان کے دلوں کو ملا نہ سکتا لیکن خدا نے ملا دیا بیشک وہ (ہر مشکل پر) غالب آنے والا اور مصلحت جاننے والا ہے۔

تو اب مسلمانوں کو یہ چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کریں، اور سب مل کر خدا کے دین کی رسی کو جو ان کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے۔ مضبوط پکڑیں اور باہم اختلاف پیدا کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں کیونکہ اس رسی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مل کر اس کو پکڑے رہیں، فرمایا:

واطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم (انفال: ۴۶)

اور اللہ اور رسول کا کہا مانو، اور آپس میں جھگڑا نہ کرو (کہ ایسا ہو گا تو) ہمت ہار دو گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

یہی باہمی اتفاق و اتحاد، ملت اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ، اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں میں باہم

الفت ومحبت ہو اب اگر اتفاق سے ان میں اختلاف پیش آ جائے تو اس کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونوں خدا اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کریں۔

فان تنازعتم شئی فردوہ الی اللہ و الرسول (نساء:۸)

تو اگر تم (مسلمانوں) میں کسی بات میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لٹادو۔

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو صلح پر مجبور کریں اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل و انصاف سے ان میں صلح کرا دیں۔

وان طائفتن من المئومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احدھما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفی الی امر اللہ' فان فاء ت فاصلحوا بینھما بالعدل واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین انما المئومنون اخوبت فاصلحوا بین اخویکم (حجرات: ۱)

اگر مسلمان کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو' پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے' تو ظلم کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو تو اگر وہ رجوع کر لے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو۔ خدا منصفوں کو درست رکھتا ہے۔ مومن تو آپس میں بھائی ہی ہیں۔ اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔

آیت کے اخیر ٹکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانوں میں بھائی کا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ جنگ و خونریزی کے بعد بھی نہیں کٹتا۔ انہی آیتوں کے تحت میں وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انصر اخاک ظالما و مظلوما (بخاری)

تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جا سکتی ہے' لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کی جائے' فرمایا اس طرح کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے۔

کیسا ہی بڑے سے بڑا کافر' اور سخت سے سخت دشمن ہو' جس وقت اس نے کلمہ شہادت پڑھا اور شریعت اسلامی کو قبول کیا وہ دفعتًا ہمارا مذہبی بھائی ہو گیا۔ خدا نے فرمایا:

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین (توبہ: ۲)

تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کر لیں' اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے مذہبی بھائی ہیں۔

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو گیا۔ اگر اس کے باپ کا نام و نسب نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں' وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے' فرمایا:

فان لم تعلموا ابائھم فاخوانکم فی الدین و موالیکم (احزاب: ۱)

تو اگر تم ان کے باپوں کے نام نہ جانو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں' اور علاقہ مند۔

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے' تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اس کے جذبۂ رحم کی تحریک فرماتا ہے ارشاد ہوتا ہے:

فمن عفی لہ من اخیہ شئی (بقرہ: ۲۲)

تو اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے' کیونکہ:

ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ

میتا۔(حجرات:۲)

کیا تم میں کوئی پسند کرے گا وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔

یتیموں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا۔متولیوں کا فرض ہے' اور اگر وہ ان کے اپنے اندر شامل کرکے نیک نیتی کے ساتھ ان کو اپنے کنبہ کا جزو بنا لیں' اور ملا جلا کر خرچ کریں۔تو یہ بھی درست ہے کیونکہ یہ ان کے بھائی ہیں۔جن کی خیر خواہی ان کا فرض ہے فرمایا:

وان تخالطوھم فلخوانکم (بقرہ:۲۷)

اور اگر تم ان کو اپنے میں ملا لو تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر کریں۔وہ یوں کہتے ہیں:

ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان۔(حشر:۱)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے معاف کر۔

ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی برائی ہے جس کے دور کرنے کے لئے خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہئے اور کہنا چاہئے۔

ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک رء وف رحیم(حشر:۱)

اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے اے ہمارے پروردگار تو مہربان رحم والا ہے۔

مسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم و شفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں خدا نے مدح فرمائی:

رحماء بینھم (مائدہ)

وہ (مسلمان) آپس میں رحم وشفقت رکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی یہ صفت ہونی چاہئے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے اور نرمی کا برتاؤ کرے۔

اذلہت علی المئومنین (مائدہ)

مسلمانوں سے جھکنے اور نرمی کرنے والے۔

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت، محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے۔ ''مسلمان کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ (۱)'' صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا ''سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔ (۲)'' مقصود یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک جسم ہے اور اس کے سارے افراد اس کے اعضا ہیں بدن کے ایک عضو میں بھی اگر کوئی تکلیف یا دکھ درد ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں، اور اس

(۱)۔صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۸۳ کتاب الادب و صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۹ کتاب البر والصلتہ و الآداب، مصر۔ (۲)۔ صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۹ مصر کتاب البر والصلتہ والادب۔

دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ یہی مسلمانوں کا حال ہونا چاہئے کہ ان میں سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہئے۔

ایک دوسری تمثیل میں آپ ~ صل۳~ نے ارشاد فرمایا کہ ''مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے (۱)۔ بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر

آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا' کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے اس تمثیل میں آپ ~ صل ۳ ~ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر نا قابل تسخیر حصن و حصار بن جاتی ہے اسی طرح جماعت اسلامیہ ایک قلعہ ہے جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مسلمان ہے۔ یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے۔ جب تک اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی۔تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آ جائے گی۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرے' نہ اس کو بے مدد چھوڑے' اور نہ اس کو تحقیر کرے انسان کیلئے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔ مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون' اس کا مال اور اس کی آبرو۔ (۲)۔'' یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ ابو داؤد میں ہے کہ فرمایا۔ ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے' تو وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پورے کرنے میں رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا۔ جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو خدا اس کے بدلہ قیامت میں اس کی تنگی کو دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔ (۳)۔''

ابو داؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا ''جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کا پردہ رکھے گا' اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔''

فرمایا ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔ (۵)۔'' یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے۔ دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ

یا رسول اللہ ﷺ سب سے اچھا مسلمان کون ہے' فرمایا۔ ''جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں' (۶)۔ یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا وہی سب سے بہتر مسلمان ہے۔ جریرؓ بن عبداللہ بجلی جو ایک مشہور صحابی تھے کہتے ہیں کہ ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تین باتوں پر بیعت کی' نماز کو قائم رکھنا' زکوٰۃ دینا' اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔'' کئی روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی (فسوق) ہے' اور اس سے لڑنا (قتال) خدا کا انکار (کفر) ہے۔ (۸)۔'' یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الأدب ج ۲ ص ۸۹۰ و صحیح مسلم کتاب البر والصلته والاداب ۲ صفحه ۳۸۹' مصر۔ (۲)۔ صحیح مسلم کتاب مذکور ج ۲ ص ۳۸۶ مصر۔ (۳)۔ سنن ابی دائود کتاب الادب ج ۲ صفحه ۱۹۴ (۴)۔ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحه ۱۳۔ (۵)۔ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحه ۱۲ صحیح مسلم کتاب ایمان ج۱ (۶)۔ صحیح بخاری کتاب ایمان ج۱ (۷)۔ صحیح بخاری کتاب ایمان ج ۱ (۸)۔ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحه ۱۲ و ج ۳ صفحه ۸۹۳

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے اب جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ خدا کے حکم کو نہیں مانتا اور یہ ایک معنی میں خدا کا انکار ہی ہے۔ چنانچہ اسی لئے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے جو کافروں کے لئے مخصوص ہے' فرمایا ''کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔''

ومن یقتل مئومنا متعمدا فجزآئوہ جهنم خلدا فیها وغضب الله علیه ولعنه واعدله عذابا عظیما۔ (نساء: ۱۳)

اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے گا تو اس کا بدلہ دوزخ

ہے وہ اس میں پڑے رہے گا' اور خدا اس پر خفا ہوا اور لعنت
کی اور اس کے لئے بڑا عذاب تیار کیا۔

حجتہ الوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپ ~ صل۳ ~ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا۔ پھر فرمایا۔ ''دیکھو میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ (۱)۔'' ایک اور موقع پر فرمایا کہ ''جو ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں نہیں۔ (۲)۔'' جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے' فرمایا سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے۔ (۳)۔ اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو جس میں اس کی آبرو جانے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے' ارشاد ہوا ''جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑے گا جس میں اس کی عزت پر حرف آتا ہے اور اس کی آبرو جاتی ہو۔ تو خدا بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دے گا' اور جو کوئی کسی مسلمان کو ایسے موقع پر مدد کرے گا تو خدا بھی اس کے لئے ایسے موقع پر مدد فرمائے گا۔''

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضگی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے تو آنحضرت ﷺ نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ ''کسی مسلمان کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے ملاقات ہو تو وہ ادھر منہ پھیر لے اور یہ ادھر منہ پھیر لے' اور ان میں بہتر وہ ہے کہ جو پہلے اسلام کی ابتدا کرے۔ (۶)۔ ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا' آپس میں کینہ نہ رکھو حسد نہ کرو اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو' اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ' اور کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے۔ (۶)۔'' ایک مسلمان کے لئے اس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر معاملہ اس کے ایمان کا ہے قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے اظہار

اسلام کے لئے سلام کرے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں۔

ولا تقولوا لمن القی الیکم السلم لست مئومنا(نساء:۱۳)

اور اس کو جو تمہاری طرف سلامتی کا کلمہ ڈالے' یہ نہ کہو تو مومن نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں' ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پا کر حملہ کیا۔ اس نے فوراً کلمہ پڑھ

(۱)۔صحیح بخاری کتاب الایمان صفحہ ۲۳۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الدیات ج ۲ صفحہ ۱۰۱۵ و کتاب الفتن ج ۲ صفحہ ۱۰۴۰۔ (۳)۔سنن ابی دائود کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۸۹۔ (٤)۔ ایضاً۔ (٥)۔ صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۹۲۱ و سنن ابی دائود کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۹۲۔ (٦)۔ صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹٦۔

دیا۔ مگر اس پر بھی ان صحابی نے اس کو قتل ہی کر دیا۔ یہ خبر آنحضرت ﷺ تک پہنچی۔ آپ ~ صل۳~ نے ان کو بلا کر دریافت کیا۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔ آپ ~ صل۳~ نے کس بلیغ انداز میں فرمایا' ''تم اس کے لا الہ الا اللہ کے ساتھ کیا کرو گے۔'' ایک روایت میں ہے کہ فرمایا'' کیا تم نے اس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا۔ (۷)۔

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ ''مومن کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اس کے قتل کے برابر ہے۔ (۱)۔ یہ بھی فرمایا کہ ''جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے۔ تو وہ کفر دو میں سے ایک پر لوٹے گا۔ (۲)۔'' یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا' اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے' جان' ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے' ارشاد ہوا کہ ''جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا تو خدا اس کے لئے

دوزخ واجب اور جنت حرام کرے گا' ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ! اگر کوئی معمولی سی چیز ہوتب بھی' فرمایا درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو۔ (۳)۔'' فرمایا ''ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں۔ سلام کا جواب دینا اس کے چھینکنے پر خدا تم پر رحمت کرے کہنا' اس کی دعوت کو قبول کرنا' بیمار ہوتو عیادت کرنا' اور مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ (۴)۔ چلنا' یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں جن سے دو مسلمانوں کے درمیان خوش خلقی اور حسن تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ ''جب کوئی مسلمان اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جب تک واپس نہ ہو۔ جنت کی روش پر ہوتا ہے۔ (۵)۔'' حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ''جو کوئی ایمان و اخلاص کے ساتھ کسی کے جنازے کے پیچھے چلتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے' اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے۔ تو اس کو ثواب کی دو رتی (قیراط) ملتی ہے۔ جس میں سے ہر رتی احد کے پہاڑ کے برابر ہو گی۔ (۶)۔ یعنی یہ رتی دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی بلکہ یہ اس پیمانہ سے ہو گئی جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کا حکم رکھتا ہے۔

یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا اس برادرانہ الفت و محبت کے فروغ ہیں۔ جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ''تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہوگا۔ جب تک وہ اپنے بھائی کیلئے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔ (۷)۔'' الغرض ملت اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے ابو داؤد میں ہے کہ آپ ~ صل۳~ نے فرمایا مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے اور مسلمان کا بھائی ہے' اس کے نقصان کو دور کرتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے میں اس کی حفاظت کرتا ہے' دیکھے کہ آنحضرت ﷺ نے جماعت

اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شکستہ نہ رہیں، جیسی آج ہیں، ہر جماعت انہی اصولوں پر دنیا میں بنی ہے، اور آئندہ بھی بنے گی۔

---

(۱)۔پہلی روایت صحیح بخاری غزوہ حرقات اور کتاب الدیات میں ہے دوسری روایت کیلئے دیکھو فتح الباری کتاب الدیات شرح حدیث مذکور۔ (۲)۔صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹۳ (۳)۔ ایضاً۔ (٤)۔صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ٤۳ مصر۔ (٥)۔صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۱ ٦٥ (٦)۔ صحیح مسلم ج صفحہ ۳۸٤ کتاب البر والصلتہ۔ (۷)۔صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۱۲۔ (۸)۔صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ٦ (۹)۔سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۹۲ تیسرے فقرہ کے مطلب میں شارحین کا اختلاف ہے۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے اس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

وقولوا للناس حسنا (بقرہ: ۱)

اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا، انسانیت کا فرض ہے جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں، دین مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے اسی لئے ارشاد ہوا:

ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔ (مائدہ: ۲)

اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمدہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف نہ کرو، عدل اور انصاف (ہر حال میں) کرو کہ یہ بات تقوی کے قریب ہے۔

ہر قسم کا برا سلوک اور بے رحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان اور ایک قوم دوسری قوم کی ساتھ کرتی ہے اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ یہ آیت پاک انسان کے اسی مادہ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے ابو ہریرہ اور انس ابن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ

اخوانا(بخاری: ۲)

آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو' ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں:

لا تباغضوا و لا تحاسدوا و لا تدابروا و کونوا عباد اللہ اخوانا(بخاری)

ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو' نہ ایک دوسرے پر حسد کرو' اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو' اور اے خدا کے بندو آپس میں بھائی بن جاؤ۔

اس حدیث پاک میں انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے بھرئی ہوئی دنیا دفعتًا جنت بن جائے۔ لا یرحم لا یرحم (بخاری) ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔'' جو بندوں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا رحم نہیں کرتا۔ یا یہ کہ جو دوسرے پر رحم نہیں کرتا۔ دوسرا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ آپ ~ صل۳~ نے فرمایا کہ تم زمین والوں پر رحم کرو۔ تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔ (۱)۔ یہ حدیث رحمتہ للعالمین ﷺ کی تعلیم کی شان رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا۔'' بخاری) اس فیض کے عموم میں انسانیت کی قید بھی نہیں ہے۔ ایک دفعہ آپ ~ صل۳~ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا۔ جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب ملا' صحابہؓ نے پوچھا اے خدا کے رسول! کیا جانوروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں بھی ثواب ہے۔ فرمایا' ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب (۲)۔ ہے۔

(بخاری) اس ثواب کے دائرہ میں ہر وہ ہستی شریک ہے۔ جو زندگی سے بہرہ ور ہے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا ''جہاں بھی ہو خدا کا خیال رکھو، برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دو گے، اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ۔'' (باب ماجاء فی معاشرہ الناس صفحہ ۳۳۱) ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے پانچ باتیں گنائیں جن میں ایک یہ تھی کہ راحب للناس ماتحب لنفسک (یعنی تم لوگوں (نامی) کیلئے وہی چاہو جو تم اپنے لئے چاہتے ہو تو مسلمان بن (۳)۔ جاؤ گے۔) الناس کا لفظ عام ہے۔ جس میں تمام انسان داخل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ دل میں نہ ہو انسان پورا مسلمان نہیں بنتا۔

کیونکہ دوسرے کے لئے وہی چاہنا جو اپنے لئے چاہو اخلاق کی وہ تعلیم ہے۔ جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے ایک اور حدیث میں یہ تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ''تم اپنے بھائی کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو'' بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے اور ایک عام انسان بھی تورات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ''تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو۔ اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق کا بیان علیحدہ باب میں گزر چکا ہے اس پر یہاں ایک نظر ڈال لینی چاہئے کہ صحابہ کرام نے اس تعلیم کی پیروی یہودی اور عیسائی پڑوسیوں کا حق بھی مسلمان پڑوسیوں ہی کی طرح مانا ہے۔

صدقہ و خیرات کے باب میں گو فقرا اور مساکین میں مسلمانوں کی ترجیح ایک قدرتی باب ہے۔ تاہم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں نامسلمان ذمی مسکینوں کے حق کو بھی تسلیم کیا۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخرج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بڈھا جو اندھا بھی تھا، ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ

لیس علیك ھدھم ولکن اللہ یھدی من یشائط وما تنفقوا من خیر فلانفسکم(بقرہ:۲۷۳)

ان کو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات نہیں لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے' اور جو بھلائی خرچ کرو' وہ تمہارے ہی لئے ہے۔

یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہر حال ملے گا۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

لا یئومن احد کم حتی یحب للناس ما یحب لنفسہ وحتی یحب المولا یحبہ الاللہ عزوجل (جلد ۳ صفحہ ۲۷۲)

تم میں سے کوئی اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کیلئے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ آدمی کو صرف خدا کیلئے پیار نہ کرے۔

اس حدیث میں محبت انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دی گئی ہے۔

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف ومحبت کا جو عام پیغام لیکر آیا تھا اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے۔ اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی' اہل عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے اور لوگوں کو کہتے تھے کہ تم ان کو کھا جاؤ اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے۔ دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا۔ جو رک جاتا وہ ہار جاتا۔ یہ سب جانور دوست واحباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے۔ یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی۔ ان واقعات کا ذکر اشعار عرب میں موجود ہے۔ ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مر

---

(۱)۔سورئہ دھر۔ (۲)۔ کتاب الاموال امام ابوجبیدہ صفحہ ۳۱۲' ۶۱۴ مصر کتاب الجمعہ۔ (۳)۔ مسلم باب فضل الصدقتہ علی الاقربین۔ (۴)۔ طبرانی۔

جاتا ایسے جانور کو بلیہ کہتے تھے۔ اسلام آیا تو اس نے اس سنگدلی کو مٹا دیا۔ عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ بنایا جائے۔ (۱)۔ ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن عمر نے مرغی کو کھول دیا' اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کر اس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ سے جانور یا کسی اور جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا گزر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ

نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے۔ جولوگ ایسا کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ملعون قرار دیا ہے۔(۲)۔اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکی کاٹ کر کھاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں آ کر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے۔ وہ مردار(۳)۔ ہے یہ ایک خاص صورت تھی، لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی ان کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی۔(۴)۔

بلاضرورت کسی جانوروں کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا۔(۵)۔ ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے اگر گنجشک یا اس کے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو خدا اس کے متعلق اس سے باز پرس کرے گا۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ، اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے، یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کے پھینک دے۔(۶)۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا اور وہ درندہ بھی نہیں ان کا مارنا جائز نہیں۔ سنن نسائی میں ہے کہ جو شخص گنجشک کو بلاضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن خدا کے یہاں فریاد کرے گی کہ فلاں نے مجھ کو بلاضرورت مارا ہے اس کا کوئی فائدہ(۷)۔ نہ تھا۔ جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے یا ان سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ ان کا مارنا بھی جائز نہیں چنانچہ آپ نے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے۔(۸)۔

جو جانور ضرورتاً مارے یا ذبح کئے جاتے ہیں۔ ان کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے۔ اس لئے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقے سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو تم میں ہر شخص اپنی

چھری کو تیز کر لے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے۔(۹)۔ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ میں بکری کو

(۱)۔ترمذی ابواب الصید باب ماجاء فی کراھتہ اکل المصبورہ صفحہ ۲۵۵ (۲)۔ بخاری کتاب الذبائح والصید باب ما یکرہ من المثلہ وقر المصبورہ والمحثمتہ (۳)۔ ترمذی ابواب الصید باب ماجاما قطع من الی فھومیت۔ (٤)۔ بخاری کتاب الذبائح والصید باب ما یکرہ من المثلہ والصبور ذو المحثتہ۔ (٥)۔ مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۱٤٤۔ (٦)۔ مشکوہ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۲۵۰ (۷)۔ نسائی کتاب الضحایا صفحہ ٦۷۹ (۸)۔ مشکوہ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۳٦٦۔ (۹)۔ مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل و تحدید اشفرہ۔

ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر رحم آتا ہے یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں' فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا تم پر رحم (۱)۔کرے گا' یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت (۲)۔فرمائی۔کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے۔کنکر پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی' اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا نہ دشمن شکست کھا سکتا البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے۔(۳)۔مطلب یہ کہ بلاضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں' جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں۔ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔

چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپ ~ صل۳~ نے فرمایا کہ اس پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور آخر وہ اس طرح بندھی مر گئی۔(۴)۔ بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں۔اس لئے وہ اس

معاملہ میں بہت زیادہ گنہگار ہیں۔ چنانچہ آپ ~ صل۳~ نے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو' اگر خدا ان کو معاف کر دے تو سمجھو اس نے تمہارے بہ کثرت گناہ معاف کر دیئے' ایک دفعہ آپ ~ صل۳~ صحابہؓ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے۔ آپ ~ صل۳~ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے۔ جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولہا اسی جگہ جلایا ہے۔ جہاں زمین پر درخت پر چیونٹوں کا سوراخ تھا۔ یہ دیکھ کر آپ ~ صل۳~ نے دریافت کیا کہ یہ کس نے کیا ہے ان صاحب نے کہا یا رسول اللہ! یہ میں نے کیا ہے۔ آپ ~ صل۳~ نے فرمایا بجھاؤ بجھاؤ (۱)۔ (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو یا جل نہ جائیں) ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا۔ انہوں نے پہلے سامان اس جگہ سے ہٹایا پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلا دیا۔ اس پر خدا نے ان کو وحی کے ذریعے سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں (۲)۔ جلایا۔ یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی۔ جس نے کاٹا تھا۔ تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے چڑیا فرط محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی۔ رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کیلئے گئے ہوئے تھے واپس آ کر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اس کو بے قرار کیا ہے اس کے بچوں کو چھوڑ دو۔ صحابہ کرام نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا۔ دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کیلئے سزاوار ہے۔

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام بعینہ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجب ثواب ہے۔ اسی عدم واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ

اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ خدا نے ان کو تمہارا فرمانبردار صرف اس لئے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے تمہارے لئے خدا نے زمین کو پیدا کیا ہے اپنی ضرورتیں اسی پر پوری (۵)۔ کرو۔ اگر چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے۔ اس لئے اس حدیث کا مطلب ہے کہ بلاضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہئے۔

۲۔ جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہئے۔ چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ' اور جب قحط کے زمانہ میں سفر کرو تو اس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ (۶)۔ تا کہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پائے' ایک بار آپ ﷺ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا' فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو' ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو' اور

---

(۱)۔ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی کراهته حرق العدو بالنار۔ (۲)۔ ابن ماجه باب الادب بابفضل صدقته الماء۔ (۳)۔ بخاری کتاب الادب باب رحمته الناس والبهائم۔ (٤)۔ بخاری ابواب الحرث والمزارعه باب فضل الزرع والغرس اذاکل منه۔ (٥)۔ بخاری ابوالحرث والمزاعته باب استعمال البقر للحراثته۔ (٦)۔ مسلم کتاب الاماره باب مراعاه مصلحته الدواب فی الیسر والنهی عن التعریف فی الطریق ابوداؤد کتاب الجهاد باب مایومر به من القیام علی الدواب والبهائم۔

ان کو کھاؤ تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ۔ (۱)۔

ایک بار آپ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لئے گئے' اس میں

ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر بلبلایا اور آب دیدہ ہوگیا' آپ ﷺ اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آ کر کہا کہ ''میرا یا رسول اللہ!'' (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمایا اس جانور کے بارہ میں جس کا خدا نے تم کو مالک بنایا ہے' خدا سے نہیں ڈرتے' اس نے مجھ سے شکایت کی تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو۔ (۲)۔

۳۔ جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والوں کو معلون قرار دیا۔ (۳)۔

۴۔ جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا (۴)۔ کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔ پچھلے صفحوں پر ایک نظر ڈال لیجئے' تا کہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم ہے اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے۔

---

(۱)۔ مسلم کتاب الامارہ باب مراعاہ مصلحتہ الدواب فی الیسر والنہی عن التعریف فی الطریق ابوداؤد کتاب الجہاد باب مایومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب الجہاد و باب وسم الدواب۔ (۳)۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم۔

فضائل اخلاق

اخلاق حسنہ کے جزئیات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے' قدیم حکمائے اخلاق نے ان کی دو قسمیں کی ہیں' ایک امہات اخلاق اور دوسری فروع اخلاق' امہات اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہیں جو دوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہیں اور جن میں کمی و بیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں' اور جن کے اعتدال سے فضائل اخلاق کا وجود ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتیں ہیں' (۱) قوت علمیہ' (۲) قوت شہوانیہ' اور (۳) قوت غضبیہ' قوت علمیہ' کے اعتدال کا نام حکمت' قوت شہوانیہ کے اعتدال کا عفت اور قوت غضبیہ کے اعتدال کا شجاعت ہے' اور انہی کے عدم اعتدال کو رذائل کہتے ہیں' پھر ان دونوں قسموں کے اختلاف مدارج سے اچھے اور برے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں۔

یہ تقسیمیں محض فلسفیانہ ہیں' یا یوں کہئے کہ علمی اور نظری ہیں' لیکن اسلام کے پیش نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں بلکہ عملی ہے' کیونکہ اس کا منشا انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں' بلکہ انسان کو فضائل اخلاق کا عامل بنانا اور رذائل اخلاق سے عملاً بچانا ہے' اس لیئے اس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے' اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں' بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور برے اخلاق سے بچایا جائے' اسی لیئے اپنی تعلیم میں اس نے اہل فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے اور نہ یہ طریقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور تربیت کا ہے۔

اسلام کی ہر شے میں خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے' ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا

ہے اور وہ برا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے، گو یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اس میں عقلی خوبیاں اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے، اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس میں عقلی برائیاں اور خلق خدا کا نقصان بھی ہوتا ہے، اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمیں ہیں! وہ اخلاق جن کو خدا پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے، رذائل ہیں ہم نے اوپر اخلاق اور محبت الٰہی کے عنوان میں وہ آیتیں لکھ دی ہیں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا نہ پسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو خدا پسند فرماتا ہے ان کو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام دیا ہے۔ یہ فضائل بہت سے ہیں اور قرآن پاک اور احادیث شریفہ میں جا بجا ان کی تصریح ہے لیکن ان کے بیان میں اخلاق شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی ہے، اسی لیئے ان کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہوئے۔

میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہئے جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولوں اور پیغمبروں کی توصیف اکثر کی گئی ہو، اور مسلمانوں کو اس سے متصف ہونے پر کتاب الٰہی اور پیام نبوی ﷺ میں زیادہ زور دیا گیا ہو اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو۔

گو اس معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے اور غور و فکر کرنے والوں میں اس بارہ میں اختلاف بھی ممکن ہے لیکن جہاں تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہے اس میں کامیابی کی کوشش کرونگا۔

فضائل کی مختصر فہرست ::

جن فضیلتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو گنا کر اس نے اپنے اچھے بندوں کی توصیف کی ہے، یا ان اوصاف والوں کے لیئے اپنی بخشش اور بخشائش کا وعدہ فرمایا ہے، قرآن پاک اور احادیث نبوی ﷺ میں جا بجا ان کی تفصیل ہے، جیسے:

قد افلح المئومنون- الذين هم فى صلاتهم خاشعون- والذين هم عن اللغو معرضون- والذين هم للزكوبت فاعلون- والذين هم لفروجهم حفظون- الاعلى ازواجهم او ما ملكت ايمانهم فانهم غير ملومين- فمن ابتغى ورآء ذلك فاولئك هم العدون- والذين هم لامنتهم وعدهم راعون- والذين هم على صلوتهم يحافظون- اولئك هم الوارثون الذين يرثون الفردوس فيها خلدون-(مومنون: ۱)

ایمان والے مراد کو پہنچ گئے جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں جو بیکار باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے' جو زکوۃ دیتے اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں لیکن اپنی بیویوں سے اور اپنی (شرعی) باندیوں سے کہ ان پر کوئی الزام نہیں تو جو اس کے سوا کے خواہاں ہوں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں اور وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں' اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں' یہی اصلی وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیتوں میں جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہیں (۱) نکمی اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی' (۲) عصمت اور پاکدامنی' (۳) امانت داری اور ایفائے عہد ایک دوسری جگہ ہے:

ولكن البر من امن بالله واليوم الاخر والملئكبت والكتب والنبين واتى المال على حبه ذوى القربى واليتمى والمسكين وابن السبيل والتائلين وفى الرقاب واقام الصلوبت واتى الزكوبت والموفون بعهدهم اذا عاهدوا والصبرين فى البلساء والضراء اذا عاهدوا والصبرين فى البلساء والضرآء وحين

البا س (بقرہ: ۲۲)

اور لیکن اصلی نیکی اس کی ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب الٰہی پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت کے ساتھ رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور غریبوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کو چھیڑانے میں دیا' اور نماز کھڑی کی اور زکوۃ دی اور اپنے قول کو جب انہوں نے اقرار کرلیا پورا کرنے والے اور مصیبت میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے ہل چل کے وقت ثابت قدم رہنے والے۔

ان آیتوں میں جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہیں وہ یہ ہیں سخاوت' قول وقرار کو پورا کرنا اور مشکلوں میں ثابت قدمی سورۂ آل عمران میں ہے:

الصبرین و الصدقین و القنتین و المنفقین (آل عمران: ۱۷)

ثابت قدم رہنے والے' اور سچ بولنے والے اور (خدا کی) فرمانبرداری کرنے والے اور خدا کی (راہ میں) خرچ کرنے والے۔

اس آیت میں ثابت قدمی' سچائی اور فیاضی کو سرایا گیا ہے' اسی سورہ میں ان متقیوں کا حال ہے جو خدا کی مغفرت اور آسمان وزمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہوں گے۔

الذین ینفقون فی السرآء و الضرآء و الکاظمین الغیظ و العافین عن الناس و اللہ یحب المحسنین (آل عمران: ۱۴)

جو خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں (خدا کے نام) خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس اوپر کی آیت میں فیاضی' عفو ودرگذر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے سورہ معارج

میں ہے:

والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم۔ والذین یصدقون بیوم الدین۔ والذین ھم من عذاب ربھم مشفقون۔ ان عذاب ربھم غیر ماعون۔ والذین ھم لفروجھم حفظون۔ الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین۔ فمن ابتغی ورآء ذلک فاولئک ھم العدون۔ والذین ھم لامانتھم وعھدھم راعون۔ والذین ھم بشھادتھم قائمون۔(معارج: ۱)

ان جن کے مال میں مانگنے والے' اور مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے' اور جو روز جزا کو سچ مانتے ہیں' اور اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں' بے شبہ ان کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں' اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں' مگر اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں سے کہ اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں جو اس کے علاوہ چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں' اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔

ان آیتوں میں سخاوت نفس عفتو عصمت' امانتداری' ایفائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی ان فضیلتوں میں شمار کیا ہے جو اس کے جنت میں جانے کی سبب ہوئی ہیں۔ سورۂ احزاب میں ان مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے جن کے لیئے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشائش اور بڑی' مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے۔

والصدقین والصدقت والصبرین والصبرات والخشعین والخشعین والخشعت والمتصدقین والمتصدقات والصائمین والصئمت والحفظین فروجھم والحفظت۔(احزاب: ۵)

اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے والیاں، صبر کرنے والے اور صبر کرنے والیاں اور عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں اور صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں۔

ان میں سچائی، صبر، عاجزی، اور عصمت وعفت کے اوصاف کا ذکر ہے۔

سورۂ فرقان میں خدا کے اچھے بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے۔

(۱) وعباد الرحمان الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما (ح:۶)

(۱) اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین میں ہولے چلتے ہیں، اور جاہل جب ان سے جہالت کی باتیں کریں تو وہ کہیں سلامت (۱)۔ رہیئے۔

(۲) والذین اذا انفقوا لم یسرفوا لم یقتروا و کان بین ذلک قواما

(۲) اور جب وہ خرچ کریں تو نہ تو فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں اور دونوں کے بیچ کی راہ ہو۔

(۳) ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا یزنون

(۳) اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔

(۴) والذین لا یشھدون الزور و اذا مروا باللغو مروا کراما

(۴) اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بیہودہ مشغلہ کے پاس سے گزریں تو شریفانہ وضع سے گزر جائیں۔

پہلی آیت میں عاجزی اورفروتنی اور بردباری دوسری آیت میں اعتدال اورمیانہ روی، اورتیسری میں عدم ظلم اورعفت اور چوتھی میں سچائی اورمتانت وسنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے،سورۂ رعد میں وہ صفتیں بتائی گئی ہیں جوعقبیٰ میں کام آئیں گی۔

الذین یوفون بعهد الله ولا ینقضون المیثاق والذین یصلون ما امرالله به ان یوصل ویخشون ربهم و یخافون سوء الحساب والذین صبروا ابتغاء وجه ربهم واقاموا الصلوٰة وانفقوا مما رزقنهم سرا وعلانیة ویدرءون بالحسنة السیئة اولئك لهم عقبی الدار (ورعد: ۲۰،۲۲)

جولوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اورقول کوتوڑتے نہیں اورجس کے جوڑنے کا خدا نے کہا ہے اس کو جوڑے رکھتے ہیں اوراپنے مالک سے ڈرتے ہیں اور بری طرح حساب ہونے سے سہمے رہتے ہیں اورجنہوں نے اپنے مالک کی خوشی کے لیئے صبر،اورنماز کھڑی کی اورہم نے جوان کو دیا اس سے چھپے اور کھلے (اچھے کاموں میں) خرچ کیا اور برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں،انہیں کے لیئے پچھلا گھر ہے۔

اس ایفائے عہد سے وہ عہد مراد بھی ہوسکتا ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے اوراس سے وہ عہد بھی سمجھا جاسکتا ہے جوخدا کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے،اورجس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے،وہ اہل قرابت اورحقداروں کے حقوق ہیں ان دو کے سوان آیتوں میں ان کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگوں سے بھلائی کرتے ہیں،یا یہ کہ بھلائی کرکے برائی کو دھودیتے ہیں۔

تلك الدار الاخرة نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا والعاقبة للمتقین۔ (قصص: ۸۳)

اس پچھلے گھر کو ہم ان کے لیئے کریں گے جو زمین میں غرور

اور فساد کرنا نہیں چاہتے' اور آخر انجام پرہیز گاروں کے لیئے

ہے۔

(۱)۔یا سلام کہیں۔

یعنی غرور و نخوت نہیں کرتے۔

والذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش واذا ما غضبوا ھم یغفرون (شوریٰ: ۴)

اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں

اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے اور معاف کر دیتے ہیں۔

ان اللہ یحب المحسنین (بقرہ: ۲۴)

بیشک اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔

عدل و انصاف کی فضیلت کے لیئے اس سے بڑھ کر کیا چاہئے کہ وہ خدا کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے۔

ان اللہ یحب المحسنین (بقرہ: ۲۴)

بیشک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس پیار اور محبت کے استحقاق میں ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے۔

حدیثوں میں جن اخلاقی فضیلتوں کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھلے صفحوں میں گزر چکی ہیں اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی۔

صدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سرفہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال میں سچائی ہے۔ اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتیں آ جاتی ہیں۔

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیئے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں' اسی کا نام صدق یا سچائی ہے' جو سچا نہیں' اس کا دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے اور جو سچا ہے اس کے لیئے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ! مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں' ایک یہ کہ بدکار ہوں' دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں' تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں' چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں' ان میں سے جس ایک کو فرمایئے' آپ ﷺ کی خاطر سے چھوڑ دوں' ارشاد ہوا کہ جھوٹ نہ بولا کرو' چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا' اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو جی چاہا' اور پھر بدکاری کے لیئے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گزرا کہ صبح کو جب آنحضرت ﷺ پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دوں گا۔ اگر ہاں کہوں گا تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی' اگر نہیں کی تو عہد کے خلاف ہو گا یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا' جب رات زیادہ گزری اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لیئے گھر سے نکلنا چاہا تو پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا۔ کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہوں گا' ہاں کرونگا تو ہاتھ کٹیں گے' اور نہیں کرتا تو بدعہدی ہوتی ہے' اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے باز آیا' صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ! جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئیں' یہ سن کر آنحضرت ﷺ مسرور (۱)۔ ہوئے۔

(۱)۔اس قصہ کو مولانا عبدہ عبدالعزیز صاحب دھلوی تفسیر عزیزی سورہ ن میں کتب سیر کے حوالہ سے نقل کیا ھے لیکن مجھے اس کا ماخذ نہیں معلوم ہوا۔

یہ روایت سند کی رو سے کتنی ہی کمزور ہو، مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے، سچائی کی عادت انسان کو بہت سی برائیوں سے بچاتی ہے، جو سچا ہوگا، وہ برائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا، وہ راست باز ہوگا، راست گو ہوگا۔ وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کرے گا، دلیر ہوگا، دل کا صاف ہوگا۔ ریا کار نہ ہوگا۔ اس کے دل میں نفاق نہ ہوگا۔ پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اس کی شان نہ ہوگی، خوشامدی نہ ہوگا، سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا، لوگوں کو اس کے قول و فعل پر اعتبار ہوگا۔ جو کہے گا کرے گا، غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصلی بنیاد قرار پائے گی۔

صدق، صفات، ربانی میں سے بھی سب سے بڑی صفت ہے خدا سے بڑھ کر سچا کون ہوسکتا ہے، قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں خدا آپ فرماتا ہے۔

ومن اصدق من اللہ حدیثا(نساء)

اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے۔

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد فرمایا:

وعداللہ حقا و من اصدق من اللہ قیلا(نساء:۱۸)

وعدہ کیا اللہ نے سچ، اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچا بات میں۔

خدا سچا ہے، اس لیئے اس کی ساری شریعت سچی ہے فرمایا:

وانا لمصدقون(انعام:۱۸)

اور ہم ہیں سچے۔

قل صدق اللہ فاتبعوا ملہت ابراھیم حنیفا (آل عمران:۱)

کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم حنیف کے دین

کی پیروی کرو۔

والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئك ھم المتقون (زمر: ۳۴)

اور جو سچائی کو لیکر آیا اور اس سچائی کو سچ مانا وہی تو پرہیز گار ہیں۔

اس آخری آیت میں ''سچائی'' سے مراد خدا کی شریعت یا کتاب ہے مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پرہیز گاروں کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہیں، ہر سچی بات کو قبول کرتے ہیں اور اپنے قول اور عمل میں سچائی کو پیش کرتے ہیں۔

اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ جب خدا اور اس کے رسولوں کے وعدوں کو سچا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں۔

ترجمہ: اور خدا اور اس کے رسول نے سچ کہا۔ (احزاب: ۳)

چونکہ رسول خدا سے علم پاتے ہیں، اس لیئے وہ بھی سچے ہوتے ہیں۔

وصدق المرسلون (یسین: ۴)

اور پیغمبروں نے سچ کہا۔

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبروں کا سب سے پہلا وصف ہے کیونکہ ان کی ساری باتیں، دعوی دلیلیں اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہوں تو ان کی پیمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے، اللہ تعالی نے کئی پیغمبروں کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے، سب سے پہلے تو خود ملت حنیف کے داعی حضرت ابراہیمؑ کو اس سے متصف فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے :

واذکر فی الکتب ابراھیم انہ کان صدیقا نبیا (مریم: ۳)

اور کتاب میں ابراہیم کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

ایک اور پیغمبر حضرت ادریسؑ کو بھی اللہ نے اس کو نامزد کیا ہے۔

واذکر فی الکتب ادریس انہ کان صدیقا نبیا(مریم:۳)

اور کتاب میں ادریس کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے نبی تھے۔

حضرت مریمؑ جنہوں نے اللہ کی باتوں کے سچ ماننے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کیا' اس وصف سے ممتاز ہوئیں' فرمایا گیا۔

وامہ صدیقہ(مائدہ:۱)

اور ان (عیسٰی) کی ماں بڑی سچی تھیں۔

حضرت یوسفؑ جو خواب کی تعبیر میں ایسے سچے نکلے' بندوں کی زبان سے صدیق کہلائے۔

یوسف ایھا الصدیق (یوسف:۶)

یوسف! اے بڑے سچے!

حضرت اسماعیلؑ نے اپنے باپ سے صبر وشکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا' تو خدا سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) خطاب پایا۔

واذکر فی الکتب اسماعیل انہ کان صادق الوعد وکان رسولا نبیا(مریم:۴)

اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر' بے شبہ وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا ہوا نبی تھا۔

خدا کی خوشنودی والی جنت جن لوگوں کو ملے گی ان میں وہ بھی ہوں گے جو دنیا میں دوسری صفتوں کے ساتھ سچائی اور راست بازی سے ممتاز تھے۔

الصبرین و الصدقین (ال عمران:۲)

صبر کرنے والے اور سچے۔

خدا نے جن لوگوں کے لیئے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدہ کیئے ہیں' ان میں

اسلام وایمان اور خدا کی فرمان برداری کے بعد پہلا درجہ سچوں اور راست بازوں کا ہے فرمایا:

ان المسلمین و المسلمات و المئومنین و المئومنات والقنتین والقنتت و الصدقین و الصدقت۔(الایہ)

بے شک اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتیں' ایمان لانے والے مرد اور عورتیں' اور فرمانبردار مرد اور عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں۔۔۔۔

اعداللہ لھم مغفرہت و اجرا عظیما(احزاب:۵)

خدا نے ان کیلئے مغفرت اور بڑی مزدوری رکھی ہے۔

اور سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی میں ملے گا' اور وہ ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی۔قیامت کی نسبت ہے۔

ھذا یوم ینفع الصدقین صدقھم(مائدہ:۱۶)

یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو ان کا سچ کام آئے گا۔

اس امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا' اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائے گا' چنانچہ فرمایا:

لیجزی اللہ الصدقین بصدقھم (احزاب:۳)

تا کہ اللہ سچے اترنے والوں کو ان کی سچائی کا عوض دے۔

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا گیا ہے بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو' سچوں ہی کی جماعت سے علاقہ اور رابطہ رکھو' اور ان ہی کی صحبت میں رہو کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے ہو' کعبؓ بن مالک اور ان کے دو ساتھیوں نے جو تبوک کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہ جا سکے تھے ہر قسم کی تکلیفیں سہہ کر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا' اس کی طرف اشارہ کر کے خدا فرماتا ہے:

یایھا الذین امنوا اتقو اللہ و کونوا مع

لیئے ایسا نہیں کرتا' ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع وخضوع ظاہر ہوتا ہے اس کے باطن میں وہ خشوع وخضوع نہیں ہے اس لیئے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں صادق نہیں' اس زبان کی سچائی بھی ضروری ہے' اسی لیئے جن مسلمانوں نے غیر متزلزل ایمان کے بعد خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے' خدا نے فرمایا:

انما المؤمنون الذین امنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا و جاھدوا باموالھم و انفسھم فی سبیل اللہ اولئک ھم الصدقون۔ (حجرات: ۲)

مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا شک وشبہ) نہیں کیا' اور اللہ کے راستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا' یہی سچے لوگ ہیں۔

یہ سچے اسی لیئے ٹھہرے کہ ان کا یہ عمل ان کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا' زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا عمل سے اس کی تصدیق کر دی۔

اس صدق عملی کے کئی مرتبے ہیں' ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے اس میں کسی قسم کا ضعف وتردد نہ پیدا ہو مثلاً ایک شخص احکام الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے' لیکن جب اس کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے' اس لیئے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے' اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومن کامل ہو منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے کیونکہ عدم یقین کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں' چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ویقول الذین امنوا لولا نزلت سورۃ فاذا انزلت سورۃ محکمۃ و ذکر فیھا القتال رایت الذین فی قلوبھم مرض ینظرون الیک نظر المغشی علیہ من الموت فاولی لھم طاعۃ وقول معروف فاذا

عزم الامر فلو صدقوا اللہ لکان خیرا لھم۔ (محمد: ۳)

اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سورت نازل ہو پھر جب کوئی سورت اترتی ہے' اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو (اے پیغمبر) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو۔ تو ان پر تف ہو (رسول کی) فرمانبرداری چاہئے اور صاف و صحیح جواب دینا چاہئے اور جب بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ خدا سے سچے ہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدق عملی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول و قرار کیا جائے اور جس قول و قرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے اس کو وقت پڑنے پر پورا بھی کر دکھایا جائے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کرنے اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ ہو' لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اس میں ضعف ظاہر ہو اس لیئے صحابہ کرام میں جن لوگوں نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم کو پورا کر دکھایا' خدا نے ان کو سچا کہا ہے۔

چنانچہ حضرت انسؓ بن نضر کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کی تلافی کے لیئے انہوں نے کہا اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جانبازی کے جوہر دکھاؤں گا' چنانچہ اس کے بعد غزوہ احد میں شریک ہوئے اور نیزے تلوار اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی' ایفائے عزم کی یہ بہترین مثال تھی اسی لیئے خداوند تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی: (۱)۔

من المئومنین رجال صدقوا ما علھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا لیجزی اللہ الصادقین بصدقھم ویعذب

المنفقين ان شاء او يتوب عليهمط ان الله كان غفورا رحيما(احزاب:۳)

مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ خدا کے ساتھ انہوں نے (جانثاری کا) جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے سو (بعض تو) ان میں سے ایسے تھے جو اپنی پوری کر گئے (یعنی شہید ہوئے) اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو شہادت کے منتظر ہیں اور انہوں نے اپنی بات میں ذرا بھی تو ردوبدل نہیں کیا' تا کہ اللہ تعالیٰ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے' اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہئے یا ان کو معاف کر دے (۱)۔ بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

صدق عملی کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا حرف' دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق وصداقت کا پورا مظہر ہو جائے' قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدیق کہا ہے' ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہیں عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار' اور یقین کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں بعض بعض صحابیوں کے حالات میں اس کیفیت کا ذکر آتا ہے' ایک بار ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ ''میں خدا پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہوں'' آپ نے کہا کہ سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے تو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ بولے ''میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے' اس لیئے رات کو جاگا کرتا ہوں (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں (روزہ) گویا میں علانیہ عرش الٰہی کو دیکھ رہا ہوں گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہل جنت باہم مل جل رہے ہیں' گویا میں دوزخیوں کو واویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں' ارشاد ہوا کہ ''تم نے جان لیا' اسی پر قائم رہو۔(۲)۔''

(۱)۔یعنی ان منافقوں کو توبہ کی توفیق ہو اور وہ آگے چل کر سچے مومن بن جائیں تو

نیکی یہی نہیں کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیکی تو ان کی ہے جو اللہ اور روز آخرت اور فرشتوں اور (آسمانی) کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور مال اللہ کی حب پر رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا' اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں (دیا) اور نماز پڑھتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے' اور جب (کسی بات) کا اقرار کر لیا تو اپنے قول کے پورے اور تنگی اور تکلیف میں اور ہل چل کے وقت میں ثابت قدم رہے' یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے اور یہی ہیں پرہیز گار۔

ان آیتوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے ان کی تین قسم کے اوصاف بتائے گئے' اول ان کے ایمان کا کمال' دوسرے ان کے نیک عمل اور تیسرے جانچ میں انکا ہر طرح پورا اترنا' اور جو لوگ عمل اور علم کے ان تمام فضائل کے درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں ان کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا' صدیق کہتے ہیں (۲)۔' جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے مرتبہ کمال ہے' چنانچہ آیت ذیل میں نبی کے بعد ہی صدیق کا نام لیا گیا ہے' اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہمرہی کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہے۔

(۱)۔ترمذی ابواب الزھد۔ (۲)۔ مجمع البحار صدیق وہ ہے جس کے قول کی تصدیق عمل سے ہو۔

ومن یطع اللہ والرسول فاولئك مع الذین انعم اللہ علیھم من النبین والصدقین والشھدآء والصلحین وحسن اولئك رفیقا۔(نساء: ۹)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (جنت میں) ان (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیئے یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور (دوسرے) نیک

بندے اور یہ لوگ (کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں۔

سورۂ حدید میں ایمان کامل اور جانی و مالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے:

والذین امنوا باللہ ورسلہ اولئک ھم الصدیقون (حدید: ۲)

اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہوسکتا یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ''انسان سچ بولتے بولتے صدیق ہو جاتا ہے'' اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا' بلکہ اس کے لیئے صداقت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کی وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے زبان کی سچائی' دل کی سچائی اور عمل کی سچائی اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہوتو وہ کامل راست باز اور صادق ہے۔

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہیں اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں اپنا حق کسی کو معاف کرنا۔ اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا اپنی ضرورت کا خیال کیئے بغیر دوسرے کو دینا' اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا دوسرے کے لیئے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا' اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا' اپنی آبرو کو خطرہ میں ڈال دینا' اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا' دوسروں کو بچانے کے لیئے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا۔ یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں' جن کے امتیاز کے لیئے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنوں کو گھیرے' اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیموں کو محیط ہے اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کے کچھ اوصاف بتائے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے ومما رزقنھم ینفقون۔ (بقرہ:۱) اور ہم نے ان کو روزی دی اس میں سے کچھ (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

بعض اہل تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہاں جس طرح روزی کی تخصیص نہیں کی گئی' کہ کیا دی گئی پھل کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز اسی طرح اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دینے کی صورت کی بھی تعین نہیں کی گئی' خدا نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے اس کو اس میں سے اس شخص کو دینا چاہئے جس کو یہ نہیں ملا یا ضرورت سے کم ملا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے اس میں سے کچھ ان کو دینا جو اس سے محروم رہے ہیں یا جو اس کے محتاج ہیں۔ متقیوں کی نشانی ہے اور اسی کا نام اخلاق

رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید وفروخت سے حاصل ہوسکتا ہے' نہ دوستی ومحبت سے' اور نہ سعی وسفارش سے کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں بلکہ میری ہی دی ہوئی ہے خرچ کر کے خدا کی رحمت اور دوستی کو خرید لو کہ اس دن یہی کام آنے والا ہے۔

خدا کی راہ میں جو سخاوت کی جائے ضروری ہے کہ اس میں خلوص نیت ہو۔ اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنون احسان بنانا ہو اور نہ اس کا اولاہنا ہو' خود رسول کو فرمایا ولا تمنن تستکثر۔ (مدثر) (اور احسان نہ دھر کہ زیادہ بدلہ چاہئے) اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری خدا دے گا' اور قیامت کے غم وملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا۔ ارشاد ہے:

الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ ثم لا یتبعون ما انفقو امنا ولا اذی لھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (بقرہ:۲۶۲)

جو اپنی دولت خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' پھر اس کے خرچ کے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ اولاہنا دیتے ہیں ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس دھری ہے اور نہ ان کو ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دناعت ظاہر ہوتی ہے۔ فرمایا گیا:

یایھا الذین امنوا انفقوا من طیبت ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض ولا یتمموا الخبیث منہ تنفقون ولستم باخذیہ الا ان تغمضوا فیہ ط (بقرہ:۲۶۷)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو' اس میں سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیئے زمین سے نکالا اچھی چیزیں خرچ کرو' اس میں سے بری چیز کے دینے کا قصد نہ کرو

کہ تم دیتے ہو' حالانکہ تم اب اس کو لینے والے نہیں۔ مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں میچ لو۔

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو' اس کا دینا بھی پسند کرو جب تک ایسا نہ کرو گے' اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی ہے اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آ سکتا

صاف فرمایا:

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون وما تنفقوا من شئی فان اللہ بہ علیم۔(آلعمران: ۱۰)

ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک تم اس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو پسند ہے' اور جو بھی تم خرچ کرو خدا جانتا ہے۔

یعنی خدا دل کے حال سے خبردار ہے۔ کس نیت سے اور کس قسم کا مال تم دے رہے ہو' اس کی حقیقت اوروں سے چھپی رہے۔ مگر اس سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے' اور اسی لیئے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے' اور اس طرح نیکی کے کام میں جو تم دیتے ہو اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا۔ دنیا میں تو اس طرح کہ جماعتی کاموں کی مضبوطی اور جہاد اور محتاجوں کی مدد میں جو کچھ دیتے ہو اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے' جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو' اور دین میں تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملے گا جو کرے گا' فرمایا:

وما تنفقوا من خیر فلانفسکم وما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللہ وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون۔(بقرہ: ۲۷۳)

اور جو بھی تم نیکی میں خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی لیئے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کے لیئے اور جو بھی تم خرچ کرو وہ تم کو پورا دے دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی۔

اور اسی لیئے کہ دنیا میں جو کچھ دے گا وہ آخرت میں اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر

دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے' اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے۔

من ذاالذی یقرض اللہ قرضا حسنا فیضعفہ لہ اضعافا کثیرا (بقرہ: ۲۴۵)

کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض' تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گنا کرے۔

من ذاالذی یقرض اللہ قرضا حسنا فیضعفہ لہ ولہ اجر کریم (حدید: ۱۱)

کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض' تو وہ اس کو اس کے واسطے دونا کرے' اور ہے' اس کے لیئے عزت کی مزدوری۔

آگے چل کر پھر فرمایا:

ان المصدقین والمصدقت واقرضوا اللہ قرضا حسنا یضعف لھم ولھم اجر کریم۔ (حدید: ۱۸)

بیشک خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھا قرض' ان کو دونا دیا جائے گا اور ان کے لیئے عزت والی مزدوری ہے۔

کہیں حکم کی صورت میں ہے:

و اقرضوا اللہ قرضا حسنا۔ (مزمل: ۲۰)

اور اللہ کو اچھا قرض دو۔

قرض حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لیئے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے اور اس کے بدلہ میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو۔ نہ اس پر احسان دھرا جائے' نہ اس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو۔ بنی اسرائیل سے خدا نے جن باتوں کا عہد لیا تھا اور ان کو قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے' ان میں نماز اور ایمان کے

اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس
کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین' تیار ہوئی ہے پرہیزگاروں
کے واسطے جو خوشی اور تکلیف (دونوں حالتوں) میں خرچ
کرتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کو جو خدا کی راہ میں کیا جائے' ایک مثال دی ہے جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گنا کیونکر ہوگا' دور ہو جاتا ہے۔ فرمایا:

مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل
حبہت انبتت سبع سنابل فی کل سنبلہت
مائہت حبہتط واللہ یضعف لمن یشائط واللہ
واسع علیم (بقرہ:۲۶۱)

ان کی مثال جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک
دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیں اگتی ہیں۔ ہر بال میں سو
دانے ہوتے ہیں اور اللہ جس کے لیئے چاہتا ہے بڑھا دیتا
ہے اور اللہ کشائش والا ہے سب جانتا ہے۔

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے بن جاتا ہے' ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑوں دانے پیدا کر لیتا ہے' خدا گنجائش اور کشائش والا ہے' ان کے ہاں ایک کا سو بن جانا مشکل نہیں اور وہ جانتا بھی ہے کہ کسی نے کتنی اچھی نیت سے یہ دیا ہے اسی رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان کو خوشنودی کے لیئے اچھی نیت سے اپنا مال دیتے ہیں۔ ایک اور مثال دی ہے:

ومثل الذین ینفقون اموالھم ابتغاء مرضات اللہ
وتثبیتا من انفسھم کمثل جنہت بربوہت اصابھا
وابل فاتت اکلھا ضعفین فان لم یصبھا وابل فطلط
واللہ بما تعملون بصیر۔ (بقرہ:۲۶۵)

اور ان کی مثال جو اپنا مال خدا کی خوشنودی چاہنے کے لیئے

اور اپنے کو پکا کرنے کو دیتے ہیں' ایک باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو' اس پر مینہ پڑا تو اس نے اپنا پھل دونا دیا' اور اگر مینہ نہیں پڑا تو اوس ہی پڑی اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔

اس مثال میں ٹیلہ کی اونچی صالح زمین سے اچھی نیت بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا' اور پھل سے ثواب مراد ہے' تو جیسے باغ کسی اچھی زمین میں پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے ایسے ہی اچھی نیت سے خدا کی راہ میں جو دیا جائے وہ ایک کے بدلہ میں سو سو ہو جاتا ہے' اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے' اس لیئے ہماری نیتوں کے بھید سے بھی آگاہ ہے۔

اس داد و دہش اور جود و سخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورۂ واللیل میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:

(۱) فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنی فسنیسرہ للیسری (لیل: ۱)

(۱) تو جس نے (راہ خدا میں) دیا اور پرہیز کیا' اور اچھی بات کو مانا تو ہم اس کے لیئے (نیکی کی) سچ بات کا راستہ آسان کریں گے۔

(۲) وسیجنبھا الاتقی' الذی یوتی مالہ یتزکی' وما لاحد عندہ من نعمہ تجزی' الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلی' ولسوف یرضی (لیل: ۱)

اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ پرہیزگار بچایا جائے گا۔ جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے' بلکہ اپنے پروردگار برتر کی خوشی کے لیئے اور وہ خوش ہو جائے گا۔

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہ خدا میں دینے کی عادت' اطاعت و عبادت یا نیک کاموں کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا

ہے' یہ اس نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے دوسری آیت کتنی ہے کہ ایسے متقی پر جو داد و دہش کا عادی ہے' دوزخ کی آگ حرام ہے' مگر شرط یہ ہے کہ اس جود و سخا کا سبب دنیاوی' ناموری یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو' بلکہ مقصود صرف خدا ہو اور یہ ہو کہ مال و دولت کے میل سے اس کا دامن دل پاک ہو جائے' تو خدا فرماتا ہے تو خدا بھی اس کے عمل کا وہ بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا۔ اس دوسری آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل میں پاکیزگی آتی ہے۔

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے' دنیا کے اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے' اسی لیئے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلوں کے اسی میل کو دھونا چاہا اور جود و سخا اور داد و دہش کی برملا تعریف' اور جمع مال حرص و طمع اور بخل کی بہت مذمت کی اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ اس کے پیرووں کے دلوں سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کے لیئے جاتی رہے۔

ویل کل ھمزہ لمزہ۔ نالذی جمع مالا وعددہ یحسب ان مالہ اخلدہ۔(ہمزہ: ۱)

پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے عیب کرنے والے پر جس نے دولت اکٹھی کی' اور اس کو گن گن کر رکھا' سمجھتا ہے کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا رکھے گی۔

ایک اور آیت میں مال کی محبت پر کافروں کو طعنہ دیا ہے۔

وتحبون المال حبا جما(الفجر: ۱)

اور تم مال و دولت سے بہت ہی محبت رکھتے ہو۔

یہی محبت سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں

نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی' اور میرا مال خرچ ہو جائے گا اسی وسوسہ شیطانی کو خدا نے انفاق (خدا کی راہ میں دینا) کے سلسلہ میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

الشیطن یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشاء واللہ یعدکم مغفرہ منہ وفضلا واللہ واسع علیم۔ (بقرہ:۲۶۸)

شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے اور تمہیں بے حیائی کی بات (بخل) کو کہتا ہے' اور خدا تم سے اپنی طرف سے گناہوں کی بخشائش اور فضل و کرم کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ کشائش والا ہے' جاننے والا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے عمل اور علم کا ہر بند خزانہ کھل جاتا ہے' حکمت کا یہ خزانہ اس وقت تک کسی کو نہیں ملتا جب تک اس کے دل سے دنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے' اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے اس اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا:

یئوتی الحکمت من یشاء ویئوت الحکمت فقد اوتی خیرا کثیرا ط (بقرہ:۲۶۸)

وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہئے اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی اس کو بڑی دولت ملی۔

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائیں گے' اس کا سراسر دھوکا ہے اور خدا کا یہ وعدہ کر دینے سے اس کے فضل و کرم کا دروازہ کھلے گا درست ہے' بہت بڑی دانائی کی بات ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ مال و دولت کی محبت ایک آزمائش ہے اس آزمائش میں پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے' پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچا وہی مراد کو پہنچا' کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لیئے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگانا ہے جس کے پاؤں

اس بازی میں ٹھہر گئے وہی بامراد اور جس کے اکھڑ گئے وہ نامراد رہا۔

انما اموالکم و اولادکم فتنۃ ط واللہ عندہ اجر عظیم' فاتقوا اللہ ما استطعتم واسمعوا او اطیعوا وانفقوا خیرا لانفسکم ط ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون' ان تقرضوا اللہ قرضا حسنا یضعفہ لکم واللہ شکور حلیم۔(تغابن: ۲)

تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ ہے' اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری ہے' تو اللہ سے ڈرو' جتنا ہو سکے اور اس کی باتوں کو سنو اور مانو' اور (راہ خدا میں) خرچ کرو اپنے لیئے بھلائی کرو اور جو اپنی جان کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض تو وہ اس کو تمہارے لیئے دونا کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ (نیکی کی) قدر پہچانتا ہے اور (برائی کا بدلہ لینے میں) بردبار ہے۔

ان آیتوں میں انفاق اور کار خیر میں دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے' قوموں کی ترقی کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کاموں میں لگاتی اور افراد میں بانٹتی رہیں' یعنی جماعت کے کاموں ور کمائی کے ناقابل یا کمائی سے محروم افراد کی مدد میں اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی۔ اور تمول بھی برائیوں سے لوگ بچے رہیں گے' اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کاموں کے کرنے سے ہچکچایا نہ کریں گے اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہیں۔

۱۔ میری چیز ہے میں دوسروں کو کیونکر دوں۔

۲۔ دوسروں کو دوں گا تو مال میں کمی ہو جائے گی' جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہوگی۔

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونوں وسوسوں کا خاتمہ کر دیا ہے' اس نے یہ بتایا اور اپنے پیروؤں کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت میں میرا تیرا کسی کا نہیں وہ صرف خدا کا ہے' وہی اس کا مالک ہے' اسی کی چیز ہے اور اسی کی راہ میں دی جانی چاہئے۔

وما لکم الا تنفقوا فی سبیل اللہ وللہ میراث السموات والارض (حدید: ۱)

اور تم کو کیا ہوا ہے جو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

بخل کی برائی میں کہا:

ولا یحسبن الذین یبخلون بما اتھم اللہ من فضلہ ھو خیرا لھم بل ھو شر لھم سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیمۃ ط وللہ میراث السموت والارض۔ (آلعمران: ۱۸۰)

اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں' جس کو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے' قیامت کے دن ان کے گلے میں اس کا طوق ڈالا جائے گا جس کا بخل کیا تھا اور آسمانوں کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

ذرا ذرا سے فرق سے قرآن پاک میں بیسیوں جگہ یہ آیت ہے۔

وللہ مافی السموت والارضط

اور خدا ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔

اسی طرح بیسیوں مقام پر تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے:

لہ ملک السموت والارض۔

آسمانوں اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی) اسی کی ہے۔

منافقوں نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی مالی

امداد وہ نہ کریں' تا کہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہیں' وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائیں اور اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی اور ساتھ ہی منافقوں کے اس زعم باطل کی اسلام کا سرمایہ ان کے دینے سے ہوگا' تردید کی' فرمایا:

هم الذين يقولون لا تنفقوا على من عند رسول الله حتى ينفضوا ط ولله خزآئن السموت والارض ولكن المنفقين لا يفقهون۔(منافقون)

وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں' کہ خدا کے رسول کے پاس جو لوگ ہیں ان پر خرچ نہ کرو' تا کہ وہ (ا)۔ چھوڑ کر الگ ہو جائیں اور اللہ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے اور لیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغ نبوی ﷺ کی کل چل رہی ہے ان کے بل بوتے سے ہے خدا نے فرمایا یہ سارا خیال غلط ہے' آسمان اور زمین کے خزانہ میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے وہ جہاں سے جس کو چاہے جو چاہے دے دے' دوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا۔ فرمایا:

له مقاليد السموت والارض يبسط الرزق لمن يشاء ويقدر ط انه بكل شيء عليم۔(شوریٰ: ۲)

اسی کے پاس ہیں آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں پھیلا دیتا ہے روزی جس کے لیئے چاہے اور ناپ دیتا ہے' وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے۔

یہ حقیقت ظاہر ہے کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونوں انسان کی جانچ کے دو برابر راستے ہیں' اگر ایک ہی انسان کی فیاضی' مال کے عدم محبت' ایثار اور جذبہ شکر کا امتحان ہے' تو دوسرے میں انسان کی قناعت پسندی بے طمعی اور جذبہ صبر کی آزمائش ہے' فرمایا:

فاما الانسان اذا ما ابتله ربه فاكرمه ونعمه فيقول ربي

اکرمن و اما اذا ما ابتلیہ فقدر علیہ رزقہ فیقول ربی اھانن ط کلا۔ (فجر)

سو آدمی جو ہے جب اس کا مالک اس کو جانچے، پھر اس کو عزت دے اور نعمت دے، تو وہ کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے عزت دی، اور جب اس کو جانچے تو اس کی روزی اس پر تنگ کرے۔ تو کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا، یہ کوئی بات نہیں۔

غرض روزی کی کشائش اور تنگی دونوں خدا کے کام ہیں اور مصلحت سے ہیں دولت مند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھی میں کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی یا مجھی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چاروں طرف سمٹی آ رہی ہے مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لیئے کافی ہے، مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہیں، قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچ کر اس کی غلطی بتائی ہے۔

فاذا مس الانسان ضر دعانا ثم اذا خولنہ نعمۃ منا قال انما اوتیتہ، علی علم ط بل

سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آ لگے تو ہم کو پکارے، پھر جب ہم اپنی طرف سے اس کو کوئی نعمت دیں تو کہے کہ

---

(۱)۔یہاں تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔ (۲)۔ اس کا ایک مطلب تو اہل تفسیر نے یہ لیا ہے کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا اور دوسرا یہ کہ دولت کے حصول کے طریقوں کا مجھے ہنر معلوم تھا اس دوسرے مطلب کی تائید سورۂ قصص میں قارون کے قصہ والی آیت سے ہوتی ہے۔ (دیکھو روح المعانی جلد ۲۰ صفحہ ۱۱ مصر ۱۲) چنانچہ قارون کو جب راہ خدا میں خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی تو اس نے بھی یہی کہا تھا قال انما اوتیتہ عندی (قصص:۷۸) قارون نے کہا یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے جو میرے پاس ہے۔

هی فتنہت ولکن اکثرھم لا یعلمون۔ قد قالھا الذین من قبلھم فما اغنی عنھم ما کانوا یکسبون فاصابھم سیات ما کسبوا والذین ظلموا من ھٰؤلاء سیصیبھم سیات ما کسبوا وما ھم بمعجزین اولم یعلموآ ان اللہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدرط ان فی ذلک لایت لقوم یئومنون۔(زمر:۵)

یہ تو مجھے (۲) علم پر ملا ہے (خدا فرماتا ہے) بلکہ یہ تو جانچ ہے، مگر بہتیرے اس کو نہیں سمجھتے، یہی بات ان کے پہلوں نے کہی تھی۔(۳) تو ان کو ان کی یہ کمائی کام نہ آئی، اور جو کمایا تھا اس کی برائیاں ان پر پڑیں اور جو ان میں سے گنہگار ہیں ان پر بھی ان کی کمائی کی برائیاں پڑنے والی ہیں، وہ تھکا نہیں سکتے کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی روزی جس کے لیئے چاہتا ہے، پھیلاتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) ناپ کر دیتا ہے، اس میں ایمان والوں کے لیئے البتہ نشانیاں ہیں۔

ہر جاندار کی روزی خدا کے ذمہ ہے، اس کا یقین انسان کو آ جائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اس کے لیئے آسان ہو جائے اسلام نے انسانوں کو یہی یقین دلایا ہے، خدا نے فرمایا:

وما من دآبہت فی الارض الا علی اللہ رزقھا ویعلم مستقرھا و مستودعھا کل فی کتب مبین۔(ہود:۱)

اور کوئی چلنے والا نہیں زمین میں مگر یہ کہ اس کی روزی خدا پر ہے وہ جانتا ہے جہاں اس کو ٹھہرنا ہے (یعنی دوزخ یا بہشت) اور جہاں اس کو سونپا جاتا ہے (یعنی قبر) سب (علم الٰہی) کھلی کتاب میں موجود ہے۔

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی میں سے جو کچھ دوسرے کو مل جاتا ہے وہ تقدیر میں اسی کا حصہ تھا' اس لیئے درحقیقت وہ ہمارا تھا ہی نہیں' اسلام نے اپنے پیروؤں کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لیئے ان یقینات کو مسلمانوں کے ریشہ ریشہ میں رچا دینا چاہا ہے وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے خدا تعالیٰ پوچھتا ہے:

ومن یرزقکم من السماء والارض ء الہ مع اللہ (نمل:۵)

اور تم کو کون روزی دیتا ہے' آسمان سے اور زمین سے' اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے۔

روزی دینا اسی کا کام ہے۔

ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین۔(ذاریات: ۵۸)

بے شبہہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے' زور آور' مضبوط۔

احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طرح طرح کے پراثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے' فرمایا ''تم باندھو نہیں' ورنہ تم پر باندھا (۱)۔ جائے گا' یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منہ بند کرو گے اور دوسروں کو نہ دو گے' تو خدا بھی اپنی تھیلی کا منہ بند کر لے گا اور تم کو نہیں دے گا' ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا ''تم میں سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے؟ لوگوں نے کہا ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے' فرمایا ''تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اس نے آگے بھیجا' اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال (۱)۔ ہے۔'' ایک دفعہ آپ نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی الھکم التکاثر (تم کو مال و دولت و ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت میں ڈال دیا) پھر فرمایا آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال! اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلایا' یا کھالیا تو اس کو فنا کر چکا اور پہن لیا تو اس کو پرانا کر چکا۔ (۳)۔

فرمایا ''اے ابوذرؓ! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو' اور تیسرے دن تک اس میں سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے' مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں' میں کہوں گا کہ اس کو خدا کے بندوں میں ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو۔'' پھر فرمایا ہاں جن کے پاس یہاں ہے' ان کے پاس وہاں قیامت میں کم ہوگا' لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے دائیں بائیں پیچھے بانٹ دو۔(۱)۔

فرمایا رشک دو ہی پر روا ہے' ایک اس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے تو ہاتھوں سے اس کو صحیح مصرف (حق) میں لٹا رہا ہے دوسرے اس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اس کے مطابق بتا رہا ہے (۲)۔اور سکھا رہا ہے۔

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اس میں جس کا مصرف صحیح نہ ہو یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو' اسراف اور فضول خرچی ہے جس کی برائی قرآن پاک میں آئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی۔

یہ بھی سخاوت نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے' اور جب موت سامنے آ کر کھڑی ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں' قرآن پاک نے آدمی کی اس کی اس بے بسی کا نقشہ کس پر اثر انداز میں کھینچا ہے اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے۔

وانفقوا من رزقنکم من قبل ان یاتی احد کم الموت فیقول رب لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق و اکن من الصلحین۔(منفقون:۲)

اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آنے لگے تو کہے کہ اے میرے مالک تو نے مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیکوں میں ہو جاتا۔

خدا نے اس کے جواب میں فرمایا:

ولن یئوخر اللہ نفسا اذا جاء اجلھا واللہ خبیر بما تعملون۔ (منفقون: ۲)

اور خدا ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دے گا جب اس کا وقت آ جائے اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو۔

اس لیئے کو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ کونسا صدقہ سب سے بڑا ہے فرمایا کہ تم صدقہ کرو اور تم تندرست ہو مال کی خواہش ہو اور جینے کی بھی امید ہو اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آ جائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو حالانکہ وہ اب (تمہارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا۔ (۳)۔

فرمایا ''اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لیئے بہتر اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لیئے برا ہے۔''

---

(۱)۔صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی صلعم مالی لی مثل احد ذھبا۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب العلم۔ (۳)۔ صحیح مسلم ۱ صفحہ ۳۰۱ مصر باب بیان افضل الصدقہ۔

عفت و پاکبازی

عفت و پاکبازی ان ساری اخلاق خوبیوں کی جان ہے، جن کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، اسی لیئے اسلام نے اس کو ان اخلاقی محاسن میں گنایا ہے، جو مسلمانوں کے چہرہ کا نور ہیں، چنانچہ سورۂ مومنون میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہیں، ان میں اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے۔

والذین ھم لفروجھم حفظون الا علی ازواجھم او ماملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذلک فاولئک ھم العدون۔ (مئومنون: ۱)

اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرمگاہوں کی پاسبانی کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیوں) سے تو ان پر کچھ الزام نہیں، لیکن جو اس کے علاوہ کے طلبگار ہوں تو وہی لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔

سورۂ معارج میں مسلمانوں کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے ان میں ایک عفت اور پاکبازی بھی ہے، فرمایا:

والذین ھم لفروجھم حفظون (معارج: ۱)

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔

جن مسلمانوں کے لیئے خدا نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے ان میں وہ بھی ہیں جو عفیف اور پاک دامن ہیں۔

والحفظین فروجھم و الحفظت (احزاب: ۵)

اور اپنی شرمگاہوں کی پاسبانی کرنے والے مرد اور پاسبانی کرنے والی عورتیں۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوگا کہ عفت اور پاک دامنی کے لیئے قرآن کی اصطلاح ''حفظ فروج'' ہے۔ حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہیں، اور فروج اپنی معنی میں ایک مجازی استعمال ہے، کتنے لفظ ہیں جو شرم کے قابل ہی بے پرواہ ہو

گئے فروج کے اصلی معنی دو چیزوں کے درمیان خلا کے ہیں اور اس لیئے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہیں جدھر سے دشمنوں کے حملہ کا ڈر ہو۔ اس بنا پر یہ انسانوں کے اعضا میں سے اس خلا کا نام ہے جو ان کے دونوں پاؤں کے بیچ میں ہے' اور جدھر سے دشمنوں کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو' اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو۔ اس طریقہ تعبیر سے اندازہ ہوگا کہ عفت و پاکبازی کا جو تخیل ان لفظوں کے اندر پیوست ہے وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے۔

عفت و پاکبازی کے لیئے قرآن کا دوسرا لفظ احصان ہے جو حصن سے بنا ہے' جس کے معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں۔ اس سے حصان' احصان' محصن اور محصن۔ الفاظ بنائے گئے ہیں۔ پہلا لفظ قرآن میں نہیں آیا مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے' اس کے معنی پاکدامن عورت کے ہیں' دوسرے کے معنی حفاظت میں لینے یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں' یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے' دو دفعہ حضرت مریمؑ کی حفاظت و پاکدامنی کے بیان میں' ماضی معروف کے صیغہ میں:

ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجھا(تحریم:۲)

اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا۔

والتی احصنت فرجھا فنفخنا فیھا من روحنا(انبیاء:۲)

اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ شوہر نے اس کو اپنے نکاح میں لا کر اپنی حفاظت میں لے لیا' لونڈیوں کے بیان میں ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح میں آ کر بدکاری کریں تو ان کی سزا کیا ہے' فرمایا:

فاذا احصن (نساء:۴)

تو جب وہ نکاح کی قید میں آ چکیں۔

اسی سے اس کا اسم فاعل محصن (حفاظت میں لانے والا) اور اسم مفعول محصنہت (حفاظت میں لائی گئی) نکاح کے سلسلہ میں قرآن میں آیا ہے:

محصنین غیر مسافحین (نساء: ۴)

حفاظت میں لانے والے نہ مستی نکالنے والے۔

محصنت غیر مسفحت (نساء: ۴)

حفاظت میں آنے والیاں نہ مستی نکالنے والیاں۔

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے، حیوانی خواہش رفع کرنا نکاح کا مقصد نہیں، اسی لیئے قرآن پاک میں اس کے علاوہ محصنت (حفاظت میں رکھی ہوئی بیبیاں) دو معنوں میں آیا ہے کہ ایک بیاہی عورتوں کے معنی میں، جیسے:

والمحصنت من النساء (نساء: ۴)

اور بیاہی عورتیں (یعنی جو عورتیں کسی نکاح میں ہیں وہ دوسرے مرد پر حرام ہیں۔)

دوسرے شریف آزاد بیبیوں کے معنی میں جیسے:

ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنت المئومنت (نساء: ۴)

اور جس کو تم میں سے مسلمان شریف و آزاد بیویوں کے نکاح کا مقدور نہ ہو (تو مسلمان باندی سے نکاح کرے۔)

عورتوں کی عصمت کے بیان میں قرآن پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے۔

حفظت للغیب۔ (نساء: ۴)

پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں۔

یعنی اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کرتی ہیں۔

اسلام میں عفت اور پاکبازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوت و رسالت کا لازمی جز ہے، نبی

نبی کے سلسلہ نسب اور نبی کے اہل بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے حضرت عیسیٰؑ کی ماں حضرت مریمؑ کی نسبت یہود نے جو بہتان باندھا تھا' قرآن نے اس کی تردید کی اور ان کی عصمت اور پاکدامنی کی شہادت دی اور دو موقعوں پر اس شہادت کی تصریح کی:

و مریم ابنت عمران التی احصنت فرجھا (تحریم: ۲)

اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔

والتی احصنت فرجھا فنفخنا فیھا من روحنا (انبیاء: ۲)

اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

حضرت یوسفؑ نے جس پاکبازی کا ثبوت دیا' اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی۔

ولقد راودتہ عن نفسہ فاستعصم ط (یوسف: ۴)

اور میں نے اس کو اس سے چاہا تو وہ بچا رہا۔

خدا نے فرمایا میں نے ایسا اس لیئے کیا:

لنصرف عن السوء والفحشائط انہ من عبادنا المخلصین۔ (یوسف: ۳)

تا کہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کریں' وہ بے شبہہ ہمارے چنے بندوں میں تھا۔

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتوں سے پاک رکھے جاتے ہیں۔

حضرت یحییٰؑ کی تعریف میں فرمایا گیا:

وسیدا وحصورا نبیا من الصلحین (آل عمران: ۴)

اور سردار ہوگا اور اپنی قوت شہوانی پر ضبط رکھتا ہوگا اور نبی ہوگا صالحوں میں سے۔

اسلام میں اہل بیت نبوی ﷺ کی زندگی، جس عفت، عصمت اور پاکبازی کی تصویر تھی، غیب کے دانائے راز نے اس کی گواہی ان لفظوں میں دی۔

اولئك مبرءون مما يقولون لهم مغفرة ورزق كريم (نور: ۳)

یہ لوگ تہمت سے پاک ہیں، ان کے لیئے بخشائش ہے اور عزت والی روزی۔

عصمت و پاکدامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان میں فاحشہ آیا ہے، جس کے معنی بہت بڑی برائی کے ہیں، جیسے:

الا ان یاتین بفاحشة مبینة (نساء: ۳)

مگر یہ کہ وہ عورتیں کھلی برائی کریں۔

والتی یاتین الفاحشة من نسائکم

اور تمہاری عورتوں میں سے جو کھلی برائی کریں۔

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں مسلمانوں کو اس برائی سے روکا گیا ہے۔

ولا تقربوا الزنی انه کان فاحشة وساء سبیلا۔ (بنی اسرائیل: ۴)

اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک یہ بڑی برائی اور برا چلن ہے۔

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے، یہ نہیں فرمایا کہ ''تم زنا نہ کرنا'' بلکہ یہ کہا کہ ''تم زنا کے قریب نہ جانا۔'' اس طرز ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعل بد ہی سے بچنے کی تاکید کی بلکہ اس سے قریب ہو کر گزرنے کی بھی ممانعت کی، اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے اس کی تقریب اور

تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے یا بے حیائی کے ارادہ سے دیکھنا' تنہائی میں ملنا جلنا' بے وجہ اس کے بدن کو چھونا یا اور کسی طرح سے ان کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا' یا دوسرے غیر شریفانہ حرکات کرنا' ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے۔

---

(۱) اس کا یہ منشا نہیں کہ قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ اس معنی میں آیا ہے بلکہ وہ لغت کی رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے۔

اسی لیئے اسلام نے ان ساری باتوں کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہیں حرام قرار دیا' مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے' مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو اپنی نظریں نیچی رکھیں۔

قل للمئومنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم ط ذلك ازکی لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون۔ (نور: ۴)

اے پیغمبر! ایمان والوں سے کہہ دے کہ وہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں' یہ ان کے لیئے بڑی ستھری بات ہے' اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

عورتوں کی ذرا سی بے باکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے اس لیئے ان پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئیں' مثلاً یہ کہ وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں' غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائیں' اپنے زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں' اسی لیئے زمین پر ہولے چلیں یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں' سینہ کا پردہ رکھیں' باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں' باہر نکلنے میں خوشبو نہ ملیں' بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ چلیں مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں' مرد و عورت مل جل کر نہ بیٹھیں' کسی

عورت سے کوئی تنہائی میں نہ ملے' اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے' یہ تمام باتیں درحقیقت لاتقربوا الزنی (زنا کے قریب بھی نہ ہو) کی شرح ہیں فرمایا:

وقل للمئومنت یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن او ابائھن او ابآء بعولتھن او ابنائھن او ابنآء بعولتھن او اخوانھن او بنی اخوانھن او بنی اخواتھن او نسآءھن او ما ملکت ایمانھن او التابعین غیر اول الاربۃ من الرجال او الطفل الذین لم یظھروا علی عورات النسآء ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن وتوبوآ الی اللہ جمیعا ایھا المئومنون لعلکم تفلحون۔ (نور: ۳۱)

اور اے پیغمبر! ایمان والی بیبیوں سے کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کریں اور بناؤ سنگھار کھول کر نہ دکھائیں مگر جو طبعًا کھلا رہتا ہے (۱)۔ اور اپنی اوڑھنی اپنے گریبانوں (یعنی سینوں کے مقام) پر ڈال لیں' اور اپنا سنگار نہ کھولیں مگر اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے یا اپنے شوہر کے باپ' یا اپنے بیٹیوں' یا اپنے شوہر کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں' یا اپنے بھتیجوں' یا اپنے بھانجوں یا اپنی عورتوں (۲)۔ یا اپنے غلاموں یا اپنے ان مرد نوکروں کے آگے جن کو غرض نہیں یا ان لڑکوں کے آگے جو عورتوں کے رمزے سے ابھی آگاہ نہیں' اور نہ مسلمان عورتیں اپنے پاؤں سے دھک دیں کہ جس سنگار کو وہ چھپاتی ہیں ان کا پتہ لگ جائے اور تم سب مل کر اے مسلمانوں خدا کے آگے توبہ کرو شاید تم بھلائی پاؤ۔

(۱)۔ جیسے آنکھوں کا سرمہ' ہاتھوں کی مہندی (یا) انگلیوں کی

انگوٹھی' اس لئے چہرہ ہتھیلیاں اور قدم ستر میں داخل نہیں۔ (۲)۔ یعنی سہیلیاں اور خادمائیں اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے۔ (روح المعانی ۱۲)

اور حسب ذیل ادب گو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے مگر عام کیلئے اس میں پیروی کا نمونہ ہے۔

یـنـسـاء الـنـبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن فلا تـخـضـعـن بالقول فیطمع الذی فی قلبه مرض وقلن قـولا مـعـروفـا وقـرن فـی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیـهت الاولی۔(احزاب:۴)

اے پیغمبر کی بیویو! تم نہیں ہو جیسی ہر کوئی عورت' اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو' سو تم دب کر (مرد سے) بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے' وہ خواہش کرے (۱)۔ اور نیک بات کہو' اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو اور جیسے نادانی کا پہلے زمانہ میں دستور تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار کر کے دکھاتی نہ پھرو۔

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے۔

یـایـهـا الذین امنوا لا تدخلوا بیوت النبی الا ان یوذن لکم۔ الایـهت(احزاب:۷)

اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں اس کے بدوں کہ تم کو اجازت دی جائے (کھانے کی دعوت کے لیئے) داخل نہ ہو۔

گویا حکم یہاں خاص واقعہ سے متعلق ہے' مگر حکم کا منشا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھروں کے ساتھ خاص نہیں' چنانچہ عفت و پاکدامنی کے سلسلہ میں سورۂ نور میں اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھروں کی نسبت بھی ہے۔

یـایـهـا الـذین امنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا و تسلموا علی اهلها ذلکم خیر لکم

لعلکم تذکرون۔(نور: ۴)

اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا اور دوسرے گھروں
میں نہ جایا کرو، جب تک خبر نہ کرلو، اور ان کے گھر والوں کو
اسلام نہ دے لو، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں شاید تم یاد رکھو۔

کوئی غیر مرد اور اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہئے کہ پردہ کے اوٹ سے مانگے، یہ نہیں کہ دھڑ دھڑا کر اندر گھس جائے چنانچہ کاشانہ نبوی ﷺ کے تعلق سے حکم ہوتا ہے:

واذا سالتموھن ورآء حجاب ذلکم اطھر لقلوبکم وقلوبھن۔(احزاب:۷)

اور جب تم مانگنے جاؤ ان بیویوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو
پردہ کے اوٹ سے، اس میں تمہارے اور ان کے دلوں کی
بڑی ستھرائی ہے۔

یہ حکم گو شان نزول کے لحاظ سے ازواج مطہرات کے سلسلہ سے ہے، مگر اس میں عام مسلمان گھروں کے لیئے بھی حسن ادب کا ایک نمونہ ہے۔

مسلمان عورتیں جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لیں، تا کہ ان کی زیبائش وآرائش کا ہر نقش راہ چلتوں کی آنکھوں سے اوجھل رہے، اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بیبیاں ہیں ان کو چھیڑنا تو کجا ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے فرمایا:

---

(۱)۔یعنی تم سے جرأت کر کے تمہارا خواہاں ہو۔(۲)۔لسان العرب

یایھا النبی قل لا زواجك وبنتك ونسآء المئومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذلك ادنی ان یعرفن فلا یئوذین، وکان اللہ غفورا رحیما۔ لئن تم ینتہ المنفقون والذین فی قلوبھم مرض والمرجفون فی المدینہ لنغرینك بھم ثم لا یجاورنك فیھا الا

قلیلا۔(احزاب:۸)

اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں نیچی لٹکائیں اس سے یہ ہوگا کہ وہ پہچان پڑیں گی (کہ یہ شریف ہیں) تو ان کو ستایا نہ جائے اللہ بخشنے والا مہربان ہے اگر اس پر بھی منافق اور جن کے دلوں میں (بے حیائی) کا روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے نہ رکیں تو ہم تجھے ان پر بھڑکائیں گے پھر وہ نہ رہنے پائیں گے اس شہر میں تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن۔

ان آیتوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے جو مسلمان بیبیوں کو جو خاص خاص ضرورتوں کے لیئے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں چھیڑتے تھے' اور جب انہیں اس پر ڈانٹا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لونڈی سمجھتے تھے' اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لیئے اللہ تعالی نے دونوں کو دو حکم دیئے' شریروں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئیں تو انہیں کافی سزا دی جائے بلکہ ان کو شہر بدر کیا جا سکتا ہے اور مسلمان بیبیوں کیلئے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھر سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشاک وضع الگ رکھیں' اس کے لیئے صورت یہ بتائی کہ جب گھر سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں' جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس' زیور اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائیں' اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بیبیاں ہیں' جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے لونڈیوں سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا۔(۱)۔اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے' مدینہ کا ایک ممتاز منافق

عبداللہ ابن ابی بن سلول اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا' مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے' عورتیں بناؤ سنگار کر کے گھر سے نکلا کرتی تھیں' سینوں کی پوشش کا لحاظ نہیں کرتی تھیں بدکار عورتیں شراب کی محفلوں میں ساقی گری کرتی تھیں' اسلام نے آ کر ان مراسم کی اصلاح کی بدکاری کے انسداد اور عفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کیلئے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا جائے چنانچہ اس پر یہ آیت اتری:

ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء ان اردن تحصنا لتبتغوا عرض الحیوبت الدنیا ومن یکرھھن فان اللہ من بعد اکراھھن غفور رحیم۔(توبہ:۴)

اور تمہاری لونڈیاں کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہیں تو ان سے دنیا کی زندگی کے عارضی فائدہ کیلئے زبردستی بدکاری نہ کرایا کرو اور جو ان کو اس پر مجبور کرے گا تو ان کی بےبسی کے پیچھے اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

---

(۱)۔تفسیر سورئہ تفسیر سورئہ نور صفحہ ۹۳ مصر و صحیح مسلم و سنن ابی داؤد۔ (۲)۔ سبعہ معلقہ میں طرفہ کے قصیدے کا یہ شعر پڑھئے۔

دحیب قطاب الحبیب منھا رفیقہ
بجس الندامی بنتہ المتجرد

اس لیئے اسلام نے اس کو حرام کمائیوں میں سے قرار دیا ہے(۱)۔اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لیئے یہ اچھا نہیں سمجھا ہے کہ ایسی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے' کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہوا زہر آلودہ ہو جاتی ہے' سنن ابی داؤد (کتاب النکاح) میں ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس

کی اجازت چاہی، وہی الٰہی نے ان کی اس درخواست کا یہ جواب دیا۔

الزانی لا ینکح الا زانیۃ او مشرکۃ و الزانیۃ لا ینکحھا الا زان او مشرک وحرم ذلک علی المئومنین۔(نور: ۱)

بدکار مرد، بدکار ہی عورت یا مشرکہ عورت سے نکاح کرے گا، اور بدکار عورت سے بدکار ہی مرد یا مشرک نکاح کرے گا۔ ایمان والوں پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے۔

اس آیت میں انسانی فطرت کی تصویر ہے کہ بدکار عورتوں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لیئے نکاح کا خیال بدکار ہی مردوں کے دل میں آ سکتا ہے، اسی لیئے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا:

الخبیثت للخبیثین و الخبیثون للخبیثت و الطیب للطیبین و الطیبون للطیبت۔(نور:۳)

گندی عورتیں، گندے مردوں کے لیئے ہوتی ہیں، اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیئے، اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیئے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیئے۔

اسی لیئے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاکباز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں بلکہ بعض علماء کے نزدیک سرے سے جائز (۱) نہیں اور ان کی دلیل سورۂ نور کی اوپر والی آیت کے علاوہ اس حدیث سے ہے جس کو ابوداؤد اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس پر زنا ثابت ہو اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہو اس کا نکاح ایسے ہی کیا جائے۔(۳)۔

---

(۱)۔صحیح مسلم باب تحریم مطل الغنی و غیرہ ۱۲ (۲)۔ جمہور کے نزدیک زانی کا غیرزانیہ سے، یا زانیہ کا غیرزانی سے قانوناً نکاح درست ہے لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے اور اس آیت سے اس کی جو حرمت ظاہر سمجھی جاتی ہے، اس سے مراد اس کی برائی ہے، یا

یہ کہ اہل ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسوں سے نکاح کریں یا انکحوا الایامی منکم اور فانکحوا ما طاب لکم من النساء سے منسوخ ہے یا مخصوص ہے لیکن بعض صحابہ اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے' اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے بلکہ اگر زن و شوہر میں سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا۔ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں بھی فیصلہ کیا' ابوداؤد کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے بعض فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زن و شوہر میں کفو ہونا شرط ہے' اور چونکہ عفیف بدکار کا کفو نہیں ہو سکتا' اس لیئے یہ نکاح فریقین میں سے جو عفیف ہے اس کے اعتراض کے بعد قائم نہیں رہ سکتا' ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی' توبہ کرنے کے بعد جائز ہے۔ (دیکھو احکام القرآن جصاص رازی و تفسیرات احمدیہ ملاجیون و تفسیر کبیر رازی اور روح المعانی' تفسیر آیت مذکورہ۔) (۳)۔ ابوداؤد کتاب النکاح۔

غرض اہل ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاکبازی ہے' ان کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آنا چاہئے چنانچہ سورۂ فرقان میں خدا نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے' ان کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں! جو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے' جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے' اور بدکاری نہیں کرتے' فرمایا:

والذین لا یدعون مع اللہ الھا اخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا یزنون۔(فرقان:٦٨)

اور جو خدائے برحق کے ساتھ کسی اور خدا کو نہیں پکارتے' اور کسی ایسی جان کا جس کو خدا نے منع کیا ہے' خون نہیں بہاتے اور بدکاری نہیں کرتے۔

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے' جس کا انکار سراسر کفر ہے اس کے بعد جو دو باتیں ہیں ان میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے' اور دوسری عزت و آبرو سے۔

قرآن پاک میں عفت وعصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں، جن کا بیان اوپر آیا ہے، اور جو حقیقت میں لا تقربوا الزنا (بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ) کی تشریحیں ہیں، ان کی مزید تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عام احکام اور مواعظ میں بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک صحابی کو فرمایا کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے، مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہیں (۱)۔ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ ایک دفعہ باریک کپڑوں میں سامنے آئیں تو فرمایا کہ اے اسماء جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلوں کے سوا اسکے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہیں (۲)۔ حکم دیا کہ مخنث زنان خانوں میں نہ جانے پائیں (۳)۔ فرمایا کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو کہ اس کے اہل خانہ کی بے ستری (۴)۔ ہو۔ فرمایا کہ ''عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے۔ (۵)۔'' سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گزرنے والوں میں تحریک پیدا کرے گی، یہ بھی ارشاد ہوا کہ عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ (۶)۔ چلے تاکہ مردوں کی بھیڑ بھاڑ اور دھکوں سے بچے، یہ بھی تاکید فرمائی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکیلا نہ جائے کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے، یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے، اگر کسی گھر کے دروازے بند نہ ہوں یا ان پر پردہ پڑا نہ ہو، اور کوئی اندر گھس گیا تو اس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے۔ (۸)۔

یہ ساری ہدایتیں اس لیئے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاکدامنی کی تصویر ہو۔

---

(۱)۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی نظرہ الفجاء۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب اللباس باب فیما یبدی المراہ زینتہا۔ (۳)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحکم فی المخنثین۔ (٤)۔ ترمذی کتاب

الاستیذان قبالتہ البیت۔ (۵)۔ ابوداؤد کتاب الرجل باب فی المراہ تطیب الخروج۔ (۶)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق۔ (۷)۔ مسلم کتاب السلام باب تحریم الخلوہ بالا جنبیتہ والدخول علیھا۔ (۸)۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالتہ البیت۔

لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ ان کیلئے جو سوسائٹی کی عزت و حرمت کو خطرہ میں ڈالیں، شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی، تا کہ ان کا خوف لوگوں کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے۔

الزانیہت والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائہت جلدہت (نور: ۱)

بدکاری کرنے والی عورت، اور بدکاری کرنے والے مردان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

احادیث میں بیا ہے مردوں اور عورتوں (۱)۔ میں سے جو بدکاری میں پکڑ کر آئیں ان کو سنگ سار کرنے کا بھی حکم ہے، اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے اس لیئے قرآن پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لی جائے ان میں ایک یہ بھی ہو کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کریں گی، فرمایا:

ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یاتین ببھتان یفترینہ بین ایدھن وارجلھن۔ (ممتحنہ: ۲)

اور وہ بدکاری نہ کریں گی، اور نہ اپنی اولاد کو مار ڈالا کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں بہتان باندھ کر لایا کریں گی۔

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے عورتوں سے لی گئی حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی طرف اشارہ (۲)۔ ہو یا یہ بات بھی

عدم قتل کے عموم میں داخل ہو' اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ ان میں سے کس کا لڑکا ہے' بعض عورتیں دوسرے کے بچہ کو اپنا بنا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپتی تھیں' یہ ساری باتیں عفت اور پاکدامنی کے خلاف تھیں۔ اس لیئے ان سے باز رکھا گیا اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں' فتح مکہ کے وقت آپ ﷺ نے قریشی بیویوں سے اور مدینہ میں انصاری خاتونوں سے بھی اس پر عہد لیا (۳)۔ بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا' اور صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان پر بیعت (۴)۔ کی۔

دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لیئے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے' اگر پیش نہ کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون کے جھوٹ بدنام کرنے کے جرم میں اسی کوڑے مارے جائیں گے' اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہوگی' اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہوں تو مرد قسم کھائے ورنہ عورت قسم کھائے کہ یہ الزام غلط ہے' اور اگر دونوں اپنے دعووں پر قائم رہیں تو اسلام میں دستور یہ رہا ہے کہ اپنے دعویٰ کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے۔ (۵)۔

---

(۱)۔ یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی۔ (۲)۔ مفسرین میں صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گزرا ہے۔ (۳)۔ صحیح بخاری فتح مکہ۔ (٤)۔ بخاری کتاب الایمان باب حلاوہ ایمان۔ (۵)۔ اس کی تفصیل سورئہ نور میں ہے اس کے بعد نکاح توڑنے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہیں مگر شروع سے عملدرآمد اسی پر رہا ہے بخاری باب اللعان۔

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے اور حقوق عباد میں

کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے۔

اسلام میں زانیوں کی سزا بعض حالتوں میں سو کوڑے مارنا اور بعض حالتوں میں سنگ سار کرنا ہے' لیکن ان کو آخرت میں جو عذاب دیا جائے گا' وہ اس سے بہت زیادہ عبرت انگیز ہے' ایک روحانی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت سے لوگوں کے اخروی عذاب کی دردناک صورتیں دکھائی دیں' ان میں بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے فعل قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا۔ جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس میں بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتیں تھیں جب اس کے شعلے بلند ہوتے تھے' تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ ان کے اندر سے نکل آئیں گے' لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے۔ (۳)۔ یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس کے بخلاف پاکباز اور پاکدامن لوگوں کے فضائل بھی نہایت موثر انداز میں بیان کیئے گئے ہیں۔

---

(۱)۔ بخاری کتاب الادب باب قتل ابولد خشیته ان یاکل۔ (۲)۔ بخاری کتاب الحدود باب الزنا و شراب الخمر۔ (۳)۔ بخاری کتاب الجنائز۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جبکہ خدا کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ خداوند تعالیٰ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ (۱)۔

یہ تو وہ شرف ہے جو پاکبازوں کو آخرت میں حاصل ہوگا لیکن پاکبازی کی دینوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں۔ ایک حدیث میں آپ نے زمانہ قدیم کے تین آدمیوں کا قصہ بیان کیا ہے' جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے' کہ دفعتہً پانی برسنے لگا' تینوں نے

پانی سے بچنے کے لیئے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی' سو اتفاق سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہوگیا۔ اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمال صالحہ کے واسطے سے خدا سے دعا کریں' چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا۔ ان میں پاکباز آدمی کی دعا یہ تھی ''خداوندا! میری ایک چچازاد بہن تھی جس سے میں بڑی محبت رکھتا تھا میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا' لیکن جب تک میں اس کو سو دینار نہ دے دوں وہ راضی نہ ہوئی میں نے سو دینار کما کر جمع کیئے اور اس کو دیکر اپنی خواہش نفسانی پوری کرنی چاہی' لیکن اس نے کہا خدا سے ڈرو میں فوراً رک گیا۔ خداوندا! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے صرف تیری مرضی کے لیئے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹا لے چنانچہ وہ سرک گیا۔ (۲)۔

یہ روایت عفت و پاکبازی کو ان اعمال میں شامل کرتی ہے' جن سے خدا کا قرب ملتا اور دعا کو مقبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

---

(۱)۔ بخاری کتاب الحدود باب فصل من ترك الفواحش۔ (۲)۔ بخاری کتاب الادب باب اجابته دعا من بر والدیه۔

دیانتداری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایماندر ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو اس کو پوری دیانت سے رتی رتی دے دے اس کو عربی میں امانت کہتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوع انسانی کے سپرد کیا ہے' امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

انا عرضنا الامانۃ علی السموت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا۔(احزاب: ۹)

ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی' تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا' بے شبہ وہ ظالم اور نادان ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک خدائی امانت ہے جو ہم انسانوں کے سپرد ہوئی ہے' اس لیئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کریں' اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو خائن ٹھہریں گے۔

خدا کا فرشتہ جو خدا کا پیغام لے کر اس کے خاص بندوں پر اترتا تھا' امانت سے متصف ہوتا تھا' تاکہ بندوں کے لیئے جو حکم خدا کی جانب سے آئے وہ کمی بیشی کے بغیر خدا کا اصلی حکم سمجھا جائے' اسی لیئے قرآن میں اس فرشتہ کا نام ''الامین'' رکھا گیا ہے۔

نزل بہ الروح الامین (شعراء: ۱۱)

اس پیغام کو لے کر امانت والی روح اتری۔

مطاع ثم امین۔(تکویر: ۱)

اس کا کہا مانا جاتا ہے وہاں امانت والا ہے۔

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا۔

ان لکم رسول امین (شعراء: ۱۰)

میں تمہارے لیئے امانت دار قاصد ہوں۔

یعنی خدا سے جو پیغام مجھے ملا ہے وہ بے کم و کاست تم کو پہنچاتا ہوں اس میں اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہیں ہے۔

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت سے پہلے مکہ والوں کی طرف سے ''امین'' کا خطاب ملا تھا' کیونکہ آپ ﷺ اپنے کاروبار میں دیانتدار تھے' اور جو لوگ جو کچھ آپ کے پاس رکھواتے تھے وہ آپ ﷺ جوں کا توں ان کو واپس کرتے تھے۔

نیک عمل مسلمانوں کی صفت یہ بتائی گئی۔

والذین ھم لا منتھم و عھدھم راعون (مومنون: ۱)

اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کے پاس رہتی تھی جو فتح مکہ کے وقت وہ ان کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی۔ اس پر یہ آیت اتری:

ان اللہ یامرکم ان تئودو الامنت الی اھلھا۔ (نساء: ۸)

بے شبہ تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیا کرو۔

اس حکم کے مطابق یہ امانت ان کو واپس کی گئی' انہوں نے جب پوچھا تو حضرت علیؑ نے فرمایا کہ خدا نے یہی حکم دیا ہے وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔

(۱)۔بہر حال یہ واقعہ صرف شان نزول کا حکم رکھتا ہے' اور معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا۔ اسی لیئے اہل تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانت الٰہی بھی داخل ہے جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیف شرعی (۲)۔ ہے اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل و انصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں' جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے جائیداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں' بلکہ ہر مالی' قانونی' اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے' اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے' اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے' کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کا چھپانا بھی امانت ہے کسی مجلس میں آپ ہوں' اور کچھ باتیں دوسروں کے متعلق سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے' کسی نے آپ سے اپنے کسی نج کے کام میں مشورہ مانگا تو اس کو سن کر اپنے تک محدود رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے' اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے' اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے نوکر ہے اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتا ہے' یا بے سبب سستی کرتا ہے' یا دیر سے آتا ہے اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔

قرآن پاک اور حدیثوں میں ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے۔

ان مسلمانوں میں جن کو خدا نے فلاح پانے کی خوشخبری سنائی ہے' وہ بھی ہیں۔

والذین ھم لا منتھم و عدھم راعون (مئومنون: ۱)

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول وقرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔

پھر جن مسلمانوں کو جنت میں عزت کی جگہ دی جانے والی ہے ان میں بھی وہ داخل ہیں۔

والذین ھم لامنتھم و عدھم راعون (معارج: ۱)

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول وقرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔

اگر کسی نے کسی کی کوئی چیز دھرنے کو دی یا سفر میں گواہ وشاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لیکر گروی رکھی۔

فلیئود الذی اوتمن امانتہ و الیتق اللہ ربہ۔(بقرہ: ۲۸۳)

تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہئے کہ اپنی امانت ادا کر دے اور چاہئے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔

---

(۱)۔تفسیر کشاف زمخشری۔ (۲)۔ ایضاً۔ (۳)۔ تفسیر ابن جریر طبری۔

یعنی لے کر مکر نہ جائے' یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے' یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے' یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں' کہ انہیں چیزوں کا نام خیانت ہے جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے۔

وتخونوا امانتکم و انتم تعلمون (انفال: ۲۷)

اور اپنی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔

حضرت موسیٰؑ نے مدین کے سفر میں دو لڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لیئے پانی بھر دیا' اور اس کی کوئی مزدوری ان سے نہیں مانگی' اور ان لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی' اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجئے' تو اس موقع پر قرآن پاک کی یہ آیت ہے:

یـابـت استـاجـره ان خیـر مـن استـاجرت القوی الامین۔ (قصص:۳)

اے میرے باپ اس کو نوکر رکھ لیجئے سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانتدار ہو۔

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لیئے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اس کی اہلیت کا ثبوت دے اور اس کو پوری دیانتداری کے ساتھ انجام دے اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو وہ ایک دو گھنٹہ سستی سے چھپے چوری بیکار بیٹھا رہے تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے لیکن اسلام کی دور رس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کی خلاف ہے۔

حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کی رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں۔

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ خدا کی امانت کا بوجھ انسان نے اٹھایا ہے اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رازدار حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو باتیں سنی تھیں۔ ایک تو آنکھوں سے دیکھ چکا دوسری یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ امانتداری لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے (یعنی ان کی فطرت ہوتی ہے) پھر انہوں نے کچھ قرآن جانا کچھ سنت سے سیکھا (یعنی فطری امانت کے جوہر میں کسب اور اچھی تعلیم سے ترقی ہوتی ہے) حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں

کہ پھر آپ ﷺ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا' فرمایا ''پھر یہ حال ہوگا کہ آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی' اور اس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائے گا' جو اٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا' لوگ ایسے ہو جائیں گے کہ لین دین کریں گے' لیکن کوئی امانت داری نہیں کریں گا' اس وقت امانتداری کی مثال ایسی کمیاب ہو جائے گی کہ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانتدار شخص ہے' آدمی کی تعریف ہوگی کہ کیسا عقلمند' کیسا خوش مزاج' اور کیسا بہادر ہے حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری (۱)۔ نہ ہوگی۔

حدیث کے پہلے ٹکڑے میں انسانوں میں ایمانداری کا جوہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دینداری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے' اس کے بعد بری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے اور بتایا ہے کہ آخر زمانہ میں وہ ایسا ہی رہ جائے گا' جیسا آبلہ کا داغ رہ جائے۔

طبرانی کبیر میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا' جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس میں دین نہیں' اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے کسی بندہ کا اس وقت تک اس کا دل درست نہ ہوگا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو' اور اس کی زبان درست نہ ہوگی جب تک اس کا دل درست نہ ہوگا اور جو کوئی کسی ناجائز کمائی سے کوئی مال پائے گا اور اس میں سے خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہیں دی جائے گی اور اگر اس میں سے خیرات کرے گا تو قبول نہیں ہوگی اور جو اس میں سے بچ رہے گا وہ اس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہوگا۔ بری چیز بری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی' البتہ اچھی چیز اچھی کا کفارہ ہوتی ہے۔ (۲)۔

حدیث کی کئی کتابوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جس

میں امانت نہیں' اس میں ایمان نہیں ۔(۳)۔'' اور یہ ظاہر ہے کہ کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہئے کہ اپنی رائے ایمانداری سے دے' ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے مشورہ کیا تو آپ ؐ صلعم نے فرمایا ''جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے (۴)۔' اسی لیئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجلس میں جو باتیں ہوں وہ امانت ہیں' یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بننا چاہئے' الا یہ کہ اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا المجالس بالامانت ۔یعنی نشستیں امانت کے ساتھ ہوں' مگر تین موقعوں پر کہیں کسی (۵)۔ کے ناحق قتل کی۔ یا کسی کی آبروریزی کی' یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو' تو متعلقہ لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا چاہئے۔

' کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف بلکہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں وہ بھی ایسے راز جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی (۶)۔ ہے راز کے یہی معنی نہیں ہیں' کہ جس کو کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے' بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً ادھر ادھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی (۷)۔ ہے' امانت میں خیانت کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے۔(۸)۔

---

(۱)۔صحیح بخاری باب رفع الامانتہ و کتاب الفتن و الرقاق و صحیح مسلم و مسند احمد ترمذی و ابن ماجہ۔ (۲)۔ کنز العمال ج ۲ صفحہ ۵ حیدر آباد از طبرانی کبیر عن ابی مسعودؓ۔ (۳)۔ کنزل العمال ج ۲ صفحہ ۱۵ از طبرانی اوسط و طبرانی کبیر وابن عدی فی الکامل و بیہقی فی شعب الایمان۔ (۴)۔ ادب المفرد بخاری باب

المستشار مؤتمن۔ (۵)۔ ابوداؤد کتاب الادب۔ (۶)۔ ابوداؤد کتاب الادب۔ (۷)۔ ابوداؤد کتاب الادب۔ (۸)۔ صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق۔

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو خدا کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے، لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے، یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ''عورتوں کے باب میں خدا سے ڈرو'' فرمایا'' کیونکہ تم نے ان کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت میں لیا ہے۔ (۱)۔''

قیامت کی نشانیوں میں آیا ہے کہ ''سب سے پہلے اس امت سے امانت کا جوہر جاتا رہے گا اور سب سے آخر میں جو چیز رہ جائے گی وہ نماز ہوگی اور کتنے نمازی ہیں جن کی نمازوں کا کوئی حصہ خدا کے ہاں نہیں (۲)۔ فرمایا میری امت اس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی، جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہیں (۳)۔ سمجھے گی، یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی اس کو آمدنی اور کار خیر میں دینے کو جرمانہ، جب تک مسلمان نہیں سمجھیں گے ان کی فطرتی صلاحیت باقی رہے گی۔

(۱)۔ صحیح مسلم حجتہ الوداع۔ (۲)۔ کنز العمال ج صفحہ ۱۵ از طبرانی و ابن مبارک و حکیم ترمذی و ابن عباسؓ۔ (۳)۔ کنز العمال ج ۲ صفحہ ۱۵ از سنن سعید بن منصور۔

فہرست

شرم وحیا

رحم

عدل وانصاف

عہد کی پابندی

احسان یعنی بھلائی کرنا

عفوودرگذر

حلم وبردباری

رفق ولطف

تواضع وخاکساری

خوش کلامی

ایثار

اعتدال اورمیانہ روی

خودداری یاعزت نفس

شجاعت اور بہادری

تعداد کی قلت وکثرت ::

موت کاوقت مقرر ہے ::

شہادت اورغزا کارتبہ ::

استقامت

حق گوئی

استغناء

رذائل

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

رذائل کے معنی ::

رذائل کے قرآنی نام ::

فحشا، منکر اور بغی ::

فحشاء کے معنی ::

منکر کے معنی ::

بغی کے معنی ::

اخلاق ذمیمہ برے کیوں ہیں ::

رذائل کی ترتیب ::

جھوٹ

جھوٹی قسمیں کھانا

وعدہ خلافی

خیانت اور بد دیانتی!

غداری اور دغابازی

بہتان

چغل خوری

غیبت اور بدگوئی

دو رخاپن

بدگمانی

مداحی اور خوشامد

بخل

حرص و طمع

بے ایمانی

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

چوری

ناپ تول میں کمی بیشی

چھپا کر لینا

رشوت

سود خواری

شراب خواری

غیظ و غضب

بغض و کینہ

فخر و غرور

ریاء

خود بینی اور خود نمائی

فضول خرچی

حسد

فحش گوئی

رذائل پر مختصر تبصرہ

آداب

فطری آداب

طہارت اور اس کے آداب

کھانے پینے کے آداب

آداب مجلس

آداب ملاقات

آداب گفتگو

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب

آداب سفر

آداب خواب

آداب لباس

آداب مسرت

آداب ماتم

متفرق آداب

آداب کا فلسفہ ::

حکمت ربانی کا چشمہ نور

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

شرم وحیا

انسان کا یہ فطری وصف ہے جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے' عفت اور پاکبازی کا دامن اسی کے بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصا ہے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مروت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے' اور بہت گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے۔

اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود خداوند تعالی ہے لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے جو اس کی ذات اقدس کے لائق ہیں مثلاً یہ کہ وہ اپنے بدکار بندوں کو برائی کرتے دیکھتا ہے' لیکن ان کو پکڑتا نہیں اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے' اس کو نامراد نہیں لوٹاتا۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''عزت اور جلال والے خدا کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ پھیلائی مانگتا ہے تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے (۱)۔ شرماتا ہے'' جب ایک دفعہ تین صاحب مسجد نبوی ﷺ میں آئے آپ ﷺ کے اردگرد صحابہؓ کا حلقہ تھا ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی اس میں بیٹھ گئے' دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے تیسرے صاحب چلے گئے' آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ان صاحبوں کو خبر نہ دوں؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ میں آ کر بیٹھا' وہ خدا کی پناہ میں آیا تو خدا نے پناہ کی جگہ دی' اور جو پیچھے جا کر بیٹھا' وہ شرمایا خدا نے بھی اس سے شرم کی (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا اس نے خدا سے منہ پھیرا (۲)۔ تو خدا نے بھی اس سے منہ پھیرا۔

ان اللہ لا یستحی ان یضرب مثلا ما (بقرہ: ۳)

خدا کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہیں۔

یعنی کسی حق کی بات کو ظاہر کرنے میں وہ شرماتا نہیں جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے:

واللہ لا یستحی من الحق۔ (احزاب:۷)

خدا حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔

حدیث میں بھی ہے:

ان اللہ لا یستحی من الحق۔

اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہیں۔

قرآن اور حدیث کے اس طرز ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی نسبت خدا کی طرف خدا کی غیرت و حیا کے خلاف ہے' حدیث میں آتا ہے کہ خدا سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لیئے اس نے بدکاریوں کو حرام کیا ہے۔ (۴)۔

(۱)۔بیہقی کتاب الاسماء والصفات ۱۲ (۲)۔ بخاری کتاب العلم و صحیح مسلم باب السلام۔ (۳)۔ بخاری کتاب الادب باب مالا یستحی من الحق۔ (٤)۔ صحیح مسلم کتاب التوبہ عربہ میں غیرت کا لفظ حیاء سے خاص ہے مگر اس موقع پر خدا سے اس کے معنی کچھ حیاء کے قریب قریب سے ہو جاتے ہیں غیر کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے ہیں' جو محبت میں شرکت نہیں چاہتی۔

موسیٰ علیہ السلام کو بدین کے سفر میں دو لڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا' وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں تاہم یہ وصف ان میں ایسا نمایاں تھا کہ خدا نے بھی اس کا ذکر کیا' ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر پلٹ جاتے وہ اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلاتی تھیں' تاکہ مردوں کی کشمکش سے الگ رہیں' اور جب ان کے باپ نے ان میں سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلانے کے لیئے بھیجا۔

فجاء تہ احدھما تمشی علی استحیاء (قصص:۳)

تو ان دو لڑکیوں میں سے ایک شرمائی ان کے پاس آئی۔

اس آیت میں واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح وستائش بھی مقصود ہے۔

یہ وصف انسان میں بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے اور اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے بلکہ بڑھتا جاتا ہے' اور اگر بری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگوں کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے' اسی لیئے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا' ستر عورت کا خیال' نگاہیں نیچی رکھنا بے حیائی کی باتوں کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا' برہنگی کو منع کرنا۔ یہاں تک کہ غسلخانہ اور خلوت میں بھی اس کی اجازت نہ ہے اسی لیئے کہ آنکھیں شرم کے منظر جھینپتی رہیں' اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی تو رفتہ رفتہ انسان پکا بے حیاء بن جائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بچہ تھے تو خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا' آپ ﷺ اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے۔ آپ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا تم تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو' کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے' آپ ﷺ نے ایسا کیا تو آپ ﷺ پر بیہوشی طاری ہوگئی ہوش آیا تو زبان مبارک پر تھا میرا تہبند' حضرت عباسؓ نے تہبند باندھ (۱)۔ دیا نبوت کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے ہیں:

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشد حیاء من العذراء فی خدرھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔

بعض موقعوں پر آپ ﷺ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی' مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے' جیسا کہ سورۂ احزاب میں مذکور ہے۔

ان ذلکم کان یئوذی النبی فیستحی منکم۔ (احزاب:۷)

تمہاری اس بات سے رسول کو ایذا پہنچی تھی تو تم سے وہ شرماتا تھا۔

حیا کا فطری وصف اگر چہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے' تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لیئے اس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے جب اس میں بزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے' اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم و حیا کی وجہ سے نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعض حالتوں میں اسے اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے' اس لیئے حیا کی حقیقت میں بزدلی کا جو جزو شامل ہے' شریعت مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے اور وہ یہ ہے کہ امر حق کے اظہار میں شرم و حیا دامن گیر نہ ہو' لیکن دوسروں کی مروت سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے جو ایک معنی میں تعریف کے قابل ہے' چنانچہ

(۱)۔بخاری کتاب الحج باب فضل مکہ و بنیانہا۔ (۲)۔ بخاری کتاب الادب باب الحیاء۔

قابل ہے' چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیادار تھا' اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا' اس کا بھائی اس پر ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو کیونکہ حیا ایمان سے ہے۔(۱)۔

یہی حیا جو ایمان کا ایک جز ہے شرعی حیا ہے' یعنی جس طرح ایمان کا اقتضا ئیہ یہ ہے کہ تمام فواحش و منکرات سے اجتناب کیا جائے اسی طرح حیا بھی انسانوں کو ان چیزوں سے روکتی ہے' اس لیئے وہ دونوں ایک ہی ہیں لیکن جن لوگوں میں فطرتاً حیا کا مادہ موجود ہوتا ہے' ان کو اس شرعی حیا کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے' اس لیئے بذات خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہیں بلکہ اصلاح کے قابل ہے' اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک اظہار حق' وعظ و پند تبلیغ و دعوت' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے' حیا کے طبعی ضعف کو دور کر دیا جائے اور شریعت کے ان موقعوں پر اسی ضعف کو دور کیا ہے مثلاً خدا نے قرآن مجید میں جا بجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ذکر کیا ہے جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالت شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے۔ خدا نے فرمایا کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندوں کے فائدہ

کی ہے تو اس کے کہنے سے خدا نہیں شرماتا یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہیں چھوڑ دیتا فرمایا:

ان اللہ لا یستحی ان یضرب مثلا ما بعوضۃ فما فوقھا(بقرہ:۳)

اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں (ذرا بھی) نہیں جھینپتا (چاہے وہ مثال) مچھر کی ہو یا اس سے بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی)

حضرت زینبؓ کی دعوت ولیمہ میں صحابہ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف تو ہو رہی تھی، لیکن فطری حیا کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے تاہم چونکہ لوگوں کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آداب نبوت کے خلاف تھا، اس لیئے خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

ان ذلکم کان یوذی النبی فیستحی منکم واللہ لا یستحی من الحق(احزاب:۷)

اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی، اور وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ (بات کے کہنے میں کسی کا کچھ) لحاظ نہیں کرتا۔

اپنی ذاتی تکلیف کے لیئے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوش خلقی اور مروت کے خلاف تھا۔ اس لیئے آپ ﷺ کو اس سے شرم آتی تھی۔ تاہم اس طرح بیٹھ جانا آداب مجلس کے خلاف تھا اس لیئے خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو ٹوکا کہ اخلاق وآداب کی تعلیم دینے میں شرم وحیا کا موقع نہیں۔

یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابہ کرام کو نہایت دلیر بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا۔ ایک صحابیہ آپ ﷺ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم وحیا کے خلاف ہے تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے

پہلے کہ دیتی ہیں کہ یا رسول اللہ! خدا حق بات سے نہیں شرماتا' کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہے۔

(۱)۔بخاری کتاب الادب باب الحیاء

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کی مثال ایک ایسے سبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی' اکابر صحابہ اس درخت کا نام بتانے سے قاصر رہے' حضرت عبداللہ بن عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے تاہم چونکہ کمسن تھے' اس لیئے شرم سے چپ رہے' لیکن چونکہ یہ شرم وحیا کا موقع نہ تھا' اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی اس لیئے جب حضرت عمرؓ سے انہوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس درخت کا نام بتادیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔(۱)۔

انصار یہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں' اور یہ ان کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

نعم النساء نساء الانصار لم یکن یمنعھن الحیاء ان یتفقھن فی الدین

انصار کی عورتیں کس قدر اچھی تھیں کہ دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو حیا نہیں روکتی تھی۔

ان موقعوں یعنی تبلیغ ودعوت' پند ونصیحت' ارشاد وہدایت' تعلیم وتعلم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور جگہ حیاء انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ پہنچتا ہے اس لیئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الحیاء ولا یاتی الا بخیر۔

حیاء سے صرف بھلائی پہنچتی ہے۔

اور جس شخص کو کسی برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا۔اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے کیونکہ یہی جذبہ حیاء ہے جو انسان کو برائیوں سے باز رکھتا ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیاء ہو کر انسان جو چاہئے کر سکتا ہے

کوئی روک نہیں سکتا اس لیئے فرمایا کہ :

ان مما ادرك الناس من كلام النبوبت الاولى اذا لم تستحى فاصنع ماشئت۔

لوگوں نے پرانے پیغمبروں کی جو باتیں پائی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں شرم وحیا نہیں تو جو چاہو کرو۔

امام نووی (۳)۔ نے اس حدیث کا دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے۔ کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو۔

قرآن وحدیث میں جہاں جہاں فحش' منکر اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہیں ان سے بے حیائی کے یہی سب کام مراد ہیں' اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیاء اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ہر ایک دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہے اور اسلام کا خاص خلق حیاء (۴)۔ ہے' یہ بھی فرمایا ہے کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں' اور حیاء بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔ (۵)۔ فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہاں تک کہ تنہائی کی حالت میں میں بھی شرم و حیاء کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہئے' یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ برہنگی سے بچو' کیونکہ تمہارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہیں جو صرف بول و براز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں تو ان سے شرماؤ اور ان کا خیال رکھو۔ (۶)۔

(۱)۔ بخاری کتاب الادب باب مالا یستحی من الحق للتفقه فی الدین ۲ مسلم کتاب استحباب استعمال المتیسلهت من الحیض فرصته من مسك فی موضع الدمر۔ (۲)۔ بخاری کتاب الادب باب الحیاء (۳)۔ بخاری کتاب الادب باب اذلم تستح فاصنع ماشئت۔ (٤)۔ فتح الباری ۱۰ صفحہ ٤٣٤ (٥)۔ موطا امام مالك كتاب الجامع باب ماجاء فی الحیاء (٦)۔ صحیح بخاری کتاب الایمان۔

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے' دنیا میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کیئے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں' ان کو کرید کر دیکھئے تو سب کی تہہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا جس کے دل میں اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہوگا۔ اس سے دوسروں کے ساتھ بے رحمی' ظلم سنگ دلی' اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے اسی لیئے اسلام کی اخلاقی تعلیم میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے' اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے وہ رحمان یعنی ''بڑا رحم والا'' ہے اسی کے ساتھ دوسرا نام ''رحیم آتا ہے'' یعنی رحم سے بھرا ہوا قرآن پاک میں پہلا نام ایک طرح سے خدا کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے۔ مسلمان کو حکم ہے۔ جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمان و رحیم خدا کا نام لے۔ ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہے دنیا میں جو کچھ ہے وہ خدا کی رحمت کے جلووں کے سوا کچھ اور نہیں ہے' خدا کے فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں۔

ربنا وسعت کل شی ء رحمتہ و علما (مومن: ۱)

اے ہمارے پروردگار تو نے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سما لیا ہے۔

اس رحمت الٰہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے بلکہ:

ھو الرحمن الرحیم ط (حشر: ۳)

وہی رحم والا مہربان ہے۔

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ دعاؤں میں کہیں۔

وانت خیر الراحمین۔

اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔

دنیا میں رحم وکرم کے جو آثار پائے جاتے ہیں، وہ اسی کی رحمت کے آثار اور پرتو ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''خدا نے رحمت کے سو ٹکڑے کیئے، جن میں سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لیئے اور زمین پر صرف ایک اتارا ایک ٹکڑے کو اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں، یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے۔(۲)۔''

بنی نوع انسان میں محاسن اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں کی ذات ہے، اور پیغمبروں میں سب سے اعلیٰ واشرف ہستی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے، اور خدا تعالیٰ نے آپ کو اسی وصف کے ساتھ متصف کیا ہے۔

(۱)۔ترمذی کتاب الاستیذان و الآداب باب ماجاء فی الاستتاء عند الجماع۔ (۲)۔ بخاری کتاب الادب۔

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمئومنین رئوف رحیم۔(توبه:۱۲۹)

(لوگو)! تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے ہیں تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر بہت شفیق اور رحیم ہیں۔

پیغمبروں کے بعد اگلے پیغمبروں کی امتیں ہیں، اور ان امتوں میں سے خداوند تعالیٰ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی امت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے۔

وجعلنا فی قلوب الذین اتبعوه رافهت ورحمهت۔(حدید:۲۷)

اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈالا دیا۔

اور اس وصف میں امت محمدیہ بھی ان کی شریک وسہیم ہے۔

والذین معه اشدآء علی الکفار رحماء بینهم۔(فتح:۲۹)

اور جو لوگ محمد ﷺ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر زور آور ہیں
آپس میں رحمدل ہیں۔

آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے' اس کو صلہ رحم کہتے ہیں' کیونکہ قرابتوں کے سارے رشتے رحم مادی سے پیدا ہوتے ہیں اور رحم رحم اور رحمان جو خدا کا نام ہے' ایک ہی اصل سے مشتق ہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمان) خدا کی رحمت کا پرتو ہے' اور اسی سے صلہ رحم کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہے' حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

الرحم شجنۃ من الرحمن (۱)۔
رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے۔

یعنی قرابت کی رحمدلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمان کی ذات ہے' اور ساری رحم دلیوں کے جذبے اس کی شاخیں ہیں بچوں کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے' حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک زانو پر مجھ کو ایک دوسرے زانوں پر امام حسنؓ کو بٹھا لیتے تھے' پھر دونوں کو ملا کر کہتے تھے کہ خداوندا ان دونوں پر رحم کر کیونکہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں۔ (۲)۔

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور لپٹانے لگا۔ آپ ﷺ نے یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ ''تم اس پر رحم کرتے ہو؟'' ہاں ارشاد ہوا کہ خداوند تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے' جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو' اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ (۳)۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بوسا لیا۔ اقرع بن حابس جو ایک درشت خو بدو تھے' پاس بیٹھے ہوئے تھے' بولے کہ میرے دس بچے ہیں۔ میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ''جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔''

(۱)۔بخاری کتاب الادب باب من وصل وصله الله ۱۲ (۲)۔ بخاری کتاب الادب باب وضع الصبی علی۔ (۳)۔ ادب المفرد باب رحمته العیال۔

ایک اور بدو نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ لوگ بچوں کو چومتے ہیں' لیکن ہم لوگ نہیں چومتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ "خدا نے جب تمہارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے۔(۱)۔"

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹوں پر ترس کھانا امت محمد ﷺ کا ایک عنصر ہے' اس لیئے فرمایا کہ "جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے (۲)۔" اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹوں اور زیردستوں پر کھایا جاتا ہے۔ تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹوں تک نہیں' بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹوں تک وسیع ہے۔

خود اپنی قوم کی ہمدردی' محبت اور امانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے' اسی لیئے قرآن مجید نے صحابہ کرام کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے۔ رحماء بینھم (یعنی وہ لوگ آپس میں (رحمدل ہیں)

اور حدیث میں اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال میں بیان کیا گیا ہے' یعنی یہ کہ مسلمانوں کی باہمی رحمدلی و باہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد دکھ پہنچتا ہے تو تمام بدن متاثر ہو جاتا ہے۔ (۳)۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جذبہ رحم نے اخلاقی و معاشرتی حیثیت سے مسلمانوں کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہیں اور انفرادی طور پر مسلمانوں کے تمام افراد اس جسم کے اعضاء اور جوارح ہیں۔ اس لیئے جس طرح ایک عضو کے درد دکھ میں تمام بدن شریک ہو جاتا ہے' اسی طرح ایک مسلمان کے درد دکھ میں تمام مسلمانوں کو شریک ہونا چاہئے۔

اسلام نے جس رحمدلی کی تعلیم دی ہے وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ

اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس میں تمام بنی نوع انسان شامل ہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد حدیثوں میں عام رحم کی تعلیم دی ہے' اور فرمایا ہے کہ جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا خدا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا یہ بھی فرمایا کہ رحم کرنے والوں پر رحم کرنے والا خدا رحم کرے گا۔ زمین والوں پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ (۴)۔

جانوروں کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا اور اب بھی جاری ہے اور وہ اس رحمدلی کے بالکل مخالف تھا اس لیئے اسلام نے اس تفریحی مشغلہ کو ناجائز کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی۔

اس عام رحمدلی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو ایسے مختصر اور جامع لفظوں میں دی ہے جو بلاغت کی جان ہیں' فرمایا:

من لا یرحم لا یرحم۔

جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

---

(۱)۔بخاری کتاب الادب باب رحمته الولد و تقبیله و معانقته۔ (۲)۔ ترمذی ابواب البر والصله باب ماجاء فی رحمته الصبیان۔ (۳)۔ بخاری کتاب الادب باب رحمته الناس والبهائم۔ (٤)۔ ابواب البر والصلته باب ماجاء فی رحمته الناس۔ (٥)۔ ادب المفرد باب ارحم من فی الارض۔

ان دو لفظوں کی تشریح دفتروں میں نہیں سما سکتی۔ رحمدلی کا ہر منظر اور شفقت و کرم کا ہر جذبہ ان ہی دو لفظوں سے ابھارا جا سکتا ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا بھی رحم نہیں فرمائے گا' اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتا تو دوسرے بھی اس پر رحم نہیں کھائیں گے محدث ابن بطال نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس میں تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اس لیئے اس میں مسلمان' کافر مملوکہ اور غیر مملوکہ جانور سبھی داخل ہیں اور ان کے کھانے پینے کی نگرانی کرنا ان پر ہلکا بوجھ لادنا اور ان کو بہت نہ مارنا یہ سب چیزیں

عدل وانصاف

کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو تو اس کو عربی میں ''عدل'' کہتے ہیں (۱)۔ اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل و انصاف کا پلہ بھی کچھ کم بھاری نہیں۔

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں ان میں ایک عادل (عدل والا) بھی ہے' علماء نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے' وہ حق بات کہتا ہے' اور وہی کرتا ہے جو حق (۳)۔ ہے قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی گئی ہے' فرمایا:

واللہ یقضی بالحق۔(مومن: ۲)

اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔

یہ عدل عملی کی طرف اشارہ ہے دوسری آیت میں ہے:

واللہ یقول الحق۔(احزاب: ۱)

اور اللہ حق بات کہتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے عدل قولی کو ظاہر کرتا ہے' اور یہ دونوں باتیں قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں یکجا ہیں۔

وتمت کلمت ربك صدقا و عدلا (انعام: ۱۴)

اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہوگئی ہے۔

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہے' صرف اللہ تعالیٰ کے

عدل و انصاف کے بل بوتے پر قائم ہے' وہ اپنی تمام مخلوقات پر اپنی شہنشاہی پورے انصاف کے ساتھ قائم کیئے ہوئے ہے' اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے' ارشاد ہوتا ہے:

شھد اللہ انہ لا الہ الا ھو والملئکہت و اولوا العلم قائمام بالقسط۔ (آل عمران: ۲)

خدا نے گواہی دی کہ اسکے سوا کوئی اور خدا نہیں' اور فرشتوں نے اور علم والوں نے وہی خدا انصاف کو لیکر کھڑا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل و انصاف صرف نظم و سلطنت ہی کے لیئے مخصوص نہیں ہے' بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل کی ضرورت ہے اور نظام عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جن اچھی باتوں کا حکم دیا ہے' ان میں سب سے پہلے عدل و انصاف ہی کرنے کا حکم فرمایا:

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان (نحل: ۱۳)

بے شبہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

(۱)۔فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ٦٨ مصر۔ (۲)۔ مفردات راغب اصفہانی۔ (۳)۔ کتاب الاسماء والصفات بیہقی صفحہ ٦١ الہ آباد۔

عدل قانون کا اقتضاء ہے اور احسان کرنا اور درگزر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے' اللہ تعالیٰ نے نظم عالم کو قائم رکھنے کے لیئے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے' اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی نگہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے پھر اسی مجمل تعمیل پر بس نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کے اہم شعبوں کو لے کر ان میں عدل و انصاف کا حکم دیا ہے' مثلاً معاشرتی زندگی میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرتے ہیں' اس لیئے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

فان خفتم الا تعدلوا فواحدہت او ما ملکت

ایمانکم۔(نساء: ۱)

پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیوں میں) انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی (بی بی کرنا) یا جو (لونڈی) تمہارے قبضہ میں ہو۔

عورتوں کی طرح یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے لیئے بھی عدل و انصاف کی ضرورت ہے،اس لیئے فرمایا:

وان تقوموا للیتمی بالقسط(نساء: ۱۹)

اور (خاص کر) یہ یتیموں کے حق میں انصاف کو ملحوظ رکھو۔

عام معاملات میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید و فروخت میں وزن و پیمانہ میں ہے اس لیئے فرمایا:

واوفوا الکیل والمیزان بالقسط (انعام: ۱۹)

اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری) ناپ کرو اور (پوری پوری) تول۔

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول میں بے انصافی نہ کی جائے کیونکہ خرید وفروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے اس لیئے وزن و پیمانہ میں کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ نہایت عام و وسیع ہے اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار میں کمی کرنے سے انسان کی سخت دنائت ثابت ہوتی ہے اور اس سے روح میں سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے۔

عدل و انصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات میں ہوتی ہے اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل و انصاف کا لحاظ رکھا ہے تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ:

ولیکتب کاتب بالعدل۔(بقرہ: ۳۹)

اور (تمہارے باہمی اقرار داد کو) لکھنے والا انصاف کے ساتھ

لکھدے۔

فان کان الذی علیہ الحق سفیھا او ضعیفا او لا یستطیع ان یمل ھو فلیملل ولیہ بالعدل۔(بقرہ: ۲۸۲)

پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا۔اگر وہ کم عقل ہو یا معذور یا خود ادائے مطلب نہ کرسکتا ہو تو (جو) اس کا مختار کار (ہو وہ) انصاف کے ساتھ (دستاویز کا) مطلب بولتا جائے۔

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ میں قرابت دار ہو یا اس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت میں بھی عدل وانصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں رکھتی۔

واذ قلتم فاعدلو اولو کان ذاقربی (انعام: ۱۹)

اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے) جب بات کہو تو (فریق مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیوں نہ ہو) ہو انصاف کا پاس کرو۔

یایھا الذین امنوا کونوا قوامین للہ شھدآء بالقسط ولا یجرمنکم شنانقوم علی الا تعدلوا اعدلوا اھو اقرب للتقوی۔(مائدہ: ۲)

مسلمانوں خدا واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ ہو اور لوگوں کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب) کی باعث نہ ہو کہ (معاملات میں) انصاف نہ کرو (نہیں ہر حال میں) انصاف کرو کہ (شیوۂ انصاف پرہیز گاری سے قریب تر ہے۔)

پہلی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمہاری باہمی دوستی ومحبت تم کو بے انصاف نہ بنائے اور دوسری آیت میں یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے اور یہ کہ ہر حال میں عدل وانصاف کرنا تقوی کی نشانی ہے۔

یہود اور نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے' اس پر بھی رسول اسلام علیہ السلام کی زبان مبارک سے وحی الٰہی یہ کہلواتی ہے۔

وقل امنت بما انزل الله من کتاب و امرت لا عدل بینکمط الله ربنا وربکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکمط ولا حجت بیننا وبینکمط والله یجمع بیننلط والیه المصیر۔(شوریٰ:۲)

اور کہہ دے کہ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اتاری' اور مجھے (خدا سے) یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں۔ اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا' ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملنا ہے اور تم کو تمہارے کاموں کا ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں' اللہ ہی ہم سب کو جمع کرے گا۔ اسی کی طرف (سب کو) پھر جانا ہے۔

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیت پاک میں ہے اس کے کئی پہلو ہیں' ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچی ہے اس کو میں برابر برابر تم سب کو پہنچا دوں' دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمہارے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے' بلکہ وہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل و انصاف کرتا ہے' اور تیسرا یہ کہ اب تک تم میں مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہے کہ دولت مندوں اور عزت والوں کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگوں کے ساتھ سختی کا قانون برتا جائے میرے خدا نے ایسا کرنے سے بھی منع کیا ہے' اور یہ حکم دیا ہے کہ عام و خاص اور امیر و غریب سب کے ساتھ یکساں اور برابری کا سلوک کیا جائے کیونکہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے' ہم سب اس کے غلام ہیں' اس لیئے اس کے سب غلاموں کے لیئے ایک ہی قانون ہونا چاہئے ہم کو ہمارے اعمال' اور تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا اس میں جھگڑنے کی کوئی بات نہیں سب کو قیامت میں اس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے' جس کا کام اس کو پسند آئے گا اس کو ویسا انعام ملے گا اور اگر برا کام کیا ہو تو ویسی ہی سزا ملے گی۔

عدل و انصاف کی راہ میں ان دونوں سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے اور یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں عدل و انصاف کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک تعلیم کی روشنی میں اہل ایمان کو اس کٹھن منزل کی راہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے' ارشاد خداوندی ہوا:

یایھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شھدآء للہ ولو علی انفسکم اوالوالدین والاقربین ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولی بھما فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا وان تلوا او تعرضوا فان اللہ کان بما تعلمون خبیرا۔(نساء: ۲۰)

اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو۔ اللہ کے لیئے گواہ بنو۔ اگر چہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا اگر وہ دولت مند ہے یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے' تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو اگر تم زبان ملو گے یا کچھ بچاؤ گے تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔

ان آیتوں میں عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے' کہا گیا کہ معاملات میں عدل و انصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو اور خدا واسطے کہو عدل و انصاف کے فیصلہ اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے' نہ عزیزوں اور قرابت داروں کا' نہ دولتمند کی طرف داری کا' نہ محتاج پر رحم کا' پھر اس فیصلہ اور گواہی میں کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے' نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچالیا جائے' مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی میں دولت مند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ' اور قرابت کو بھی نہ دیکھو' جو حق ہو وہ کر دیا کہو پھر سچ کہنے میں کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہ میں پڑ جائے یا پوری بات نہ کہو کچھ چھپالو تو یہ سب باتیں عدل اور انصاف کے خلاف ہیں کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر

فیصلہ میں ردوبدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے' مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی برائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے' غرض یہ ہے کہ عدل و انصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لیئے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے۔

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرف دارانہ گواہی دیتا ہے۔ وہ غلطی میں مبتلا ہے' اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہیں ہوسکتا اس لیئے نہ گواہوں کی اس لیئے طرفداری کرنی چاہیے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرفداری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل میں لانا چاہیئے' بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہیئے کہ وہی ان کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر ولی ہے۔

لوگ عدل و انصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اسی لیئے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرف داری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے' تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر و غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ تمہاری کم بین نظر تو آس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب کچھ ہے' وہ سب کچھ دیکھ کر' اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے جس میں ان کی بھلائی ہے' غور کیجیئے کہ ان لفظوں میں عدل و انصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے' کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کے لیئے جھوٹ بولتا یا غلط فیصلہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا' حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لیئے کیا چیز مفید ٹھہرے گی' پھر ایک اور حیثیت سے دیکھیے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرفداری سے فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون

کر کے ظلم عالم کو بہتر کرنے کی کوشش کی اور ظلم کی بنیاد رکھی، جس سے عالم کے امن و امان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع و نقصان کا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے۔

اسی لیئے رشوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت میں گناہ ہے، اور بعض مفسروں کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت میں:

وتدلوا بها الى الحكام لتاكلوا فريقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون (بقرہ:۱۸۸)

اور نہ مال حاکموں تک پہنچاؤ تا کہ لوگوں کے مال میں سے گناہ کا کر کچھ کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔

اس رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے۔(۱)۔

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے، اس لیئے اس میں بھی عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے جب دونوں طرف سے تلواریں میان سے نکل چکی ہوں، اور ایک دوسرے کے سر و سینہ پر تڑپ تڑپ کر گر رہی ہوں یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نیکی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہو اس عالم میں بھی مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے فرمایا:

وان طائفتن من المئومنين اقتتلوا فاصلحوا بينهما فان بغت احدهما على الاخرى فقاتلوا التى تبغى حتى تفئى الى امر اللهط فان فاء ت فاصلحوا بينهما بالعدل واقسطوا ان الله يحب المقسطين۔(الحجرات: ۱)

اور اگر (تم) مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان

میں صلح کرا دو پھر اگر ان کا ایک (فرقہ) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے اس سے تم (بھی) لڑو یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف رجوع کرے پھر جب رجوع لائے تو دونوں میں برابری کی ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کو ملحوظ رکھو بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

عدل و انصاف حکومت و سلطنت کی عمارت کا ستون ہے اسی لیئے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لیئے عدل کو ضروری قرار دیا ہے کہ یہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادرسی ممکن ہی نہیں اسی لیئے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عادل ہو ارشاد ہوا:

ان اللہ یامرکم ان تئودو الامنت الی اھلھا و اذ احکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ (نساء:۸)

بیشک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچاؤ اور یہ کہ جب لوگوں کے درمیان جھگڑے فیصل کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

اہل تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت پاک میں امانت سے مراد منصفانہ فیصلہ اور وہ منصفانہ حق ہے جو ایک کا دوسرے پر چاہیئے خدا نے اس آیت میں اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حقدار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے اور یہ فیصلہ دوست و دشمن کافر و مسلم سب کے ساتھ یکساں عدل و انصاف کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہودیوں کے معاملات میں حکم ہوا:

(۱)۔تفسیر روح المعانی۔

وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین۔ (مائدہ:۲)

اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا کیونکہ

اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

عدل و انصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل و انصاف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے۔

اخلاق کے ساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس لیئے کہ کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے قرآن مجید میں اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے تاہم اشارات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیئے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو' اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو قوت نطق سے محروم نہ ہو صاحب علم ہو چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

وضرب اللہ مثلا رجلین احدھما ابکم لا یقدر علی شئی وھو کل علی مولہ اینما یوجھہ لایات بخیر ھل یستوی ھو ومن یامر بالعدل وھو علی صراط مستقیم۔ (النحل: ۱۰)

اور خدا (ایک دوسری مثال دیتا ہے کہ) دو آدمی (بین) ان میں کا ایک گونگا (اور گونگے کے علاوہ پرایا غلام کہ خود) کچھ نہیں کر سکتا اور گونگے ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بار خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آیا کیا ایسا غلام اور وہ شخص دونوں برابر ہو سکتے ہیں جو (لوگوں کو) عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر ہے۔

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے اس کو صفت نطق سے متصف ہونا چاہئے ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا' اور قادر ہونا چاہئے کیونکہ علم سے علوے مرتبت کا اظہار ہوتا ہے' اور جب تک وہ وقار نہ ہو علوے مرتبت حاصل نہیں ہو سکتا' اور عالم ہونا چاہئے تاکہ ظلم و انصاف میں تمیز کر سکے' اس سے

ثابت ہوا کہ عدل و انصاف کی صفت، قدرت اور علم دونوں میں شامل ہے، پہلا شخص گونگا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہئے پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہیں آتا، اس لیئے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہئے تا کہ وہ ہر کام سلیقہ سے کر سکے۔

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل و انصاف کا جو حکم دیا ہے کہ وہ اخلاق، معاشرت اور سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے، یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم حاوی نہ ہو۔

ان آیات کی رو سے اگر چہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہئے تا ہم امام و حاکم وقت کے لیئے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس لیئے حدیث میں امام عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن جبکہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا، سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک شخص امام عادل ہوگا۔ (۱)۔

(۱)۔ بخاری کتاب المحاربین باب فضل من ترک الفواحش۔

عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول وقرار کرلیا جائے اس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا:

ان اللہ لا یخلف المیعاد (آل عمران، رعد: ۴)

بے شبہ خدا وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

لا یخلف اللہ المیعاد (زمر: ۳)

اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

انک لا تخلف المیعاد (آلعمران: ۲۰)

(اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

وعداللہ لا یخلف اللہ وعدہ (روم: ۱)

اللہ کا وعدہ ہوا ہے اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

ولن یخلف اللہ عھدہ (حج: ۶)

اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ۔

فلن یخلف اللہ عھدہ (بقرہ: ۹)

تو البتہ اللہ اپنے قول وقرار کی خلاف نہ کرے گا۔

ومن اوفی بعھدہ من اللہ (توبہ: ۱۴)

اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں اور جو قول وقرار کریں اس کے پابند رہیں، سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منہ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے، اور کسی سے جو قول وقرار کرے اس کا پابند نہ رہے۔

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول وقرار کے سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاشرت اور معاملات

کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً' شرعاً' قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی' شرعی' قانونی' اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے اسی لیئے قرآن مجید میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے ایک جگہ اصل نیکی کے اوصاف کے تذکرہ میں ہے:

والموفون بعهدهم اذا عاهدوا (بقرہ: ۲۲)

اور اپنے قرار کو جب قول دیں پورا کرنے والے۔

بعض آیتوں میں اس کو کامل الایمان مسلمانوں کے مخصوص اوصاف میں شمار کیا گیا ہے۔

والذین هم لا منتهم و عهدهم راعون (مومنون: ۱)

اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں۔

ایک دوسری سورہ میں جنتی مسلمانوں کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے' اس تصویر کا ایک رخ یہ ہے:

والذین هم لا منتهم و عهدهم راعون (معارج: ۱)

اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔

کسی کی امانت کو رکھ کر بلا کم و کاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا' معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے جو عہد کے وسیع معنی میں داخل ہے اس لیئے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا ہے' اور اس کے بعد کا عام ذکر کیا یعنی تاکید اپہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانوں کا مخصوص وصف قرار دیا' اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا:

واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا واوفوا الكيل اذا كلتم وزنوا بالقسطاس المستقيم' ذلك خير واحسن تاويلا (بنی اسرائیل: ۴)

اور عہد کو پورا کیا کرو' کیونکہ (قیامت میں) عہد کی باز پرس

ہوگی اور جب ناپ کرو۔ تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو اور (تول کر دینا ہو تو) ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو (معاملہ کا) یہ بہتر طریق ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے۔

قانون یا رسم و رواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے، اس لیئے تاکیداً پابندی عہد کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کے لیئے زبانی قول و قرار کی ضرورت نہیں۔ بلکہ عرف عام کے سارے مسلمات سوسائٹی کے قول و قرار ہیں۔

تمام عہدوں میں سب سے پہلے انسان پر اس عہد کا پورا کرنا واجب ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے، یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے، جو روز الست کو بندوں نے اپنے خدا سے باندھا، اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے، اور دوسرا وہ عہد ہے جو خدا کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت میں کیا گیا ہے۔ تیسرا عہد وہ ہے جو عام طور سے قول و قرار کی شکل میں بندوں میں آپس میں ہوا کرتا ہے، اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہل حقوق کے درمیان فطرتاً قائم ہے اور جن کے ادا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

الذین یوفون بعهدالله ولا ینقضون المیثاق والذین یصلون ما امرالله به ان یوصل (رعد:۳)

جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اور اپنے اقرار کو نہیں توڑتے، اور نہ خدا نے جن تعلقات کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، ان کو جوڑتے رکھتے ہیں۔

اس آیت میں پہلی اس فطری عہد کے ایفاء کا ذکر ہے جو خدا اور بندہ کے درمیان ہے، پھر اس قول و قرار کا جو باہم انسانوں میں ہوا کرتا ہے، اس کے بعد اس فطری عہد کا ہے، جو خاص کر اہل قرابت کے درمیان قائم ہے۔

سورۂ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے' جو خدا کو حاضر و ناظر بتا کر خدا کی قسمیں کھا کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں' فرمایا:

واوفوا بعهد الله اذا عاهدتم ولا تنقضوا الايمان بعد توكيدها وقد جعلتم الله عليكم كفيلا۔(نحل:۹۱)

اور اللہ کا نام لے کر جب تم آپس میں ایک دوسرے سے قرار کرو تو اس کو پورا کرو' اور قسموں کو پکی کر کے توڑا نہ کرو' اور اللہ کو تم نے اپنے پر ضامن ٹھہرایا ہے۔

اس معاہدہ کے عموم میں صحابہ کرام کے وہ عہد بھی داخل ہیں جو اسلام لاتے وقت انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیئے اور نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہیں' جو جاہلیت میں کسی اچھی غرض سے کیئے گئے تھے ساتھ ہی وہ سب معاہدے بھی اس میں آ جاتے ہیں جو خدا کا واسطہ دے کر اور خدا کی قسمیں کھا کر بھی مسلمان ایک دوسرے سے کریں۔

سورۂ انعام میں ایک اور عہد الٰہی کے ایفا کی نصیحت کی گئی ہے فرمایا:

وبعهد الله اوفوا ذلكم وصكم به لعلكم تذكرون۔(انعام:۱۵۲)

اور اللہ کا اقرار پورا کرو' یہ اس نے تم کو نصیحت کر دی ہے' تا کہ تم دھیان رکھو۔

اس عہد الٰہی میں خدا کے فطری احکام بھی داخل ہیں' جن کے بجالانے کا اقرار تم نے خدا سے کیا ہے' یا خدا نے تم سے لیا ہے اسی طرح اس نذر اور منت پر مشتمل ہے جس کو خدا کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے' اور انسانوں کے اس باہمی قول و قرار کو بھی شامل ہے جو خدا کی قسمیں کھا کھا کر لوگ کیا کرتے تھے۔

صلح حدیبیہ میں مسلمانوں نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریق مخالف کی قوت روز بروز گھٹی' اور اسلام کی

قوت بڑھتی گئی اس حالت میں اس معاہدہ کوتوڑ دینا کیا مشکل تھا مگر یہی وہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جا سکتی ہے کہ اپنی قوت اور دشمنوں کی کمزوری کے باوجود وہ کہاں تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہیں' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاددلائی' اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو جن مشرکوں نے اس معاہدہ کوتوڑا تھا' ان سے لڑنے کی گو اجازت دے دی گئی تھی' اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا پھر بھی یہ حکم ہوا کہ ان کو چار مہینوں کی مہلت دو۔

برآء ۃ من اللہ ورسولہ الی الذین عاھدتم من المشرکین فسیحوا فی الارض اربعۃ اشھر ط واعلموا انکم غیر معجزی اللہ۔ (توبہ: ۱)

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو پورا جواب ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا' تو پھر لو (تم اے مشرکو)! ملک میں چار مہینے جا لو کہ تم اللہ کو تھکا نہیں سکتے۔

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہیں رہی۔ تو ساتھ ہی ان مشرکوں کے ساتھ ایفائے عہد کی تاکید کی گئی جنہوں نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا' فرمایا:

الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئا ولم یظاھروا علیکم احدا فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم ط ان اللہ یحب المتقین۔ (توبہ: ۱)

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا پھر انہوں نے تم سے کچھ کمی نہیں کی' اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی تو ان سے ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو' بے شک اللہ کو خوش آتے ہیں تقوی والے۔

اوران مشرکوں کے ساتھ اس ایفائے عہد کو اللہ تعالیٰ تقوی بتاتا ہے' اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقی فرمایا اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا آگے بڑھ کر ان مشرکوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنہوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں ان عہد شکن مشرکوں کے ساتھ ان مشرکوں کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے جنہوں نے اس معاہدہ کو قائم رکھا ہے۔

کیف یکون للمشرکین عهد عند الله وعند رسوله الا الذین عاهدتم عند المسجد الحرام فما استقاموا لکم فاستقیموا لهم ان الله یحب المتقین۔ (توبہ: ۲)

مشرکوں کو کیسے اللہ کے پاس اور اس کے رسول کے پاس کوئی عہد ہو' مگر وہ جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک معاہدہ کیا جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو' بیشک اللہ کو تقوی والے خوش آتے ہیں۔

سیدھے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو' اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں ان کا شمار تقوی والوں میں ہے جو قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے اور تقوی والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفا اللہ تعالیٰ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے' قرآن مجید میں قریب قریب اسی عہد کے معنی میں ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے۔

یایها الذین امنوا اوفوا بالعقود۔ (مائدہ: ۱)

مسلمانوں! (اپنے) قراروں کو پورا کرو۔

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہیں اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات

کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے اور اصطلاح شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

''اوفوا بالعھد'' خداوند تعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے یاایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود اور اس قول میں تمام عقد مثلاً بیع عقد شرکت عقد یمین عقد نذر، عقد صلح اور عقد نکاح داخل ہیں، خلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضاء یہ ہے کہ دو انسانوں کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار پایا جائے اس کے مطابق دونوں پر اس کا پورا کرنا واجب ہے۔(۱)۔

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے، اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے، یہاں کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہو جاتی ہے، حسن عہد میں داخل ہے، صحیح بخاری (۲)۔ میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ مجھ کو حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہیں آیا، میرے نکاح سے تین سال پیشتر ان کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا ذکر کیا کرتے تھے اور بکری ذبح کرتے تھے تو اس کا گوشت ان کی سہیلیوں کے پاس (۳)۔ ہدیۃً بھیجا کرتے تھے۔ یعنی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی ان کی سہیلیوں کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا جو ان کی زندگی میں جاری تھا۔ امام بخاری نے کتاب الادب میں ایک باب باندھا ہے جس کی سرخی یہ ہے حسن العھد من الایمان۔ اور اس باب کے تحت میں اسی حدیث کا ذکر کیا ہے۔

---

(۱)۔تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۵۔ ۵ (۲)۔ بخاری کتاب الادب باب حسن العھد من الایمان۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حاکم اور بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک بڑھیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ ﷺ نے اس سے کہا کہ تم کیسی رہیں، تمہارا کیا حال ہے، ہمارے بعد تمہارا کیا حال رہا، اس نے کہا اچھا رہا۔ جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپ ﷺ نے اس بڑھیا کی

طرف اس قدر توجہ فرمائی۔ فرمایا عائشہؓ یہ خدیجہؓ کے زمانہ میں ہمارے یہاں آیا کرتی تھی اور حسن عہد ایمان سے ہے "یعنی اپنے ملنے جلنے والوں سے حسب توقع یکساں سلوک قائم رکھنا' ایمان کی نشانی ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے' اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہر خطبہ میں اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے۔

لا دین لمن لا عھدلہ (احمد طبرانی و ابن حبان)

جس میں عہد نہیں اس میں دین نہیں۔

یعنی اس قول وقرار کو جو بندہ خدا سے کرتا ہے یا بندہ سے کرتا ہے' پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے جس کے مجموعہ کا نام دین ہے' اب جو اس عہد کو پورا نہیں کرتا وہ دین کی روح سے محروم ہے۔

احسان یعنی بھلائی کرنا

بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے' اور اس لیئے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر محسن کون ہوگا' جس کے احسانات کی حدود پایاں نہیں عرش سے فرش تک جو کچھ ہے۔ وہ اسی کے احسانوں کی جلوہ نمائی ہے۔

وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا ان الانسان لظلوم کفار۔ (ابراہیم: ۵)

اور اگر اللہ کے احسان گنو تو ان کو پورا نہ گن سکو گے بے شک انسان بے انصاف ناشکرا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام خدائے تعالیٰ کے اس احسان (۱)۔ کا شکر کہ اس نے کسی سعی و سفارش کے بغیر ان کو قید خانہ سے نجات دی اور وہ ان کے ماں باپ اور

بھائیوں کو مصر لے آیا اور ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔

وقد احسن بی اذ اخرجنی من السجن و جاء بکم من البدو۔(یوسف)

اور خدا نے مجھے پر احسان کیا کہ مجھے قید خانہ سے باہر لایا اور آپ لوگوں کو گاؤں سے یہاں لے آیا۔

اسی طرح قارون کے قصہ میں اللہ تعالیٰ کے صفت محسن سے متصف ہونے کا اشارہ موجود ہے' فرمایا:

احسن کما احسن اللہ الیک (قصص:۸)

تو احسان کر جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا۔

اس دنیا میں جہاں قدم قدم پر ادلا بدلا اور داد و ستد کا جذبہ ہر راہ رو کو دامنگیر ہے احسان' حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کرنے کی تعلیم اور تنبیہ کتنی ضروری چیز ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم نے اس ضرورت کو پورا کیا' اور قرآن مجید میں جا بجا اس کی اہمیت کی تاکید آئی ہے' چنانچہ سورۂ نحل میں حکم کی صورت میں ہے:

(۱)۔اس موقع پر ایک اور بات خیال میں رہے عربی میں احسان کے معنی اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقہ سے کرنے کے ہیں' اردو میں جن معنوں میں ہم احسان کا لفظ بولتے ہیں عربی میں جب خاص وہ معنی مراد ہوں گے تو عموماً اس کا استعمال مشتقات میں الیٰ باب کے صلہ کے ساتھ ہوگا قرآن پاک میں جہاں جہاں محسن یا محسنین یا محسنون کے لفظ بلا صلہ آئے ہیں ان سے حسب موقع احسان کرنے' اچھے کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنی لیئے جائیں گے اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت میں احسان و کرم بھی داخل ہوسکتا ہے لیکن وہ اسی پر محدود نہیں ہے جیسے:

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین (توبہ:۱۵)

بے شبہ خدا اچھے کام کرنے والوں کی مزدوری برباد نہیں کرتا۔

لو ان لی کرہت فاکون من المحسنین۔ (زمر:۶)

کاش اگر میرے لیئے لوٹ کر جینا ہوتا تو میں اچھا کام کرنے والوں میں سے ہوتا۔

واللہ یحب المحسنین (آل عمران:۱۴۸)

اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتای ذی القربی (نحل:۹۰)

اللہ انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور راحت و رنج کی پرواہ نہیں کرتا' وہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے' اس لیئے خداوند تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔ پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابت داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا' لیکن احسان مالی امداد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں' اور عام لوگوں کے علاوہ باپ' ماں' یتیم محتاج' قرابت داروں' پڑوسی' اجنبی پڑوسی' آس پاس کے بیٹھنے والے' مسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں' اس لیئے خداوتعالیٰ نے سورۂ نساء کی ایک آیت میں (رکوع:۵) ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے اور باپ کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے۔ (بقرہ:۹' زخرف:۷' انعام:۱۶' اسرائیل:۳)

بہر حال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے' اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرنے اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے یہی وجہ ہے۔ کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا:

واحسن کما احسن اللہ الیک۔ (قصص:۸)

اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے' تو بھی

(اوروں کے ساتھ) احسان کر۔

احسان کی اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات دلائی' اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں۔

وقد احسن بی اذ اخرجنی من السجن (یوسف: ۱۱)

اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے) احسان کیئے ہیں کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا۔

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں' ان کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شریفانہ اور فیاضیانہ افعال ہیں جن کو خدا نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے' مثلاً عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا جس سے روکا گیا اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کر دو۔ فرمایا:

الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تشریح باحسان۔ (بقرہ: ۲۹)

طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہو سکتا وہ تو دو ہی طلاقیں ہیں جو) دو دفعہ (کر کے دی جائیں) پھر دو (طلاقوں کے بعد یا تو) دستور کے مطابق زوجیت میں) رکھنا ہے حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا۔

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کر دو' اور اس کی ادائی میں لیت ولعل اور حجت حوالہ نہ کیا کرو۔ فرمایا:

فمن عفی لہ من اخیہ شیء فاتباع م بالمعروف وادآء الیہ باحسان' (بقرہ: ۲۲)

پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (طالب قصاص) سے کوئی

جز (قصاص) معاف کر دیا جائے' تو (جان کے بدلے خون بہا اور وارث مقتول کی طرف سے اس کا) مطالبہ دستور (شرع) کے مطابق اور قاتل کی طرف سے' وارث مقتول کی خوش معاملگی (خون بہا کا) ادا کر دینا۔

قصوروا روں کے قصور کو معاف کرنا اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے' کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وہ بھی خدا کے محبوب بندوں میں سے ہوں گے۔

واللہ یحب المحسنین۔ (آل عمران: ۱۴)

اور اللہ ان محسنوں (یا نیکی کرنے والوں) کو پیار کرتا ہے۔

احسان کے لیئے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے' اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کیئے بغیر اس کو طلاق دیدے تو شوہر پر نصف (۱) مہر واجب ہوتا ہے' یہ تو قانون ہوا مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسن خلق ہے اور یا شوہر پورا ادا کر دے اور آدھا کاٹے نہیں تو یہ مرد کا حسن خلق ہے' اس کے بعد ارشاد ہے:

ولا تنسوا الفضل بینکم ان اللہ بما تعملون بصیر۔ (بقرہ: ۲۳۱)

اور آپس (۲) میں فضل کو مت بھولو' بے شک اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

کسی غریب یا کسی عزیز وقریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے تو احسان والوں کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کریں اور اپنے احسان سے باز نہ آئیں (۳)۔ فرمایا:

ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یؤتوا اولی القربی والمساکین والمھجرین فی سبیل اللہ ولیعفوا ولیصفحوا (نور: ۳)

اور تم میں جو احسان اور کشائش والے ہیں، اور قرابت داروں
غریبوں اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے کی
قسم نہ کھائیں، ان کو چاہئے کہ معاف کریں اور درگذریں۔

احسان کے اس وسیع معنی میں اسلام نے ایک اور جامع لفظ ''معروف'' کا استعمال کیا ہے یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً و شرعاً معلوم ہے، قرآن کا حکم ہے۔

وامر بالمعروف (اعراف: ۲۴)
اور نیکی کرنے کو کہہ۔

اور اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

کل معروف صدقہ ہے۔
ہر نیکی ثواب کا کام ہے۔

---

(۱)۔یعنی جس حالت میں کہ مہر مقرر ہوچکا ہو، ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہیں۔ (۲)۔ سعید سے روایت ہے آپس میں فضل کو مت بھولو'' یعنی احسان کو مت بھولو، ابن جریر طبری ج ۲ ص ۳۲۱ مصر۔ (۳)۔ کشاف زمخشری تفسیر آیت مذکور! بعضوں نے یہاں ''فضل'' سے فضیلت دینی اور کسی نے فضل مالی مراد لیا۔

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے جس کے لیئے غریب وامیر کی تخصیص نہیں، بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے، اس لیئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے، فرمایا کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر اس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یا وہ نہ کمائے، فرمایا غریب حاجتمند کی اعانت کرے، صحابہؓ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو؟ فرمایا کہ نیکی کے کرنے کا حکم دے، صحابہؓ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکے، ارشاد ہوا کہ برائی سے باز رہے، کیونکہ یہ اس کے لیئے صدقہ ہے۔'' اسی معنی کے لحاظ سے حدیث میں آیا ہے کہ آدمی اپنے اہل وعیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے، وہ صدقہ ہے، کسی خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی اسی میں داخل ہے۔

اسی معنی میں قرآن مجید نے ایک اور لفظ ''بر'' کا استعمال کیا ہے' اور اس وسیع دائرے میں کافر و مسلم سب کو شامل کرلیا ہے۔

لا ینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین ولم یخرجو کم من دیار کم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین۔(ممتحنہ:۲)

جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے تو خدا تم کو منع کرتا نہیں (کیونکہ) اللہ منصفانہ برتاؤ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

صحابہ میں کچھ ایسے لوگ تھے جو نامسلموں پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے اس پر یہ حکم آیا کہ ہدایت بخشنا تمہارا نہیں' میرا کام ہے' تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی' اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہئے تم کو اپنی نیت کا ثواب ملے گا ارشاد ہوا:(۲)۔

لیس علیک ھدھم ولکن اللہ یھدی من یشائط وما تنفقوا من خیر فلانفسکم وما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللہط وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون(بقرہ:۲۷۳)

تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لے آنا' لیکن اللہ راہ پر لے آتا جس کو چاہئے' اور تم جو دو گے خیرات سو اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر' اور جو دو گے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی' اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔

گویا احسان کی ایک خاص صورت ہے مگر اس کی وسعت میں ساری دنیا سمائی ہے۔ نیکی کا بدلہ نیکی سے دنیا اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب و عذاب کا دارومدار ہے'

اور رسول ﷺ نے ایک حدیث میں خود خداوند تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرمایا کہ ''قیامت کے دن میں خود تین آدمیوں کا فریق ہوں گا۔ جن میں ایک وہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت (۱)۔ کھائی اس کو اور بھی موکد دیا اور قرض کے معاملہ میں تنگ دستوں پر احسان کرنے کی متعدد صورتیں بتائیں، یعنی مہلت دینا، قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ ساتھ تقاضا کرنا، اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے تب بھی صرف یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہوسکتا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص جو نیکی کا کام نہیں کرتا تھا لوگوں کو قرض دیتا تھا اور جب اس کو کوئی مقروض تنگ دست نظر آتا تھا تو اپنے ملازموں سے کہتا تھا کہ اس سے درگذر کرو شاید خدا ہم سے بھی درگذر کرے، چناں چہ خدا نے اس کے صلہ میں اس سے درگذر کیا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا۔ جس سے موت کے بعد فرشتوں نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا کوئی نہیں، فرشتوں نے کہا ذرا یاد کرو، اس نے کہا کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا۔ اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے میں آسانی کرتا تھا اور اگر تنگ دست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا یا یہ کہ فراخ دست مقروض کو مہلت دیتا (۲)۔ تھا۔

اس قسم کی بہت سی روایتیں ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے وہ تنگ دست کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کردے (۳)۔ یہی روایت مسند ابن حنبل میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ جو شخص اپنے قرض دار کو مہلت دے گا، یا اس کو قرض معاف کردے گا تو قیامت کے دن خدا کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔ (۴)۔

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص حد

میں محدود نہیں کیا ہے' بلکہ اس کو نیکی کی راہ ہر راہ میں وسیع کر دیا' زندگی تو زندگی موت میں بھی اس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ

(۱)۔بخاری کتاب البیوع باب اثم من باب حرامع فتح الباری۔ (۲)۔ مسلم کتاب البیوع باب فضل انظار العسر۔ (۳)۔ مسلم کتاب البیوع باب فضل۔ (٤)۔ مسند ابن حنبل جلد ٥ صفحہ ۳۰۸

نہیں کیا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے تو اگر تمہیں کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو' کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو چھرے کو خوب تیز کر لیا کرو اور ذبیحہ کو راحت دو۔(۱)۔

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے اس کے ساتھ احسان کرنا چاہئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے' ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ میں کسی شخص کے پاس سے گزرتا تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا' تو کیا جب اس کا گزر مجھ پر ہو تو اس کی کج خلقی کا بدلہ یہی دوں' فرمایا ''نہیں تم اس کی مہمانی کرو۔(۲)۔''

ایک موقع پر ارشاد ہوا ''ایسے نہ بنو کہ خود تمہاری گرہ کی عقل نہ ہو' صرف دوسروں کو دیکھا دیکھی کام کرو کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے' بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کر لو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو گے' اور اگر وہ برائی بھی کریں تو ظلم نہ کرو۔ (۳)۔''

لوگ احسان کو غلطی سے دولت وتمول یا دوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لیئے دولت کی نہیں دل کی ضرورت ہے اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے' حضرت براء بن عازب صحابی

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہوکر درخواست کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جس کے کرنے سے بہشت نصیب ہو۔ ارشاد ہوا تمہاری تقریر گو مختصر ہے لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں کو چھڑاؤ۔ اس نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے' اور دوسرے کے ساتھ شریک ہوکر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے اور لگاتار دیتے رہو' اور ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو اگر تم یہ بھی نہ کرسکو تو بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور پیاسے کو پلاؤ' اور نیکی کے کام کرنے کو کہو اور برائی کے کام سے باز رکھو' اور اگر یہ بھی نہ کرسکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو۔ (۴)۔

ایک دفعہ حضرت ابوذر نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتایئے' فرمایا' جو روزی خدا نے دی اس میں سے دوسروں کو دے۔ عرض کی ''اے خدا کے رسول اگر وہ خود مفلس ہو۔'' فرمایا ''اپنی زبان سے نیک کام کرے'' عرض کی ''اگر اس کی زبان معذور ہو'' فرمایا ''مغلوب کی مدد کرے'' عرض کی ''اگر وہ ضعیف ہو مدد کی قوت نہ ہو۔'' فرمایا ''جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو۔ اس کا کام کردے۔'' عرض کی ''اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو۔'' فرمایا ''اپنی ایذا رسائی سے لوگوں کو بچائے رکھے۔ (۵)۔''

---

(۱)۔ صحیح مسلم کتاب الصید الذبائح۔ (۲)۔ جامع ترمذی باب ماجاء فی الاحسان والعفو۔ (۳)۔ جامع ترمذی ایضًا انظار المعسر۔ (٤)۔ مستدرك حاكم ج ۲ كتاب المكاتب۔ (۵)۔ مستدرك حاكم ج ۲ كتاب الايمان ج ۱ ص ٦۳

عفوو درگذر

عفوو درگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے اگر یہ نہ ہوتو دنیا ایک لمحہ کے لیئے بھی آباد نہ رہے اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے عفو (اور گذر کرنے والا) غافر، غفور اور غفار (معاف کرنے والا ہے) اس کی شان یہ ہے۔

وھو الذی یقبل التوبہت عن عبادہ و یعفوا عن السیات (شوری: ۳)

اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے۔

وہ چاہئے تو انسانوں کے گناہوں کے سبب سے ان کو ایک دم ہلاک کر دے یا ان کو معاف کر دے فرمایا:

او یوبقھن بما کسبوا ویعف عن کثیر (شوری: ۴)

(اگر خدا چاہے تو) گنہگاروں کو ان کے کرتوت کے سبب تباہ کر دے اور بہتوں کو معاف کر دے۔

وہ اپنے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پر تاکید کر کے یوں دلاتا ہے۔

و انی لغفار لمن تاب وامن و عمل صالحثم اھتدی (طہ: ۴)

اور اس میں شبہ نہیں کہ میں البتہ اس کی بڑی بخشائش کرتا ہوں جو توبہ کرے اور یقین لائے اور نیک کام کرے پھر راہ رہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ دو جگہ اپنے کو غافر (بخشنے والا) پانچ دفعہ غفار (بڑی بخشائش کرنے والا) اور اتنی ہی دفعہ عفو (معاف کرنے والا) اور ستر سے زیادہ آیتوں میں غفور (بخشنے والا) کہا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کے عفوو درگذر کا سمندر کس

زوروشور سے جوش مار رہا ہے خدا نے اپنی ساری صفتوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے فرماتا ہے:

او تعفوا عن سوء فان اللہ کان عفوا قدیرا (نساء: ۲)

یا کسی برائی کو معاف کرو تو بیشک اللہ معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔

انسان اگر اپنے کسی قصوروار کو معاف کرتا ہے تو اس کی قدرت بہر حال کامل نہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کس کو دم مارنے کی مجال نہیں وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصوروار وں کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے اسی طرح ہم کو چاہئے کہ ہم بھی اپنے قصوروار وں کو معاف کریں۔(۱)۔

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصوروار وں کو معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا ایک دوسری آیت میں اس کو پوری تصریح ہے فرمایا:

(۱)۔تفسیر ابن جریر طبری و بحر محیط ابن حیان۔

ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم (نور: ۳)

اور چاہئے کہ وہ معاف کر دیں اور درگذر کریں کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو معاف کرے اور اللہ معاف کرنے والا اور مہر والا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو عفو و درگذر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو تو خدا تمہیں معاف کرے گا اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابر کرم کی کچھ چھینٹیں پڑنی چاہئیں چناں چہ جن مومنوں کے لیئے خدا نے جزائے خیر کا وعدہ فرمایا ہے ان کی ایک صفت یہ بتائی ہے۔

واذا ما غضبوا ھم یغفرون (شوری: ۴)

اور جب غصہ آئے تو وہ معاف کرتے ہیں۔

سکون کی حالت میں معاف کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا غصہ کی حالت میں جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا' لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کامل کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں یہ جوہر ہوتا ہے وہ اس حالت میں اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں' اور قصور والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

یہ تو کسی ذاتی غیظ وغضب کی حالت ہوئی' لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہے جہاں مذہبی اختلافات ہیں درمیان میں ہے کہ ان احمقوں کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وہ نہیں مانتے' انکے دعویٰ کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہیں اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہہ کر دیتے ہیں۔ ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

وان تدعوھم الی الھدی لا یسمعوا وترھم ینظرون الیك وھم لا یبصرون' خذالعفو وامر بالعرف واعرض عن الجھلین۔ (الاعراف: ۴)

اور اگر تم ان کو راہ راست کی طرف بلاؤ تو (تمہاری ایک) نہ سنیں اور (بظاہر) وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ گویا وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں حالاں کہ وہ دیکھتے نہیں (اے پیغمبر) درگذر (شیوہ) اختیار کرو اور (لوگوں سے) نیک کام (کرنے) کو کہو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔

کیوں کہ ایسے موقع پر دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو تبلیغ ودعوت کا کام بند کر دیا جائے۔

یا تبلیغ ودعوت کے سلسلہ میں ان ناگواریوں کو برداشت کیا جائے خدا نے اسی صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان ناگواریوں کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو۔

ادفع بالتی ھی احسن السیئۃ نحن اعلم بما

واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کر دیا کریں تا کہ لوگوں کو
ان کے کاموں کا بدلہ ملے جس نے اچھا کیا اس نے اپنے
کے لیئے کیا اور جس نے برا کیا اس نے اپنا برا کیا پھر تم اپنے
پروردگا کے پاس لوٹائے جاوگے۔

اس آیت کے شان نزول میں لکھا ھے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور مسلمانوں کو عفو و درگذار (۱)۔ کی نصیحت فرمائی۔ (تفسیر کبیر امام رازی زیر آیت بالا)

(۱)۔اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کنار سے عفو و درگذر کی نصیحت ہے عام مفسروں کا نظریہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے' جہاد نے کنار کے حق میں عفو و درگذر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے لیکن مفسروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو و درگذر کی نصیحت کے درمیان کوئی مناقشات نہیں سمجھتے اور اس لیئے ایک دوسرے کو منسوخ نہیں جانتے' امام رازی نے اپنی تفسیر میں کئی موقعوں پر اس کی تصریح کی ہے لکھتے ہیں: اس آیت واعرض عن الجھلین ۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بد اخلاقی پر صبر کریں اور ان کی بیہودہ باتوں اور کمینہ حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے اور اس میں قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکوں سے قتال میں کوئی تضاد نہیں۔

اور جب دونوں باتیں ایک ساتھ ہو سکتی ہیں' تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں' مگر ظاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناسخ و منسوخ آیتوں کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہیں' جلد ۴ صفحہ ۴۹۶۔

ایک اور آیت ادفع بالتی ھی احسن کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ نرمی برتنے پر ہر حال میں آمادہ

کیا گیا ہے جب تک اس سے دین اور نہ پیدا ہو' ج ۶ صفحہ ۳۰۰

آیت واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''کلبی اور ابو العالیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کر دیا' لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہیں' کیونکہ احمقوں سے چشم پوشی کرنا' اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونوں میں مستحسن ہے اور عزت و ابرو اور پرہیز گاری کی سلامتی کا باعث ہے۔ ج ۶ صفحہ ۹۷ مطبع دار الطباعہ العامرہ مصر۔

آیت یغفر واللذین امنوا (جاثیہ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

غم و غصہ کے اظہار کا اصلی وقت وہ آتا ہے جب انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے لیکن اس حالت میں بھی اسلام نے عفو و درگذر سے کام لینے کا حکم دیا ہے چنانچہ مسطح حضرت ابوبکرؓ کے رشتہ دار تھے' اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے لیکن جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی ۵ کی تہمت میں حصہ لیا تو ابوبکرؓ نے ان کی مالی امداد بند کر دی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یوتوا اولی القربی والمسکین والمھاجرین فی سبیل اللہ و لیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم و اللہ غفور رحیم (نور: ۳)

اور تم میں جو لوگ صاحب احسان اور کشائش والے ہیں قرابت والوں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مدد خرچ) نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں بلکہ چاہئے کہ ان کے قصور بخش دیں اور درگذر کریں (مسلمانو) کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت کے آخری ٹکڑہ سے بھی ظاہر ہے کہ جو دوسروں کے قصور کو معاف کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگذر فرمائے گا۔

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے' اس لیئے خداوند تعالیٰ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے۔

وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم و جنۃ عرضھا السموت و الارض اعدت للمتقین الذین ینفقون فی السرآء و الضرآء و الکاظمین الغیظ

اور اپنی پروردگار کی بخشائش اور اس جنت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ (اتنا بڑا ہے) جیسے زمین و آسمان کا (پھیلاؤ) سجی سجائی ان پرہیز گاروں کیلئے تیار ہے جو خوشحالی اور تنگدستی (دونوں

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ) اکثر مفسروں نے کہا ہے لیکن جب خدا نے ان سے قتال کا حکم دیا تو عفو و کرم کے عموم میں یہ بھی داخل ہو جاتا ہے کہ ان سے قتال نہ کیا جائے لیکن جب خدا نے ان سے قتال کا حکم دیا تو عفو و کرم کے حکم کا نسخ ہو گیا' لیکن قریب بہ صحت یہ ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کافروں سے جھگڑا نہ کیا جائے اور ان کی تکلیف دہ باتوں اور وحشیانہ حرکتوں سے درگذر کیا جائے (جلد ۷ صفحہ ۸۴ طبع مذکور) میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں اور دوسرے قصورواروں کے ان ہی قصوروں کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے اور وہ حقوق عباد میں ہیں یعنی وہ مسلمانوں کا ذاتی قصور کریں تو مسلمان معاف کر دیں اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس سے کفر و شرک اور عصیان الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو سرے سے حاصل نہیں' اور قتال و جہاد حقوق الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو سرے سے حاصل نہیں' اور قتال و جہاد حقوق الٰہی کے مقابلہ میں مشروع ہوا ہے اس لیئے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفو و درگذر کے اخلاقی احکام میں خلل انداز نہیں'

درمنثور میں ابن عساکر سے حضرت ابو مسلم خولانی صحابیؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک کافرہ لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھ کر معاف کیا تھا۔ اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ (ج ۶ صفحہ ۳۹ مصر)

والعافین عن الناس ط واللہ یحب المحسنین۔ (آل عمران: ۱۴)

حالتوں) میں خدا کے نام پر؟ خرچ کرتے اور غصے کو روکتے اور لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔

اوپر کی آیت میں متقیوں کے دو وصف ایک ہر حال میں راہ خدا میں دینا' اور دوسرا لوگوں کو معاف کرنا اور درگذر کرنا اور ان کے لیئے دو جزائیں' ایک خدا کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت' بیان کی گئی ہیں اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں خدا کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو وہ جنت ہے جس کی حدو پایاں آسمان و زمین ہے اور غصہ روکنا اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ خدا کی مغفرت ہمارے شامل حال ہوگی' اور وہ احکم الحکامین ہم کو بھی معاف کرے گا۔

عفو و درگذر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت کا جز شامل نہ ہوتو وہ سراسر کمزوری اور دنات پسندی کے مترادف ہو جائے' اسی لیئے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو۔ جو ذلت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ اسلام نے عفو و درگذر کی ایسی متعدل تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے۔

والذین اذآ اصابھم البغی ھم ینتصرون۔ وجزآء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظلمین۔ (شوریٰ: ۴)

اور جو ایسے (غیرت مند) ہیں کہ جب ان پر (کسی طرف

سے) بے جا زیادتی ہوتی ہے تو وہ (واجبی) بدلہ لے لیتے ہیں
اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی' اس پر (بھی) جو معاف کر
دے اور صلح کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے' بیشک وہ
ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

برائی کا بدلہ برائی جماعت کا قانون ہے' اور عفو و درگذر افراد کا اخلاقی کمال ہے' جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس میں عفو و درگذر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے جس کی مزدوری کی ذمہ داری احکم الحاکمین نے اپنے ذمے لی ہے اور بتا دیا ہے کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہوں جو بے سبب ظلم کر بیٹھیں' یا وہ انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں' خدا کی محبت سے محروم ہیں۔

اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد عفو و درگذار خودداری کے منافی نہیں ہوتا بلکہ بڑی ہمت کا کام ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر عفو و درگذر کرتا ہے' اسی لیئے فرمایا:

ولمن صبر و غفر ان ذلك لمن عزم الامور۔ (شوری: ۴)
اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے کی خطا) بخش دے تو
بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

ایک اور آیت اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیوں کر دشمنی دوستی کی صورت میں بدل جاتی ہے۔

ولا تستوی الحسنہت ولا السیئہت ط ادفع بالتی
ھی احسن ط فاذا الذی بینك و بینہ
اور بھلائی اور برائی برابر نہیں (اگر کوئی برائی کرے تو اس کا)
جواب اچھائی سے دو' پھر تو تیرے اور جس کے
عداوہت کانہ ولی حمیم۔ و ما یلقھا الا الذین
صبروا ط و ما یلقھا الا ذوحظ عظیم۔ و اما ینزغنك

من الشیطن نزغ فاستعذ باللہ ان ھو السمیع العلیم۔ (حٰمٓ السجدہ:۵)

درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہی ہو جائے گا گویا دوست ہے ناطے والا' اور یہ بات ملتی ہے انہیں کو جنہیں صبر ہے اور یہ بات ملتی ہے اس کو جس کی بڑی قسمت ہے اور اگر (اس میں) شیطان کے کونچنے سے کوئی کونچ تجھ کو لگ جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈ بے شک وہی ہے سنتا جانتا۔

آیت کے اخیر ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگذر کی خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے وہ شیطانی کام ہے اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہئے' حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا:

''خدا نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ و غضب میں صبر کا' اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا اور برائی کے مقابلہ میں عفو و درگذر کا حکم دیا ہے جب وہ ایسا کریں گے تو خدا ان کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا۔(۱)۔

ابو مسعودؓ صحابی کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی جان لو جان لو' مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے کہ اے ابو مسعود! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے اس سے زیادہ خدا کو تم پر ہے' ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ میں نے پھر کسی غلام کو نہیں مارا۔

ایک شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں۔ آپ ﷺ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے اس نے پھر یہی پوچھا تب آپ ﷺ نے فرمایا ''ہر روز ستر دفعہ'' اس سے مقصود نبی ﷺ تعداد کی تحدید نہیں بلکہ عفو و درگذر کی کثرت ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفو و درگذر سے ان کے رعب و ادب اور وقار میں فرق آ جائے گا' لیکن یہ خیال صحیح نہیں' انتقام سے گو فوری جذبہ کی تسکین ہو جاتی ہے اور کمزوروں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے مگر اس سے کسی پائیدار شریفانہ عزت کا خیال نہیں پیدا ہوتا یہ چیز عفو و درگذر ہی سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: (۲)۔

وما زاد الله رجلا بعفوا الا عزا۔):(

اور اللہ اس شخص کو جو عفو و درگذر کرتا ہے نہیں بڑھاتا مگر عزت میں۔

---

(۱)۔ابن کثیر تفسیر آیت مذکور (۲)۔ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء تن ادب الخادم میں یہ دونوں حدیثیں ہیں۔ (۳)۔ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجا فی التواضع۔

حلم و بردباری

حلم و بردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کرلیا جائے اور قصوروار سے اس کے لیئے کوئی تعرض نہ کیا جائے یہ قدرت سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ کو حاصل ہے لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے اور انتقام نہیں لیتا اور اسی لیئے اس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے' اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے ساتھ ہی اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کیا ہے' تا کہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے فرمایا:

واللہ غفور حلیم (بقرہ' ۲۸' مائدہ: ۱۴)

اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔

ان اللہ غفور حلیم (آل عمران: ۱۶)

بیشک اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔

انہ کان حلیما غفورا (بنی اسرائیل' ۵: ملائکہ' ۵)

بیشک وہ (اللہ) ہے بخشنے والا بردبار۔

ان سب آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت حلم کے ساتھ اپنی صفت مغفرت کا ذکر فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کسی صفت یا عدم قدرت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی شان غفاری کا نتیجہ ہے دوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفت علم کو شامل کیا ہے ارشاد ہوتا ہے:

واللہ علیم حلیم (نساء: ۲)

اور اللہ ہے جاننے والا بردبار۔

ان اللہ لعلیم حلیم (حج: ۸)

بیشک ہے اللہ جاننے والا بردبار۔

و کان اللہ علیما حلیما۔ (احزاب: ۲)

اور ہے اللہ جاننے والا بردبار۔

ان آیتوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانوں کی طرح بے جانے بوجھے یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہیں کرتا بلکہ پورے علم، اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہوکر بردباری فرماتا ہے۔ ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفت استغناء کا بھی ذکر فرماتا ہے:

واللہ غنی حلیم۔ (بقرہ:۲۶۳)

اور اللہ مستغنی اور تحمل والا ہے۔

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے اس لیئے یہ ظاہر فرمادیا کہ وہ مستغنی ہے، اور بردبار ہے۔

انسانوں میں بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے، مثلاً انتقام کے مقابلہ میں حلم اگر اس برائی کرنے والے کو رام کرنے کے لیئے کسی کو زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے کہ اس کو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے، لیکن خدا کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے اس کا حلم کامل استغنا کے ساتھ ہے۔

حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت میں تعریف کے قابل ہے لیکن اس کی ایک ہی حیثیت ایسی ہے کہ اس سے بعض کم فہموں کے نزدیک حلیم اور بردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہے، اور اسی لیئے اس کے مقابلہ میں ان میں سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس کمزوری سے واقف تھا اس لیئے اس نے اپنے حلم اور وارد گیر دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے تا کہ اس سخت گیری کے سبب سے بندوں میں مایوسی، اور بردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو، فرمایا:

واعلموا ان اللہ یعلم ما فی انفسکم فاحذروہ
واعلموآ ان اللہ غفور حلیم۔ (بقرہ:۳)

(اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمہارے دلوں میں ہے، تو اس سے ڈرتے رہو اور، جان رکھو کہ بخشش والا ہے تحمل والا۔)

یہ آیت عورت کے نکاح ثانی کے سلسلہ میں ہے' یعنی جب تک اس کی عدت کے دن پورے نہ ہوں کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے اور نکاح نہ کرے دل میں رہے تو کوئی حرج نہیں' اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کا ہر بھید معلوم ہے ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی' اس لیئے ایک طرف تو اس کی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو دوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہے اس لیئے اس سے پر امید بھی رہنا چاہئے۔

نیکی کے کاموں میں مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے اس موقع پر اس کا ارشاد ہے:

ان تقرضوا الله قرضا حسنا يضعفه لكم و يغفرلكم' والله شكور حليم (تغابن: ۲)

اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض دینا تو وہ اس کو دونا کر دے گا' اور تمہیں معاف کرے گا' اور اللہ ہے قدر دان اور تحمل والا۔

اس کی قدر دانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلے دو دے گا' اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا۔

اس میں تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے' کسی قصوروار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں' اور اس کی خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ اس لیئے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے' لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی یا اس میں ایک عیب ہے مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کر کے اس کی غلطی سے درگذر کرنا آسان ہو جاتا ہے' چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وہ اس کی غلطی سے درگذر کرتا ہے۔

صفت حلم سے انبیائے کرام بھی متصف فرمائے گئے ہیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ جن کی بنیادوں پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے' خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں۔حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذاب الٰہی سے بچ جائے انہوں نے اس کافر باپ کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہے اور آخر مجبور ہو کر اس سے علیحدگی پر مجبور ہوئے' پھر بھی ان کی بردباری اور تحمل کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس وقت تک اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے۔جب تک ان کو پوری مایوسی نہیں ہوگئی' اور ان کو قطعی طور سے معلوم نہیں ہوگیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے۔اس واقعہ کے سلسلہ میں ہے:

وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الا عن موعدۃ وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرا منہ ان ابراھیم لا واہ حلیم۔(توبہ:۱۱۴)

اور (نہ تھا) ابراہیم کا اپنے باپ کے لیئے مغفرت کی دعا مانگنا مگر ایک وعدہ (کی وجہ) سے جو ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کرلیا تھا۔پھر ان کو (بھی) جب معلوم ہوگیا کہ خدا کا دشمن ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے بیشک ابراہیم البتہ بڑے نرم دل (اور) بردبار تھے (کہ باپ کے کافر ہونے کے باوجود خدا سے اس کی مغفرت مانگنے کا وعدہ کرلیا تھا۔)

دوسری آیت میں اس موقع پر جہاں قوم لوط کی بربادی کی خبر پا کر وہ اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کرتے ہیں۔ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ان ابراھیم لحلیم اواہ منیب (ھود:۷۵)

بیشک ابراہیم بردبار' نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم' عفو و درگذر' رفق و ملاطفت

اور صبر و استقلال کے مجموعہ کا نام ہے' چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اپنی توصیف میں حلیم کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیم کے وصف میں اواہ کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لیئے عفو و درگذر اور رفق و ملاطفت لازمی ہیں لیکن ایک اور آیت میں حضرت اسماعیلؑ کی نسبت فرمایا ہے :

فبشرنہ بغلم حلیم۔(والصفت:۳)

تو ہم نے ان کو (ابراہیم کو) ایک بڑے بردبار لڑکے (اسماعیل کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی۔

اس کے بعد جب ان کی قربانی کا حکم ہوا تو انہوں نے کہا ہے:

یابت افعل ما تومر ستجدنی ان شاء اللہ من الصبرین۔(والصفت:۳)

اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے تامل) اس کی تعمیل کیجئے ان شاءاللہ آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جز ہے حلم کی صفت خدا کو نہایت محبوب ہے چناں چہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو خدا پسند کرتا ہے یعنی حلم اور جلد بازی (۱)۔ نہ کرنا یعنی کوئی بات ہو تو بے سوچے سمجھے غصہ میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہئے۔

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے' آپ نے ہر بار یہ جواب دیا کہ ''غصہ نہ کرو'' اگر غصہ آ بھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ

(۱)۔ترمذی ابواب البر و الصلہ باب ماجاء فی التانی والعجلہت۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس (۱)۔ پر قابو رکھے' ایک اور حدیث میں ہے

کہ ''جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا' اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص کر مستحق ٹھہرائے گا۔(۲)۔''

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں' میں ان کے ساتھ ملتا ہوں وہ کاٹتے ہیں' میں بھلائی کرتا ہوں وہ بدی کرتے ہیں' وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں' میں تحمل کو راہ دیتا ہوں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ ''اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو' تو تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو' اور جب تک اس حالت پر قائم رہو گے خدا کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی۔(۴)۔''

---

(۱)۔بخاری کتاب الادب الحذر من الغضب۔ (۲)۔ ترمذی ابواب البر و الصلہ باب ماجاء فی کثرہ الغضب۔ (۳)۔ یعنی صلئہ رحم کا ہوں۔ (٤)۔ صحیح مسلم باب الرحم و ادب المفرد امام بخاری باب فضل صلئہ الرحم۔

رفق ولطف

رفق ولطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے جو بات کی جائے نرمی سے جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے اور جو مطالبہ کیا جائے وہ میٹھے طریقہ سے کہ دلوں کو موہ لے اور پتھر کو بھی موم کر دے اللہ تعالیٰ نے کئی آیتوں میں اپنے کو لطیف فرمایا (۱)۔ ہے اور حدیثوں میں اس کا نام رفیق آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندوں کے ساتھ ان کی خبر گیری اور رزق کا سامان پہنچانے میں رفق ولطف فرماتا ہے اور اپنے اس تلطف میں وہ ان کی اطاعت اور عدم اطاعت کی پروا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو بے سان گمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا اور ان کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعوں سے مصر لے آیا اور دشمن بھائیوں کو جس طرح ان کے سامنے نادم وشرمندہ کر کے ان کے آگے سرنگوں کر دیا اس کو یاد کر کے وہ فرماتے ہیں:

ان ربی لطیف لما یشاء انہ ھو العلیم الحکیم۔(یوسف: ۱۰۰)

بے شک میرا رب لطف کرنے والا ہے جس بات کا چاہے بیشک وہی علم والا حکمت والا ہے۔

حضرت یوسفؑ کو جو مشکلیں پیش آئیں اور پھر وہی مشکلیں جس طرح ان کی کامیابی کا ذریعہ بنیں۔ ان کی حکمت کو خدا ہی جانتا تھا اور اسی کو اس کی خبر تھی۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ اپنے رفق وتلطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے:

اللہ لطیف بعبادہ یرزق من یشاء وھو القوی العزیز (شوریٰ: ۲)

اللہ اپنے بندوں پر لطف فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے اور وہی قوت والا غالب ہے۔

اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے مومنوں اور کافروں کا ذکر ہے' اور نیچے بھی ان دونوں قسموں کا

(۱)۔راغب اصفہانی ''لطیف'' کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں ''وہ اپنے بندوں کی راہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے'(لفظ لطف)

امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں ''خدا کا نام لطیف اس لئے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے' اور ان کے لئے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے لطیف اس لئے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے' ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا۔ابن الاعرابی کا قول ہے' لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائمت (رفق) سے پہنچا دیتا ہے ص ۴۷ الہ آباد۔

امام غزالی کہتے ہیں۔اس صفت کا مستحق وہی ہے جو نازک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے پھر ان کو نرمی کے طریق سے سختی سے نہیں' اس تک پہنچتا ہے جس کے حق میں وہ مفید ہیں' جب عمل میں نرمی اور ادراک میں لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لئے ہے (روح المعانی' تفسیر شوری)

تذکرہ ہے بیچ میں یہ آیت ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطف الٰہی کافر و مومن دونوں کے ساتھ ہے کہ دونوں کو یکساں وہ رزق پہنچاتا ہے (۱)۔اور اسی لیئے قیامت کو راز رکھنا بھی اس کے الطاف بے کراں کا ایک نتیجہ ہے۔

ملت حنیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے کافر باپ کے حق میں جب دعائے مغفرت کے طالب ہوئے تو بارگاہ الٰہی میں گو یہ دعا مستجاب (۲)۔نہ ہوئی مگر ابراہیمؑ کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی' ارشاد ہوا :

تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم ان کے لیئے نرم دل ہوئے
اور اگر تم مزاج کے اکھڑ اور دل کے سخت ہوتے تو یہ لوگ
تمہارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے۔

اس لیئے پیغمبر کے لیئے یہ وصف نہایت اہم ہے تا کہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو۔ اور وہ اس کے حلقہ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں اور اسی لیئے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک میں

(۱)۔صحیح مسلم کتاب البر و الصلہ باب فضل الرفق (۲)۔ تفسیر روح المعانی میں مقاتل کا بھی قول ہے صاحب روح المعانی اور امام فخر رازی بھی عموم کو واضح جانتے ہیں (۳)۔ حضرت ابراھیم نے اپنے کی حالت پر اطلاع پا کر اس کے بعد ان سے اپنی علیحدگی ظاہر کر دی۔

یہ وصف سب سے نمایاں طور پر ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالی نے اس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری، عفوودرگذر، چشم پوشی اور خوش خلقی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام جن میں شان جمالی پائی جاتی ہے، یہی رفق وتلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے جس طرح حسن فطرت زینت وآرائش سے دوبالا ہو جاتا ہے اسی طرح رفق ونرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دوچند ہو جاتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی فرمایا:

ان الرفق لا یکون فی شئی الازانہ ولا ینزع من شئی الا شانہ۔ (۱)۔):(

نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے۔

''جس چیز'' کا لفظ کتنا عام ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی اور سختی بگاڑتی ہے۔ الا یہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہے۔

حضرت عائشہ ؓ رضی ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نرم خو (رقیق) ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا۔ (۲)۔ جریرؓ بن عبداللہ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جو نرمی سے محروم رہا وہ بھلائی سے محروم رہا (۳)۔'' اور فرمایا کہ تین خصلتیں جس چیز میں ہوں گی خدا اپنے سایہ کو اس پر پھیلائے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا۔ باپ ماں پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا۔'' (۴)۔

اس اخلاقی وصف کی تعلیم آپ نے دوسرے الفاظ میں یوں دی:

الا اخبرکم بمن یحرم علی النار وتحرم علیہ النار علی کل قریب ھین سھل۔ (۵)۔):(

کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون شخص آگ پر حرام ہے اور کس پر آگ حرام ہے، ہر اس شخص پر جو لوگوں سے قریب ہو نرم اور آسان ہو۔

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا السام علیکم یعنی تم کو موت آئے حضرت عائشہ سمجھ گئیں اور انہوں نے جواب میں کہا ''وعلیکم السام واللعنۃ'' یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا تو فرمایا ''کہ عائشہ ٹھہر جاؤ خدا تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے، بولیں یا رسول اللہ! انہوں نے جو کچھ کہا کیا آپ ﷺ نے نہیں سنا فرمایا میں نے بھی تو کہہ دیا کہ وعلیک یعنی ''تم پر'' (۶)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جواب میں یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی مگر اس میں سختی کا نشان نہیں، اور پھر اس طرح سے ہے کہ مخاطب ذرا سوچے تو خود بخود اس کا دل شرمندہ ہو۔

شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے اس کا موقع وہ

ہے جب کوئی

(۱)۔(۲)۔ (۳)۔ صحیح مسلم کتاب البر و الصلہ باب فی فضل الرفق (٤)۔ ترمذی ابواب الزھد (٥)۔ ایضًا (٦)۔ بخاری کتاب الادب باب الرفق فی الامر کلہ۔

شخص حدود الٰہی میں سے کسی کو توڑ ڈالے اور جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو، چناں چہ کفار اور منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں، بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں تو ان کے شر کو روکنے اور ان کی سازشوں کے قلع قمع کرنے کے لیئے ان پر پوری سختی کی جاسکتی ہے فرمایا:

یایھا النبی جاھد الکفار والمنفقین واغلظ علیھم۔(تحریم:۲)

اے پیغمبر! کافروں اور دغابازوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی رکھو۔

دوسری جگہ فرمایا:

یایھا الذین امنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظۃ۔(توبہ:۱۲۳)

اے مسلمانوں! اپنے نزدیک کے کافروں سے لڑتے جاؤ اور چاہیئے وہ تم میں کڑا پن پائیں۔

اسی طرح شریعت کے گناہگاروں کو جب سزا دی جائے تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس کے اجرا میں نرمی نہ برتیں مسلمان بدکار مردوں اور بدکار عورتوں کی سزا کے متعلق فرمایا:

ولا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللہ ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر(نور:۱)

اور اللہ کے حکم چلانے میں تم کو ان دونوں پر ترس نہ آئے اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکارم اخلاق کا جو بیان حضرت

عائشہ ~ رضی ۵~ سے مروی ہے اس میں بھی نرمی اور سختی کے مواقع میں یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا' البتہ جب احکام الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ ﷺ اس کو سزا دیتے تھے (۲)۔ امام بخاری نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں' جن میں آپ نے مسلمانوں بلکہ ازواجؓ مطہرات تک پر کسی بات میں سختی برتی ہے (۳)۔' حافظ ابن حجر اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں:

گو امام بخاری اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے لیکن خدا کے حق میں آپ اس سختی سے کام لیتے تھے جس کا خدا نے حکم دیا تھا۔ (فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۴۲۹ مصر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ''آسانی کرو' سختی نہ کرو (۴)۔ شارحین حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل ومباحات میں سختی نہ برتی جائے اور شریعت نے جس حد تک گنجائش اور وسعت رکھی ہو اس میں تنگی نہ کی جائے' ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ میں ایک شرعی غلط ہوگئی' انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے چلو' ان سب نے معاملہ کی اہمیت کے ڈر سے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو انہوں نے اکیلے ہی خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر حقیقت حال عرض کی' ارشاد ہوا کہ ایک غلام کی گردن آزاد کرو۔ وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ ''یا رسول اللہ صلی اللہ

(۱)۔ بخاری کتاب الادب باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا (۲)۔ باب یجوز من الغضب والشدہ لامر اللہ تعالی (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الادب یسرا ولا تعسرا۔

علیہ وآلہ وسلم اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں' فرمایا لگاتار دو مہینے روزے

رکھو، گذارش کی کہ یا رسول اللہ! روزہ ہی میں تو یہ حرکت ہوئی پھر روزہ رکھوں، فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، عرض پرواز ہوئے کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک میں رات گزاری، ہے فرمایا کہ صدقہ کے فلاں محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنا چھوہارے لے لو اس سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا کر جو بچ رہے وہ خود کھاؤ، وہ صحابی ہنسی خوشی اپنی قوم میں آئے اور اپنی روداد بیان کر کے بولے کہ ''میں نے تمہارے پاس تنگی اور بری رائے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی۔''(۱)۔

''جو شخص خدا کے لیئے خاکساری کرتا ہے خدا اس کو بلند کر دیتا ہے۔(۱)۔ایک اور حدیث میں فرمایا کہ ''جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے لیکن وہ خاکساری سے اس کو نہیں پہنتا تو خدا اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ ایمان کا جو حلہ پسند کرے اس کو پہن لے۔(۲)۔

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لیئے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے' جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو تا کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے' اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے(۳)۔اس سے یہ معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطافت پیدا کرنا ہے' اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہیئے۔

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرنے میں ایک دوسرے کے ادب و احترام اور لطف و محبت کا پہلو ملحوظ رکھے۔تا کہ آپس میں خوشگوار تعلقات پیدا ہوں' اور باہم مروت اور محبت بڑھے سلام کرنا۔شکریہ ادا کرنا' حال پوچھنا۔ایک دوسرے کو نیک دعائیں دینا۔اچھی باتیں کرنا' اچھی باتیں سمجھنا اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہیں' خدا تعالی نے توراہ میں بنی اسرائیل کو لوگوں کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا اس کو قرآن پاک میں بھی دہرایا ہے۔

وقولوا للناس حسنا(بقرہ: ۱)

اور کہو لوگوں سے اچھی بات۔

اس بات کہنے میں لوگوں کے فائدہ اور کلام کی باتوں کا کہنا' نصیحت کرنا' اچھی باتوں کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے' ایک اور آیت میں یہی حکم دوسرے لفظوں میں

اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پہچان بن جاتا ہے' ارشاد ہے:

وقل لعبادی یقولوا التی ھی احسن ان الشیطن ینزغ بینھم ان الشیطن کان للانسان عدوا مبینا۔ (بنیاسرائیل:۲)

اور (اے پیغمبر)! میرے بندوں سے کہہ دے کہ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو' بیشک شیطان جھڑ پواتا ہے آپس میں بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

آیت کے پچھلے حصہ میں دعویٰ کی دلیل بھی دے دی گئی ہے کہ خوش گوئی اور خوش کلامی آپس میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے' اور بدگوئی و بدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے جو شیطان کا کام ہے وہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں غصہ نفرت حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے۔ اس لیئے اللہ کے بندوں کو چاہیئے کہ نیک بات بولیں' نیک بات کہیں' اچھے لہجہ

(۱)۔ترمذی باب البر و الصلہ باب ماجاء فی التواضع (۲)۔ ترمذی ابواب الزھد (۳)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی المواخاہ۔

میں کہیں' اور نرمی سے کہیں کہ آپس میں میل ملاپ اور مہر و محبت پیدا ہو۔ اسی لیئے تنابز بالالقاب یعنی ایک دوسرے کو برے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطابوں سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے' کسی کو یا کافر یا منافق اور تحقیر و کراہت کے دوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس میں اس اچھی بات کے خلاف جو آپ اس کو سمجھانا چاہتے' پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دینا ہے' فرمایا:

ولا تلمزوا انفسکم ولا تنابروا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان (حجرات:۲)

اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے کو طعن دو اور نہ چڑھ کا نام لے کر پکارو' ایمان کے بعد گنہگاری برا نام ہے۔

اسی لیئے برائیوں کے تذکروں' اور بدگوئیوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے' ارشاد ہے۔

لا یحب اللہ الجھر بالسو من القول الا من ظلم

(نساء: ۲۱)

اللہ کو بری بات کا پکارنا خوش نہیں آتا' مگر جس پر ظلم ہو ہو

(اس کو حق ہے کہ ظالم کے ظلموں کو بیان کرے۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے' نہ لعنت بھیجتا ہے' نہ بدزبانی اور فحش کلامی کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت اونچی ہونی چاہیئے اس کی زبان سے حق و صداقت' بہبودی و خیرخواہی اور نیکی و بھلائی کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے' کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا' اگر تمہیں بھی کوئی برا کہے تو ہو سکے تو چپ رہو کہ اس کی جزا آج نہیں تو کل اس کو مل کر رہے گی۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا' اور روئے انور پر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر ظاہر ہوا' پھر ارشاد فرمایا' دوزخ سے بچو۔ اگر چہ چھوہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات سے ہو اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے جنت کا ذکر فرمایا اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا' ایک بدوی صحابی مجلس میں حاضر تھے۔ بے تابانہ بولے کہ یا رسول اللہ یہ جنت کس کو ملے گی؟ فرمایا جس نے خوش کلامی کی' بھوکوں کو کھلایا' اکثر روزے رکھے اور اس وقت نماز پڑھی جب دنیا سوتی ہو۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھی بات صدقہ ہے یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دلجوئی کی جاتی ہے' اسی طرح زبان کی مٹھاس سے اس کے زخموں پر پھاہا رکھا جا سکتا ہے اور سچی سعی و سفارش سے اس کو مدد پہنچائی جا سکتی ہے۔

ایک صحابی نے پوچھا کہ ''یا رسول اللہ نجات کیوں کر ملے' فرمایا'' اپنی زبان پر قابو

پر قابو رکھو اور تمہارے گھر میں تمہاری گنجائش ہو اور اپنے گناہوں پر رویا کرو ایک دفعہ ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا اس کا ڈر ہے

(۱)۔صحیح بخاری باب طیب الکلام (۲)۔ صحیح مسلم کتاب الایمان (۳)۔ ترمذی کتاب البر والصلہ باب ما جاء فی اللغتہ (٤)۔ ترمذی ماجاء فی قول المعروف (٥)۔ صحیح بخاری کتاب الصلح (٦)۔ ترمذی باب حفظ اللسان (۷)۔ ترمذی ایضاً

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے خود بھوکا رہے اور دوسروں کو کھلائے' خود تکلیف اٹھائے' اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔

صحابہ کرام میں انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہ تھا کہ مکہ کے مہاجر جب یہ بے خانماں ہو کر اور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کو اپنے گھر دیئے' باغ دیئے' کھیت دیئے' اپنی محنتوں میں ان کو شریک کیا اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر ان کو آرام پہنچایا۔ پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو انصاریوں کے سوا باقی ساری زمین مہاجروں کو دے دی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کرلیا' اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور ان کی مدح وستائش کی۔

والذین تبوو الدار والایمان من قبلہم یحبون من ھاجر الیھم ولا یجدون فی صدورھم حاجت مما اوتوا ویرثرون علی انفسہم ولو کان بھم خصاصہت ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون۔

(حشر:۱)

اور ان کے واسطے جنہوں نے ان (مہاجروں کی آمد) سے پہلے اس مقام (مدینہ) میں اور ایمان میں جگہ پکڑی اور محبت رکھتے ہیں ان سے جو اپنا گھر چھوڑ کر ان کے پاس چلا آیا اور ان (مہاجروں) کو دئے جانے سے دل میں کوئی مطب نہیں رکھتے اور اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو (ان مہاجروں بھائیوں) اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔

خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ~ صل۳ ~ نے فرمایا خدا تعالیٰ تمہارے اس احسن سلوک سے بہت خوش ہوا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ اوپر کی آیت میں انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے لیکن قرآن پاک کا سیاق و سباق عموم کو چاہتا ہے جس میں یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہوں گے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

اعتدال اور میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے، جس میں وہ منفرد ہے، اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسلمانوں میں افراط وتفریط کے بیچ سے نکلا ہے، قرآن پاک نے مسلمانوں کو امتہ "وسطا" (بیچ کی امت) کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط وتفریط کے درمیان ہے اس لیئے اس نے اکثر معاملوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے، انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو وہ نہیں بھولا ہے۔

دعا یا نماز میں ہماری آواز کتنی ہو، ارشاد ہے۔

ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها وابتغ بين ذلك سبيلا (بنی اسرائیل: ۲۲)

اور نہ پکارو اپنی دعا (یا نماز) میں اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈے اس کے بیچ میں راہ

یعنی نہ چلا کر دعا کی جائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمائش ہو جائے، یا مخالف اس کو سن کر برا بھلا کہے اور نہ بالکل چپکے چپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سن سکیں، بلکہ دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی جائے۔

ہماری چال ڈھال کیسی ہو، اس کی نسبت حضرت لقمانؑ کے نصائح میں ہے۔

واقصد فی مشیك (لقمان: ۱)

اور چل بیچ کی چال۔

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال میں متانت اور وقار نہ باقی رہے، اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریاکار زاہدوں کی نمائشی چال بن جائے۔

---

(۱)۔صحیح بخاری باب حسن الخلق و باب من استعد الکفن (۲)۔ صحیح مسلم الاشربہ باب اکرام الضیف و فضل ایثارہ و صحیح بخاری تفسیر سورئہ حشر (۳)۔ ایضاً (٤)۔ تفسیر کبیر رازی آیت

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں سارے مذہبوں نی اس کی تاکید پر تاکید کی ہے اور جو جس قدر زیادہ لٹا سکے اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے لیکن اسلام نے اس راہ میں بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے اور اس کو اچھا نہیں سمجھا ہے کہ دوسروں کو دیکر تم خود اپنے محتاج بن جاؤ کہ بھیک مانگنے کی نوبت آ جائے اور محتاجوں میں ایک نئے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے' فرمایا:

ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملوما محسورا (بنی اسرائیل:۳)

اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں باندھ لے' اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ تو بیٹھ جائے ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا۔

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیتوں کے سلسلہ میں کہا۔

والذين اذا انفقوا لم يسرفوا ولم يقتروا وكان بين ذلك قواما۔ (فرقان:۶)

اور جو خرچ کریں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں' اور ہوس کے درمیان اعتدال سے۔

یعنی نہ اسراف ہو' نہ بخل ہو' درمیان کی چال ہو۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اكلفوا من الاعمال ماتطيقون۔

اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کر سکو۔

"عمل کا لفظ گو یہاں عام ہے مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد نماز و روزہ وغیرہ عبادتیں ہیں (۱)۔ مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو اور آخر دم تک نباہ سکو' دوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ وہ زندگی کے ہر

شعبہ تک وسیع ہے' مسند بزاز میں حضرت حذیفہ صحابیؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا (۲)۔:

ما احسن القصد فی الغنی ما احسن القصد فی الفقر
ما احسن القصد فی العبادہت۔

دولتمندی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے' عبادت میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولتمند ہو کہ انسان قارون وقت بن کر حق سے غافل ہو جائے نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے' لوگ دولتمند ہو کر اس قدر شان وشکوہ' عز وجاہ اور عیش وتنعم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں' اور یہ بے اعتدالی ہے' ان دونوں حالتوں میں اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولتمندی کی حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہئے نہ محتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گر جانا چاہئے۔

عبادت سے بڑھ کر اسلام میں کوئی نیکی کا کام نہیں اسلام نے اس میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے' نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندوں کے لائق نہ رہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہو جائے' حضرت عثمانؓ بن مظعون کا واقعہ سیرت میں کئی دفعہ گذر چکا ہے کہ انہوں نے جب راتیں نمازوں اور دن روزوں میں بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا کہ تمہارے ذمہ اور بھی حق ہیں۔

---

(۱)۔فتح الباری جلد ۱۱ ص ۲۵۶ (۲)۔ بروایت کنز العمال جلد ثانی ۷ حیدرآباد دکن۔

خودداری یا عزت نفس

یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت' اپنی شان' اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے زندگی میں اس کے موقعے کثرت سے پیش آتے ہیں' اٹھنے' بیٹھنے' چلنے پھرنے' کھانے پینے' اوڑھنے پہننے غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لیئے اس کی ضرورت ہوتی ہے جس میں یہ وصف نہ ہوگا' اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی' نہ خیال کی رفعت' نہ اخلاق کی اونچائی نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوگی' نہ اس کی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا' اور نہ اس کی طرف لوگ متوجہ ہوں گے' اور نہ اس کو مجلس میں وقار حاصل ہوگا۔

یہ عزت و وقار سب سے پہلے اس بلند و برتر ذات الٰہی میں ہے جو ساری عزتوں کا مرکز ہے چنانچہ قرآن پاک میں بہتر (۷۲) موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام عزیز لیا گیا ہے عزیز کے معنی ہیں عزت (۱)۔والا اور غالب کہیں کہیں قوی کے ساتھ (قوی قوت والا) یا مقتدر (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے۔

اس لیئے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی سچی عزت ہے جو اس کے وسیلہ سے حاصل ہو اسلام جب کمزور تھا منافق لوگ ادھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور ادھر کافروں کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ عزت کے سبب سے ان کی دوستی کے بھی طلبگار تھے' تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھولدیا۔

ایبتغون عندھم العزبت فان العزبت للہ جمیعا۔(نساء: ۲۰)

کیا یہ ان کے پاس عزت چاہتے ہیں تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری خدا کے واسطے ہے۔

فرمایا اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے۔

من کان یرید العزہت فللہ العزہت جمیعا (فاطر: ۴)

جوعزت چاہےتو عزت تو ساری اللہ کی ہے۔

تعز من تشاء و تذل من تشاء (آل عمران: ۳)

(اے خدا) تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔

ایک دفعہ ایک غزوہ میں منافقوں کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معززان ذلیل لوگوں یعنی مسلمانوں کو یا (نعوذ باللہ) محمد رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نکال دیں گے' اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

وللہ العزہت ولرسولہ وللموء منین ولکن المنفقین لا یعلمون (منافقون: ۱)

اور عزت تو اللہ کیلئے ہے' اور اس کے رسول کیلئے اور ایمان والوں کیلئے لیکن منافق نہیں جانتے۔

(۱)۔عزہ کا لفظ قرآن میں شدت' غلبہ' عزوشرف اور نخوت (حمیت) کئی معنوں میں آیا ہے اس لئے ہر جگہ اس کے وہ معنی لئے جائیں جو سیاق وسباق کے مناسب ہو اس کا اصل مفہوم جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے' یہ ہے۔کسی کا ایسی حالت ومنزلت میں ہونا کہ اس کوئی دبا نہ سکے (دیکھو لسان العرب ومفردات راغب اصفہانی وابن جریر طبری آیات عزت وسورہ بقرہ ونساء وص ومنافقون)

اس آیت پاک نے مسلمانوں کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہ جائے گی اس لیئے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہئے' اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہئے' اور اسی لیئے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہئے' تعلیم محمدی ﷺ کے اثر سے صحابہ کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے' صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے جب کفار کے ساتھ صلح کی شرائط پر جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منظور فرمالیا

تھا' اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ ان کے اندر کام کر رہا تھا' حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہیں ہیں' ارشاد ہوا' بیشک ایسا ہی ہے ''عرض کی'' تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیوں برداشت کریں (۱)۔ ارشاد ہوا میں خدا کا رسول ہوں' اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا حضرت عمرؓ کی محدود نظر جہاں تک کام کر رہی تھی' رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر اس کے بہت آگے تھی' اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا۔

غزوۂ خندق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کے لیئے قبیلہ غطفاء غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصہ دیا جایا کرے گا' لیکن جب انصارؓ کے سرداروں کو بلا کر آپ ﷺ نے مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کی۔

یا رسول اللہ! جب ہم بتوں کو پوجا کرتے تھے اور خدا سے بے خبر تھے' تب تو ان کو ہم سے لینے کی ہمت نہیں ہوئی اور اب جبکہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے اور اس کے اور حضور ﷺ کے بدولت ہم عزت پا چکے ہیں' ہم ان کو یوں اپنا مال دینا منظور کریں گے! خدا کی قسم ہمیں اس معاہدہ کی ضرورت نہیں۔ (۲)۔

صحابہ کرام جب خلافت کے زمانہ میں قیصر و کسری کے مقابلہ میں صف آرا تھے' ان کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے درباروں میں بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری اور آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا مسلمان جب تک مسلمان رہے یہی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مندیوں اور اولوالعزمیوں کا باعث تھا' اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے اپنی مذہبی عزت اور خودداری کا احساس رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے بحیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے اور ہر وقت اس کے کان میں یہ آواز آتی ہے۔

کنتم خیر امتہت اخرجت للناس۔ (آل عمران:۱۲)

تم بہترین امت ہو جولوگوں (کی سربراہی) کے لیئے ظہور میں لائی گئی۔

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے عرض کی کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ میں غرور ہے فرمایا غرور نہیں' خودداری (عزت) ہے' یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہیں'' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

ایک مسلمان صالح بی بی کے پروانے تھے تو بولیں کیا میں مسلمان نہیں' یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت

---

(۱)۔صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد (۲)۔ سیرہ ابن ہشام و تاریخ طبری ذکر واقعہ احزاب بسندہ

نہیں' اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہیں۔

شیخ ابوحفص سہروردی کہتے ہیں کہ ''خودداری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے کیونکہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وہ فانی باتوں کی پستی میں نہ پڑ جائے' اور غرور اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش کر جانے اور اس کو اس کی جگہ سے اوپر لیجانے کو کہتے ہیں۔''(۱)۔

یہ خودداری عین شرافت ہے' جس میں یہ خودداری نہیں' لوگوں کی آنکھوں میں اس کا وقار نہیں اس وقار اور خودداری کے لیئے اگر ہاتھ میں قدرت نہ ہو' یا مصلحت نہ ہو تو بہت سی باتوں سے اغراض اور درگزر کرنا پڑتا ہے قرآن میں سچے مسلمانوں کے وصف کے سلسلہ میں ہے۔

واذا مروا باللغو واکراما (فرقان:۲)

اور جب وہ ہو نکلیں بیہودہ باتوں کی طرف سے تو گزر جائیں شریفانہ۔

یعنی اس شریفانہ انداز، رکھ رکھاؤ اور خودداری کی شان سے گزر جائیں کہ نہ وہ آپ ادھر متوجہ ہوں اور نہ ان شریروں کو انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے۔

اس اخلاقی خودداری، اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے چال ڈھال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھا پن یا تنگ ظرفی یا غرور نمائش کی بو تک نہ آئے، یعنی اس میں اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا جز شامل نہ ہو یہی چیز ہے جس سے خودداری، غرور اور نمائش میں فرق و امتیاز کیا جا سکتا ہے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا اس پر ایک شخص نے کہا کہ مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے مطلب یہ کہ یہ تو غرور میں داخل نہیں ارشاد ہوا کہ خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے، غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے۔

اسلام میں صاف ستھرے رہنے کا جو حکم ہے طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے گرنے نہ پائے، کیونکہ گندے آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے تو فرمایا کہ کیا اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا: کیا کپڑے دھونے کے لئے اس کو پانی میسر نہ تھا ایک شخص نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا، فرمایا ''تمہارے پاس کچھ مال ہے؟'' اس نے کہا ''اونٹ، بکری گھوڑے تمام سب کچھ ہیں'' ارشاد ہوا کہ ''جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل اور احسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہئے۔(۳)۔

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے اسی لیئے اسلام نے ہر حالت میں وقار

(۱)۔یہ اقوال امام رازی اور صاحب روح المعانی نے سورہ منافقون کی آیت کی تفسیر میں لکھے ہیں (۲)۔ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الکبر (۳)۔ ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب واللتان۔

کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے' نماز سے زیادہ اورکون سی عبادت ضروری ہوسکتی ہے لیکن اس کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اذا سمعتم الاقامۃ فامشوا الی الصلوۃ وعلیکم بالسکینۃ والوقار ولا تسرعوا۔ (۱)۔

جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیئے سکون اور وقار کے ساتھ چلو' جلدی نہ کرو۔

لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جب تکبر سنتے یا رکوع میں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ چلی جائے' مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے' اور اسی لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا آہستہ چلنا' نگاہ کا جھکائے رکھنا' آواز کا پست کرنا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اس وقار میں داخل ہے۔

وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے اور اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ ابوداؤد نے کتاب الادب باب الوقار میں یہ حدیث نقل کی ہے۔

الھدی الصالح والسمت الصالح والاقتصاد جزء من خمسۃ وعشرین جزء من النبوۃ

نیک طور طریق' نیک انداز' اور میانہ روی' نبوت کے پچیس اجزا میں سے ایک چیز ہے۔

کیونکہ ان میں اخلاقی خوبیوں کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے' اور وہ خود بھی ان خوبیوں کی بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کر کے خوددار بنتا ہے۔

صحیح بخاری میں ایک اور لفظ وِل کا ہے' اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ انسان

رفتار، گفتار، شکل وصورت وضع ولباس اور اپنی عام روش میں باوقار رہے اور نیک مسلمانوں کا طور وطریقہ اختیار کرے، اسلام نے خصال فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل میں نظر آتا ہے، سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا ''وقار'' بولے، خداوند میرے وقار کو اور بڑھاؤ۔''

فقر وفاقہ کی حالت یا حرص وطمع کے موقع پر انسان سے جو خودداری ظاہر ہوتی ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استعفاف ہے اور شریعت میں وہ ایک قابل ستائش اخلاقی وصف ہے اور اسی وصف کے ساتھ متصف اور استعفاف ہونے کی بنا پر خداوند تعالیٰ نے اصحاب صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے۔

للفقراء الذين احصروا فى سبيل الله لا يستطيعون ضربا وفى الارض يحسبهم الجاهل اغنياء من التعفف تعرفهم بسيمهم لا يسئلون الناس الحافا (بقرہ:۲۷۳)

(خیرات تو) ان حاجتمندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھر بیٹھے ہیں، ملک میں کسی طرف کو جا نہیں سکتے، بے خبر ان کی خودداری (کی وجہ) سے ان کو غنی سمجھتا ہے، تو (ان کو دیکھے تو) ان کی صورت میں ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔

اس آیت میں فقر وفاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے اس کا اندازہ اس

(۱)۔بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الی الصلوٰۃ ولیاتھا باسکینھت والوقار

(۲)۔ ادب المفرد باب الحنان للکبیر۔

آیت کے بعض فقروں کی تفسیر سے ہوسکتا ہے صاحب کشاف نے ''لایسئلون

الناس الحافا'' کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''وہ سوال تو کرتے ہیں لیکن لجاجت و اصرار کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں'' لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ ان کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے ناواقف ہیں ان کو دولت مند سمجھتے ہیں تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی' اصحاب صفہ صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لیئے سوال نہ کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے لیکن اپنی حاجت سے فقر و فاقہ کا اظہار کرتا ہے تو اس کی یہی خاموشی لجاجت و اصرار کا سوال ہے کیونکہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے اور خاموشی اسی بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں اس لیئے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو ان کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے اس لیئے یہ حالت خود لجاجت و اصرار کا سوال ہے' پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحاب صفہ لوگوں سے لجاحت و اصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے پھٹے حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے۔ (۱)۔

سوال کی سب سے متبذل صورت گداگری ہے' اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا'' یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت و آبرو گنوا دی ہے' چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے' رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ مانگا' آپ ﷺ نے دے دیا' پھر سوال کیا اور آپ ﷺ نے پھر دیا لیکن جب سب مال ختم ہو چکا' تو فرمایا ''میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کروں گا' جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے' خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے' خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے خدا اس کو صبر دیتا ہے' خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہیں دیا۔

فقر و فاقہ کی حالت میں عام آدمیوں سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کی احتیاج دور نہیں ہوتی' لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کر دے خواہ مرگ ناگہانی کے ذریعہ سے' خواہ فوری مال کے ذریعہ سے۔

روزمرہ کے معمولی کاموں میں لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا برا نہیں جانتے لیکن کمال خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں میں بھی احتیاط قائم رہے' مثلاً اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اٹھا دو

(۱)۔تفسیر کبیر جلد ثانی ص ۵۲۶' ۵۲۷

میز پر کتاب رکھ دو تو گو بظاہر یہ سوال خودداری کے منافی نہیں معلوم ہوتا' لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچے گا اسی لیئے کمال خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستوں سے بھی احتراز کیا جائے' ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی جن میں ایک بات یہ تھی۔ لاتسالوا الناس شیئا۔ (تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا)

ان میں سے بعض صحابہؓ نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر ان کا کوڑا

گر جاتا ہے تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے پہلے تو اس کو اجازت ہی نہیں دی، پھر فرمایا کہ "اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کرو (۱)۔ صالحین کی تخصیص غالباً اسی لیئے کی گئی ہے کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پر سوال پورا کریں گے، ورنہ رفق و ملاطفت کے ساتھ اس کو رد کر دیں گے۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیئے اسلام اور ایمان کی نعمت و عزت اور وہ دولت ہے جس کے مقابلے میں ساری نعمتیں اور دولتیں ہیچ ہیں، جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پرواہ نہیں کرتا، وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا، وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا اور بحیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے اور یقین رکھتا رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لیئے ہے اور اس کی عطا سے رسول کے لیئے ہے اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کے لیئے ہے، اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے اور اس فیض تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ چڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہیں تو یہ کہہ کر اس کی اسلامی خودداری کو پیدا کرتے ہیں کہ "مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو" گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے جس کے برقرار رکھنے کے لیئے اس کو ہر قسم کی برائی سے ایک اور ہر دنائت اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہئے۔

اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہیں جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ تزک و احتشام، تکلف و تصنع اور جاہ و حشم کی نمائش کا نام نہیں بلکہ یہ کہ نفس کے تواضع اور دل کی خاکساری کے ساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر اس کو اونچا کر دے کہ اگر وہ غریب و مفلس اور کمزور بھی ہو تو وہ ہر ظاہر قوت کے سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ میں سربلند رہے، اور اگر وہ صاحب

امارات وحکومت ہوتو اپنے رعب ودبدبہ کے لیئے ظاہری نمائشی چیزوں کے بجائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے' بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ رومیوں سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام جارہے تھے جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالار اسلام حضرت ابوعبیدہؓ کچھ مسلمانوں کو لے کر استقبال کو نکلے جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی تھا تو حضرت عمرؓ ناقہ سے اتر آئے' پاؤں سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لیئے اور ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے' اور اسی شان سے اسلام کا فرمانروا رومیوں کے مقدس شہر میں داخل ہونے کے لیئے بڑھا' حضرت ابوعبیدہؓ نے عرض کی یا امیر المومنین

(۱)۔ابوداؤد کتاب الزکوہ باب کراھتہ المسئلہ و باب فی الاستعفاف میں یہ کل حدیثیں ھیں۔

آپ یہ کیا کررہے ہیں کہ موزے اتار کر آپ نے کندھے پر ڈال لیئے ہیں۔ اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپؓ اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو پانی میں لے چل رہے ہیں' یہ وہ موقع ہے کہ سارا شہر آپ کے دیکھنے کو امنڈ آیا ہے' حضرتؓ نے کہا اے ابوعبیدہؓ اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دے کر امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیئے عبرت بناتا' ہم سب سے ذلیل قوم تھے تو اللہ تعالی نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہیں گے تو خدا ہمیں ذلیل کرے گا۔(۱)۔

حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگا دے' اور جب وہ ایسا کرگزرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ

(۱)۔مستدرك حاكم جلد اول ص ٦٢ كتاب الايمان' على شرط صحيحين۔

اور ملت کی نظر میں راست باز اور سچا ٹھہرتا ہے اور جو جذبہ اس کو فرض پر آمادہ کرتا ہے وہی القا کا منشا ہے ایک اور موقع پر مسلمانوں کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے۔

ومن يولهم يومئذ دبره الا متحر فالقتال او متحيزا

اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میدان جنگ میں مقابل ہو تو ان کو پیٹھ مت دو۔

یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کا فرض ہے کہ وہ اس میں پیٹھ پھیر کر بزدلی نہ دکھائیں' بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈٹے رہیں۔اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو "ایمان والے" کہہ کر خطاب کیا ہے اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہی "ایمان" مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان مرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائے گا وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا۔

ومن يولهم يومئذ دبره الا متحر فالقتال او متحيزا الى فئهت فقد باء بغضب من الله وماوه جهنم وبئس المصيره (انفال:٦)

اور جو ان کو اس دن پیٹھ دے گا مگر یہ کہ لڑائی کا کوئی پیچ کرتا ہو' یا (مسلمان) دستہ سے جا ملتا ہو' تو وہ اللہ کا غضب لے پھرا' اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے' اور وہ کتنا برا ٹھکانا ہے۔

یہ تو سلبی تعلیم تھی' یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدان جنگ میں پیٹھ دکھانی چاہئے اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ ان کو اس کے لیئے ایجابی حکم دیتا ہے۔

يايهاالذين امنوا اذا لقيتم فئهت فاثبتوا (انفال:٦)

برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی برائی کی گئی ہے' بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ کے نام سے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کی جارہی تھی' متوحش ہو رہے تھے' اس پر وحی الٰہی نے ان کا ذکر مذمت کے ساتھ کیا۔

کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون (انفال: ۱)

گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جارہے ہیں' اور وہ دیکھ رہے ہیں۔

سورۂ احزاب میں منافقوں کی دلی کمزوری کا یہ نقشہ کھینچا ہے۔

فاذا جاء الخوف رائتھم ینظرون الیک تدرو اعینھم کالذی یغشی علیہ من الموت۔

جب ڈر کا وقت آئے تو ان کو دیکھے تو تیری طرف ٹکر ٹکر دیکھتے ہیں' ان کی آنکھیں گردش کھاتی ہیں' جیسے کسی پر موت کی غشی آجائے۔

سورۂ محمد میں ان کی دل کی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے۔

فاذا انزلت سورہت محکمہت و ذکر فیھا القتال رایت الذین فی قلوبھم مرض ینظرون الیک نظر المغشی علیہ من الموت فاولی لھم۔ (محمد: ۳)

جب اتری کوئی ثابت سورت اور مذکور ہو اس میں لڑائی تو تو ان کو جن کے دلوں میں روگ ہے دیکھے گا کہ تکتے ہیں' تیری طرف جیسے ٹک ٹکی لگائے وہ جس پر موت کی بیہوشی ہے' سو خرابی ہو ان کی۔

ایک اور آیت میں یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا۔

واذا رایتھم تعجبک اجسامھم وان یقولوا تسمع لقولھم کانھم خشب مسندہت یحسبون کل صیحتہت علیھم۔ (منافقون: ۱)

اور جب تو انہیں دیکھے' تو ان کے بدن اچھے معلوم ہوں اور

اگر بولیں تو ان کی بات تو سنے، جیسے ٹیک سے کھڑی کی ہوئی
لکڑیاں ہیں جو کوئی چیخے سمجھیں ہم ہی پر کوئی آفت آئی۔

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہی اور موٹائی سے نہیں بلکہ دل کی طاقت سے ہے جس سے منافق محروم ہیں، دیکھنے میں ان کے بدن بڑے سجیلے اور گٹھے ہوئے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، مگر دل کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر ذرا کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھیں، ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی لٹھوں کو ٹیک لگا کر کھڑا کر دے دیکھنے میں تو یہ بڑے لمبے تڑنگے اور موٹے تازے ہیں مگر چونکہ ان کی جڑیں مضبوط نہیں اس لیئے ذرا ٹھیلنے سے دھڑ سے زمین پر آ رہتے ہیں۔

(۱)۔تفسیر طبری آیت مذکورہ۔

اسلام اپنے پیروؤں میں شجاعت و بہادری کا جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اگر چہ اس میں مادی وجسمانی شجاعت سے یکسر اعراض وتغافل نہیں ہے لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہیں کی ہے، اسی لیئے اوپر کی آیت میں دیکھئے کہ منافقین کی جسمانی طول وعرض اور موٹائی کا مضحکہ اڑایا ہے اس لیئے ان میں شجاعت اور بہادری نہیں، اسی بنا پر وہ اپنے پیروؤں میں شجاعت اور بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہیں۔

۱۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا اس لیئے تعداد کی قلت و کثرت کوئی چیز نہیں، صرف فضل الٰہی اور نصرت خداوندی چاہیئے۔

۲۔ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، جب وہ آ جائے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی، اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہیں سکتا۔

۳۔ خدا کی راہ میں مارا جانا، زندگی کا بہترین مصرف ہے، اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے اور جو اس غزا میں مارا نہیں گیا وہ بھی بڑے بڑے ثوابوں کا

مستحق ہے۔

تعداد کی قلت وکثرت ::

تعداد کی قلت وکثرت پر جدوجہد کی کامیابی وناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے کامیابی وناکامی تعداد کی کمیت پر نہیں' بلکہ جدوجہد کرنے والوں کی ایمانی واخلاقی کیفیت پر منحصر ہے' تعداد گو کتنی ہی چھوٹی ہو اگر اس میں ایمان یقین کی قوت موجود ہے تو بفضل خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پاسکتی ہے' اس فلسفہ کو حضرت طالوت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ میں قرآن نے ان مختصر لفظوں میں سمجھادیا ہے۔

کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ (بقرہ:۳۳)

کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آ گیا ہے'

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو آمادۂ جہاد کرتے ہیں تو دل کے کمزور کہتے ہیں کہ ہم تو ان سے نہیں لڑیں گے۔

ان فیھا قوما جبارین (مائدہ:۴)

اس میں تو ایک زبردست قوم بستی ہے۔

اس وقت ان کی امت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہیں۔

فاذا دخلتموہ فانکم غلبون وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مئومنین۔ (مائدہ:۴)

تو جب تم شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو' اور اللہ پر بھروسہ کرو' اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

بدر اور احد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے' ارشاد ہوا۔

ولن تغنی عنکم فئتکم شیئا ولو کثرت وان اللہ مع المومنین۔ (انفال:۲)

اور تم کو تمہارا جتھا کچھ کام نہ آئے گا اگر چہ تعداد میں بہت ہو'
اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب
المتوکلین۔ ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم
تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ کر' بیشک اللہ توکل
کرنے والوں کو پیار کرتا ہے' اگر اللہ تمہاری مدد
وان یخذلکم فمن ذاالذی ینصرکم من بعدہ و علی
اللہ فلیتوکل المئومنون۔ (آل عمران:۱۷۰)
کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا
تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا اور مومنوں کو چاہیئے کہ
اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

فتح وشکست حکم الٰہی پر موقوف ہے' اور مدد اسی طرف سے آتی ہے۔

وما النصر الا من عند اللہ ان اللہ عزیز حکیم۔
(انفال: ۱۰)
اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے بے شک اللہ غالب
حکمت والا ہے۔

تعداد کی قلت کی تلافی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے' یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بتایا' بلکہ ان کو باقاعدہ بتا کر ہمیشہ کے لیئے خوشخبری سنادی' فرمایا کہ ایک پکا مسلمان اپنے دس گنے کے مقابل ہے ثابت قدم دس مسلمان سو پر اور بیس ایسے مسلمان دوسو کی فوج پر بھاری ہوں گے۔

یاایھاالنبی حرض المومنین علی القتال ان یکن منکم
عیشرون صابرون یغلبوا الفامن الذین کفروا بانھم
قوم لا یفقھون (انفال: ۹۰)
اے پیغمبر! مومنوں کو لڑائی کا شوق دلا' اگر تم مسلمانوں میں
سے بیس صابر (ثابت قدم) ہوں تو وہ دوسو پر غالب ہوں

دوں گا۔

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا' چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعوں اور لڑائی کے سامانوں پر بڑا گھمنڈ تھا۔ مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بے لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوئے۔

وقذف فی قلوبھم الرعب (احزاب:۳)

اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔

وقذف فی قلوبھم الرعب (حشر:۱)

اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔

اور جب تک مسلمانوں میں ایمان کی یہ قوت باقی ہے' خدا کا وعدہ پورا ہوتا رہے گا۔

موت کا وقت مقرر ہے ::

انسان کی کمزوری کی اصل وجہ موت کا ڈر ہے' اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کا ایک وقت مقرر ہے جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے' اور نہ بلائے آ سکتا ہے اس لیئے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وحی محمدی ۔ صل ۳ ۔ نے مسلمانوں کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے' یہاں تک کہ یہ چیز مسلمانوں کی رگ رگ میں سرایت کر گئی ہے۔ غزوۂ احد میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے' اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی' اور اس عقیدہ کو یاد دلایا۔

وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتبا موجلا (آل عمران:۵)

اور کسی جان کے بس میں نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا وہ مر سکے لکھا ہوا وقت مقرر ہے۔

جب اللہ کا حکم ہوگا تب ہی کوئی مر سکتا ہے' پھر موت سے خوف کیوں ہو۔ اور اس سے بزدلی کیوں چھائے جنگ احزاب میں جب منافقوں کو گھبراہٹ ہوئی تو خدا نے فرمایا۔

قل لن ینفعکم الفرار ان فررتم من الموت او القتل (احزاب:۲)

(اے پیغمبر ان سے) کہ اگر تم موت سے یا مارے جانے سے بھاگتے بھی تو یہ بھاگنا تم کو کام نہ آئے گا۔

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے سراپا غلط ہے جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی وہ خود آ کر اپنے اپنے مقام پر مارے جاتے فرمایا۔

قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیہم القتل الی مضاجعھم۔ (آل عمران:۱۶)

(اے پیغمبر ان سے) کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جس کا مارا جانا لکھا جا چکا تھا' وہ آپ نکل کے اپنے پڑاؤ پر آ جاتے ہیں۔

یہ سمجھنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوئے اس لیئے مارے گئے' یوں بھی غلط ہے کہ مارنا اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے' وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے' مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم کافروں جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہیں۔

لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا لیجعل اللہ ذلک حسرۃ فی قلوبھم واللہ یحیی و یمیت (آل عمران:۱۷)

اگر یہ (مرنے یا مارے جانیوالے) ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے (اور یہ خیال اس لئے ان کے دل میں آتا ہے) تا کہ اللہ ان کے اس خیال کو ان کی دلی حسرت بنائے اور (واقعہ تو یہ ہے کہ) اللہ جلاتا ہے اور مارتا ہے۔

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہیں تو ٹال لیں۔

قل فادرؤا عن انفسکم الموت ان کنتم صدقین (آل

عمران:۱۷)

اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت ہٹا تو لو۔

جو مسلمان ذرا دل کے کمزور تھے ان کے خطرہ کا ذکر کر کے ان کی تشفی کی گئی۔

فلما کتب علیھم القتال اذا فریق منھم یخشون الناس کخشیہت اللہ او اشد خشیہت ط و قالوا ربنا لم کتبت علینا القتال ج لو لا اخرتنا الی اجل قریب قل متاع الدنیا قلیل ط والاخرہت خیر لمن اتقی ولا تظلمون فتیلا۔ این ما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدہت (نساء:۱۱)

پھر جب ان کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہاں ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگا جیسے خدا سے ڈر ہو یا اس سے بھی بڑھ کر، اور کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی کیوں نہ ہم کو تھوڑے دن اور مہلت دی (اے پیغمبر) جواب دے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے، اور آخرت پرہیز گار کے لئے بہتر ہے، اور تمہارا حق ذرا بھی دبایا نہ جائے گا جہاں تم ہو گے موت تم کو پالے گی، اگر تم مضبوط قلعوں میں ہو۔

غرض کہیں بھی تم جا کر رہو موت سے چھٹکارا نہیں، پھر میدان جنگ سے تم کیوں گھبراؤ، بلکہ ان مجاہدوں کی طرح بنو جن کا ایمان جہاد کا نام سن کر اور تازہ ہو جاتا ہے۔

الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا و قالوا حسبنا اللہ و نعم الوکیل (آل عمران:۱۸)

وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تم سے لڑنے کے لئے لوگوں نے بڑا سامان کیا ہے سو تم ان سے خوف کرو تو اس نے ان کے

ایمان کو اور بڑھا دیا' اور بول اٹھے کہ ہم کو خدا کافی ہے اور وہ کیسا اچھا کارساز ہے۔

شہادت اور غزا کا رتبہ ::

میدان جنگ میں شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے' اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع قمع کر دیا ہے' اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدوں کی جان و مال اللہ تعالی کے ہاتھ اس کی خوشی و رضا ہے اور جنت کے بدلہ میں بکا ہوا ہے' اور وہاں ان کے لئے وہ کچھ مہیا ہے جس کے سامنے یہاں کا بڑا سے بڑا عیش و آرام بھی ہیچ ہے۔

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنہت یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون و یقتلون (توبہ: ۱۴)

اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ ان کے لیئے جنت ہے' اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے سورۂ نساء میں اہل ایمان کو جو آخرت کے لیئے دنیا کا سودا کر چکے ہیں' اعلان ہے۔

فلیقاتل فی سبیل اللہ الذین یشرون الحیوہت الدنیا بالاخرہت ومن یقاتل فی سبیل اللہ

تو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلہ بیچتے ہیں' وہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور جو اللہ کی راہ میں لڑے' پھر مارا

فیقتل او یغلب فسوف نوئتیہ اجرا عظیما۔ (نساء: ۱۰)

جائے یا وہ غالب ہو تو ہم اس کو بڑی مزدوری دیں گے۔

ان کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائیں گے۔

فالذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقتلوا وقتلوا لا کفرن عنھم سیاتھم ولا دخلنھم جنت (آل عمران:۲۰)

تو جو لوگ اپنے وطن سے چھوٹے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے' اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے' تا روں گا ان سے ان کی برائیاں اور داخل کروں گا ان کو جنت میں۔

شہیدوں نے اس راہ میں اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وہ ان کی زندگی تھی اور ان کو از سر نو اسی وقت دیدی جائے گی۔ اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیال باطل کا کہ شہید مر جاتے ہیں ہمیشہ کے لیئے خاتمہ کر دیا' اور کہدیا گیا کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو' وہ خدا کے پاس زندہ ہیں۔

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین بما اتھم اللہ من فضلہ (آل عمران:۱۷)

اور جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ سمجھو' بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں' خدا نے ان کو اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے خوش ہیں۔

ان کی زندگی کو گو اس دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے پھر بھی ان کو زبان سے بھی مردہ نہیں کہنا چاہئے۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتط بل احیاء ولکن لا تشعرون۔ (بقرہ:۱۹)

اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ نہ کہو۔ بلکہ زندہ ہیں لیکن تم کو اس کی خبر نہیں۔

ھرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدئہ عالم دوام ما

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات ان ہی کے لیئے ہیں، جو فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں صرف خدا کی خوشنودی کے لیئے لڑتے ہیں، اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض و غایت کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ وہ ذاتی خودغرضیوں اور نفسانی غیظ وغضب، اور بہادری کی نیک نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کر دی گئی ہے، اگر کوئی مال کے لیئے کسی کو قتل کرے تو یہ کافروں کی سی جاہلانہ بات ہوگی فرمایا۔

تبتغون عرض الحیوہت الدنیا فعند اللہ مغانم کثیرہت کذالك کنتم من قبل فمن اللہ علیکم فتبینوا۔ (نساء:۱۳)

چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال، سو اللہ کے پاس بڑا مال غنیمت ہے تم (اسلام سے) پہلے ایسے ہی تھے، تو خدا نے تم پر فضل کیا (یعنی اسلام بخشا) تو اب تحقیق کرلیا کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لیئے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لیئے لڑتا ہے، ایک شخص اس لیئے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ میں اس کی پامردی کی نمائش ہو، ایک شخص بہادری دکھانے کے لیئے لڑتا ہے، ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے، ایک شخص نمائش کے لیئے لڑتا ہے، ایک شخص غصہ وانتقام کے لیئے لڑتا ہے، تو آپ ﷺ نے ان سب کا مشترک جواب یہ دیا۔

من قائل لتکون کلمتہ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔ (۱)۔

جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے کے لیئے لڑے اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے

ایک حدیث میں ہے کہ "ایک شخص سے قیامت کے دن اس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ اے خدا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہوا، خدا کہے گا کہ تم جھوٹ کہتے ہو تم اس لیئے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ۔ (۲)۔ سو تم اپنا اجر پا چکے، اور دنیا میں تم کو بہادر کہا جا چکا، غرض جس شجاعت کا مقصود اصلی ریا و

نمائش ہو اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے لیکن اگر جہاد میں اعلائے کلمتہ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے تو اسلام نے اس کو برا نہیں کہا ہے۔ (۳)۔ کیونکہ اس فخر کا منشا بھی کلمہ حق کی بلندی کا اظہار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان میں کبر و تبختر کے شجاعانہ پہلوؤں کو پسند کیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ''بعض ناز و تبختر کو خدا ناپسند کرتا ہے' خدا جس ناز و تبختر کو پسند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اترائے'' (۴)۔ کیونکہ اس سے دشمنوں پر رعب و داب قائم ہوتا ہے' اور دوستوں میں مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے' ایک صحابی نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر و غرور کے لہجہ میں کہا ''لو میں ابن اکوع ہوں'' حافظ ابن حجر اس فقرے کی شرح میں لکھتے ہیں۔

یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہے' جس کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ حالت کا اقتضاء یہی تھا اور وہ اس ناز و تبختر سے قریب ہے جو لڑائی میں جائز ہے' اور دوسرے موقعوں پر جائز نہیں۔'' (۵)۔

غزوہ حنین میں جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھر لیا تو آپ ﷺ نے خود عزم و ثبات کے عربی لہجہ میں فرمایا۔

انا النبی لا کذب انا عبدالمطلب

میں پیغمبر ہوں' جھوٹ نہیں' میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

یعنی میں سچا پیغمبر ہوں اس لیئے میدان سے نہ بھاگوں گا نہ ہٹوں گا' چنانچہ اس وقت غنیم کے تیروں کی بارش سے گو اور لوگ ہٹ گئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں فرمائی۔ (۶)۔

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کھڑا ہوتا تھا۔ (۷)۔ وہ یہ بھی کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت بہادر تھے۔ ایک بار اہل مدینہ کے دلوں میں کسی طرف سے حملہ کا خوف

پیدا ہوا تو سب سے پہلے جو ادھر بڑھا وہ خود سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے' آپ ﷺ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے اور واپس آ کر فرمایا ''خوف کی کوئی بات نہیں۔''(۸)۔ایک

(۱)۔صحیح مسلم و صحیح بخاری کتاب الجهاد باب من قاتل لتکون کلمته الله هی العلیا فهو فی سبیل الله (۲)۔ صحیح مسلم کتاب الجهاد باب من قاتل للریاء والسمعهت استحق النار و جامع ترمذی (۳)۔ فتح الباری جلد ٦ صفحه ٢٢ شرح حدیث مذکور (٤)۔ ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی الخیلا فی المحرب (٥)۔ فتح الباری جلد ٦ صفحه ١١٤ (٦)۔ صحیح بخاری غزوئه حنین و کتاب الجهاد بغلهت النبی ﷺ (٧)۔ صحیح مسلم باب غزوئه حنین (٨)۔ صحیح بخاری کتاب الجهاد و کتاب الحمائل و تعلیق السیف بالعنق

موقع پر جب بدویوں نے آپ ﷺ کو عطیہ کے لیئے گھیر لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم لوگ مجھ کو بخیل' جھوٹا اور بزدل نہ پاؤ گے۔''(۱)۔بزدلی اسلام میں ایسا اخلاقی عیب ہے جس سے پناہ مانگنی چاہئے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیچارگی (عجز) کاہلی (کسل) بزدلی اور بڑھاپے سے کہ یہ بھی بیچارگی کی ایک قسم ہے پناہ مانگتے تھے دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ ہر نماز کے بعد ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے'(۲)۔ایک روایت میں ہے کہ انسان میں سب سے بڑی بداخلاقی گھبرا دینے والا بخل اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے۔(۳)۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی صحابی نے ایک خط لکھ کر بھیجا تھا' اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''جب دشمن سے مقابلہ آ پڑے تو ثابت قدم رہو۔''(۴)۔اسی خط میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانوں کی بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

واعلموا ان الجنہت تحت ظلال السیوف۔

یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔

استقامت

''استقامت'' کے لفظی معنی ''سیدھا رہنے یا سیدھا چلے چلنے'' کے ہیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے مشکلیں پیش آئیں مخالفتیں ہوں ستایا جائے ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے۔

انما الھکم الہ واحد فاستقیموا الیہ واستغفروہ (حم السجدہ: ۱)

تمہارا معبود ایک ہی ہے سو اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے گناہ بخشواؤ۔

یعنی ہماری عبادتیں اسی ایک کے لیئے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو اس سے کسی حال میں ادھر ادھر نہ ہوا جائے سیدھے اسی کی طرف چلے چلو ایک اور آیت میں بارگاہ الٰہی سے جناب رسالت مماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ ﷺ کی ساتھیوں کو حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو نہ راہ سے بہکو نہ حکم ماننے سے سرکشی کرو۔

فاستقم کما امرت ومن تاب معک ولا تطغوا انہ بما تعملون بصیر (ھود: ۱۰)

تو (اے پیغمبر)! تو سیدھا چلا چل جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور حد سے نہ بڑھو کہ وہ (اللہ) تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔

---

(۱)۔بخاری کتاب الجہاد باب الشجاعۃ فی الحرب والجبن (۲)۔ بخاری کتاب الجہاد باب ما یتعوذ من الجبن (۳)۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الجبراہ والجبن (٤)۔ صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الصبر عند القتال۔

عرب کا گرم ریگستان دین حق کی مخالفت میں غیظ وغضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا' ذرہ ذرہ کی زبان سے رسول حق علیہ السلام کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہوتی جاتی ہے' اس موقع پر رسول اسلام علیہ السلام اور آپ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلان حق اور حق پر استقامت کی تاکید ہو گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اسی دین حق کی طرف سب کو بلاتے رہو' اور ثابت قدمی دکھاؤ' اور مخالفوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

فلذلك فادع واستقم كما امرت ولا تتبع اهواء هم۔
(شوریٰ: ۲)

پس اسی کی طرف بلا' اور قائم رہ جیسا کہ تجھے فرمادیا' اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل۔

ایسے ثابت قدموں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف وخطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے یہ خوشخبری سنائی جارہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لیئے ہے وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ڈر ہوگا اور نہ کسی چیز کا غم ہوگا۔

ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا فلاخوف عليهم ولا هم يحزنون۔ (احقاف: ۲)

بیشک جنہوں نے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے' پھر وہ (اس پر) جمے رہے تو نہ ڈر ہے ان کو اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

اس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہوں گے' ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہاں حاصل تھا' وہاں تسکین وتسلی کا اطمینان بھی حاصل ہوگا' ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں ان کی استقامت کی مزدوری میں فرشتوں کی بشارت سنائی دے گی۔

ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملا ئكة الا تخافوا ولا تحزنوا والبشروا

بالجنہت التی کنتم توعدون۔ (حم السجدہ: ۴)

بیشک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر جمے رہے' ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کھاؤ اور اس بہشت کی خوشی سنو جس کا تم سے وعدہ ہے۔

ان ہی آیتوں کی شرح میں اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے کوئی ایسی بات بتائیے کہ میں اس سے چمٹ جاؤں' ارشاد ہوا' کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر جم جاؤ۔(۱)۔صحابہ نے ان نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا' اور اپنی ایمانی اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کیئے ساڑھے تیرہ سو برس گزر گیا' مگر ان پر تاریخ کی زبان سے برابر احسنت' اور آفرین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔خود اللہ تعالی نے غزوہ احزاب کے سلسلہ میں ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہے' فرمایا۔

اذ جاء کم من فوقکم و من اسفل منکم و اذا زاغت البصار و بلغت القلوب الحنا جرو تظنون باللہ الظنونا ہنالک ابتلی المئومنون و زلزلوا زلزالا شدیدا۔ (احزاب: ۲)

جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے آئیں اور جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور دل گلے کو آنے لگے اور تم اللہ سے طرح طرح کے گمان کرتے تھے' وہاں ایمان والے جانچے گئے اور خوب جھڑجھڑائے گئے۔

(۱)۔ایضاً باب الجنہت تحت بارقتہ السیوف و باب کان النبی ﷺ اذالم یقاتل اول النہار اخر القتال حتی تنزول الشمس بخاری ج ۱ ص ۴۱۶ (۲)۔ ترمذی باب ماجاء فی حفظ اللسان۔

اس کے بعد اس موقع پر منافقوں نے جو کمزوری دکھائی' اس کی تفصیل ہے' اس کے بعد ہے۔

ولما دا المئومنون الاحزاب قالوا ہذا ما وعدنا اللہ

ورسولہ وصدق اللہ ورسولہ وما زادھم الا ایمانا وتسلیما۔ (احزاب:۳)

اور جب ایمان والوں نے کفار کی ان متحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ ہم کو دیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا اور اس نے ان کو یقین اور اطاعت میں بڑھا دیا۔

اس کے بعد جن مسلمانوں نے اس قسم کے خطروں میں اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا تھا' اور اس کو پورا کر دکھایا۔ ان کی تعریف فرمائی جاتی ہے۔

من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر و ما بدلوا تبدیلا۔ (احزاب:۳)

ایمان والوں میں بعض وہ مرد ہیں جنہوں نے خدا سے جس چیز کا عہد کیا۔ اس کو سچ کر دکھایا' تو ان میں کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی ان میں وقت کی راہ دیکھ رہا ہے اور انہوں نے ذرا بھی نہیں بدلا۔

یعنی بعض تو خدا کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں اور اس دن کی راہ تک رہے ہیں' جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے' اور ان تمام خطروں کے باوجود تو منافقوں کی طرح انہوں نے اپنے دین و ایمان کو بدلا' اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑا۔

حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا' اور اس میں مردان خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا اور جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اتری کامیابی کا منہ نہیں دیکھتی' فرمایا۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم البأساء والضراء

وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین امنوا معه متی نصر الله الا ان نصر الله قریب (بقرہ:۲۶)

کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر تم سے پہلوں کے احوال نہیں آئے ان کو سختی اور تکلیف پہنچتی رہی' اور جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی سن رکھو اللہ کی مدد نزدیک ہے۔

پہلوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کیئے ہیں' ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا' اور آخر کامیاب ہوا اور اس عالم میں اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی۔

ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکفرین (بقرہ:۲۶)

اے ہمارے پروردگار ہم میں ڈال دے پوری مضبوطی اور جما ہمارے پاؤں اور اس کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے' احادیث (۱)۔ وسیر میں ہے کہ یمن میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی امت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمان تھے یہودیوں نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں' اور آخر ان کو گڑھا کھود کر آگ میں جھونک دیا' مگر وہ دین حق سے برگشتہ نہ ہوئے۔

قتل اصحب الاخدود النار ذات الوقود۔ اذھم علیھا قعود۔ وھم علی مایفعلون بالمعوء منین شھود۔ وما نقموا منھم الا ان یوء منوا باللہ العزیز الحمید۔ (بروج:۱)

مارے گئے گڑھے کھودنے والے' آگ بھری ایندھن سے جب وہ اس (گڑھے کے منہ) پر بیٹھے تھے' اور جو کچھ وہ

اس وقت بھی ان کی زبان سے احد' احد (ایک خدا) ہی نکلتا تھا' حضرت خبیبؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں مگر خدا کی راہ میں جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں' خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ فقرہ جس کو آپ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کے جواب میں کہا تھا اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے فرمایا! چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی دے دیں تب بھی میں اس دین حق سے باز نہ آؤں گا۔

(۱)۔صحیح مسلم و سیرت ابن ہشام قصہ اصحاب الاخدود (۲)۔ صحیح بخاری باب علامات النبوہ فی الاسلام۔ (۳)۔ ابن سعد جلد ۳ تذکرہ خبابؓ۔

خود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول اس راہ میں مر جائے' یا مارا جائے تو کیا تم اس راستہ سے جس پر تم چل رہے ہو' الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ نہیں حق کسی کی موت وحیات سے وابستہ نہیں' اس کا ساتھ تم اس لیئے دیتے ہو کہ وہ حق ہے۔

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل' افائن مات او قتل القلبتم على اعقابكم و من ينقلب على عقبيه فلن يضر الله شيئا۔ (آل عمران:۱۵)

اور محمد ﷺ تو ایک رسول ہے اس سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے' پھر اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے' اور جو الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔

پھر اگلی امتوں کا حال سنا کر تسلی دی جاتی اور صبر وثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے۔

وكاين من نبى قتل معه ربيون كثير فما وهنوا بما اصابهم فى سبيل الله وما ضعفوا وما استكانوا

واللہ یحب الصابرین۔ وما کان قولھم الا ان قالوا ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکفرین۔ (آل عمران:۱۵)

اور کتنے پیغمبر ہیں کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا والے لوگ لڑے، تو پھر ان کو خدا کی راہ میں کچھ دکھ پڑا تو ہمت نہیں ہارے اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار کرتا ہے اور نہ تھا ان کا کہنا، مگر یہی کہا اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ اور ہم سے اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی اس کو بخش دے اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے۔

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثبات قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہئے اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامت عمل ہے جس کا نام مداومت ہے، یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے۔ اس پر مرتے دم تک مداومت رہے، اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجئے اور کبھی نہ کیجئے کہ اس طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے، نماز پڑھنا انسان کے سب سے اچھے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہیں، فرمایا۔

الا المصلین الذین ھم علی صلاتھم دائمون (معارج:۱)

لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں، یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں۔

اخلاق کی یکسانی! اخلاق کا بڑا جوہر ہے، اور اس کی مشق مداومت عمل سے ہوتی ہے اس لیئے آنحضرت ﷺ نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کون سا عمل نیک سب سے زیادہ

اس کے تمسخر اور استہزاء کی مطلق پرواہ نہ کرو بلکہ اس کی قوت و طاقت کی بھی پرواہ نہ کرو، سب کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بس ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے، وہ خوف ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں، ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے جس کو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے، اور ایک دوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے۔

ولا یخافون لومۃ لائم (مائدہ:۸)

اور یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

یعنی اہل ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن وطعن کی پرواہ نہیں کرتے۔

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھ سکتا ہے، لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل میں ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دینے کے لیئے کھڑے ہوئے اور فرمایا ''کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہیئے کہ انسانوں کا خوف مانع نہ ہو'' ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے صحابہ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو کیونکر حقیر سمجھ سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ اس کو خدا کے بارے میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے ایسے شخص سے خدا قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف، ارشاد ہوگا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہیئے تھا۔

انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہیبت ناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہوں کی ہوتی ہے، اس لیئے ان کے سامنے حق گوئی کو آپ نے سب سے بڑا

جہاد قرار دیا اور فرمایا:

افضل الجهاد كلمته عدل عند سلطان جابر۔

بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کی کہنا ہے۔

دوسری روایت میں کلمہ حق کا لفظ ہے۔

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دیئے گئے ان میں دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے' چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سنت کی مخالفت کی' آج تم نے منبر نکالا' حالانکہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا' نماز سے پہلے خطبہ دیا' حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اس پر حضرت ابوسعید خدریؓ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد میں نے سنا ہے کہ ''تم میں جو شخص برائی دیکھے اور اس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے' اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے' لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔(۱)۔

صحابہ میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا رتبہ حق گوئی میں بدرجہ کمال تھا۔ یہ وہی تھے جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفار قریش کے بھرے مجمع میں حرم میں جا کر توحید کا نعرہ بلند کیا' اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک مار کھاتے کھاتے بیدم نہ ہو گئے' لیکن اس پر بھی ان کا نشہ نہیں اترا اور دوسرے دن پھر جا کر اعلان حق کیا اور وہی سزا پائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی مدح میں فرمایا کہ ''آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ حق گو کوئی نہیں۔''(۲)۔ چنانچہ حضرت عثمان کے زمانہ میں وہ جب شام میں تھے تو وہاں کے مسلمانوں میں سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی۔ اس پر انہوں نے بے محابا روگیری کی' اور اس میں امیر معاویہؓ کی پرواہ انہوں نے ذرا بھی نہیں کی۔

خدا نے جابجا اپنے کو بندہ کا اصلی کارساز اور کارفرما بتا کر ان کے مضطرب دلوں کو تسکین دی ہے فرمایا۔

ونعم الوکیل۔ (آل عمران:۱۸۰)

اور کیسا اچھا کارساز۔

وکفی بربك وکیلا (نساء:۱۱۰)

اور تیرا رب کارساز بس ہے۔

الیس اللہ بکاف عبدہ (زمر:۴۰)

کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں۔

وکفی باللہ وکیلا۔ (نساء:۱۱۰)

اور اللہ کارساز بس ہے۔

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے۔

الیس اللہ بکاف عبدہ (زمر:۴۰)

کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں۔

اس لیئے کسی شاہ امیر و دولتمند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغناء کی بنیاد ہے وہ قناعت ہے یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملا ہے اس پر طمانیت حاصل کی جائے اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے۔

ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض (نساء:۵۰)

اور جس چیز میں اللہ نے ایک دوسرے پر بڑائی دی اس کی ہوس مت کرو۔

ولا تمدن عینیك الی ما متعنا بہ ازواجا منھم۔ (طہ:۸۰)

اور اپنی آنکھیں نہ پسار اس کی طرف جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں۔ مال و دولت

سے ان کی نیت نہیں بھرتی اور اس وہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں۔ اس لیئے وہ باوجود دولت مند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں' لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولت مند نہیں ہوتا تاہم خدا نے اس کو جو کچھ دیا ہے اس پر قانع رہتا ہے' اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا۔ اس لیئے وہ باوجود مال کی کمی کے مستحق اور بے نیاز ہے' اس بناپر استغناء و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے' بلکہ روح اور قلب سے ہے اور اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

لیس الغنی عن کثرہت العروض ولکن الغنی غنی النفس

دولتمندی مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ اصل دولتمندی دل کی بے نیازی ہے۔

اس حدیث کا ترجمہ شیخ سعدیؒ نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے تونگری بدل است نہ بہ مال۔

ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپ ~ صل ۳~ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا حضرت ابو ذرؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابو ذر تمہارے خیال میں مال کی کثرت کا نام بے نیازی ہے؟ میں نے کہا ''ہاں'' فرمایا تو تمہارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟ میں نے کہا ''ہاں'' فرمایا نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی۔ (۱)۔ اس بناپر بے نیازی درحقیقت رضا و تسلیم سے پیدا ہوتی ہے' مال و دولت سے پیدا نہیں ہوتی' یعنی خدا انسان کو جو کچھ دیدے اگر وہ اس پر دل سے راضی ہو جائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جوہر نفس میں پیدا ہوتا ہے' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو یہی تعلیم دی اور ان سے فرمایا کہ جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ' تو سب سے زیادہ بے نیاز ہو جاؤ گے۔ (۲)۔ ایک بار چند انصاریوں نے

آپ ~ صل۳~ سے مال کا سوال کیا اور آپ ~ صل۳~ نے انکا سوال پورا کیا۔ لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور پھر سوال کیا۔ آپ ~ صل۳~ نے پھر ان کا سوال پورا کیا۔ جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال ہوگا میں تم سے بچا کر جمع نہ کروں گا جو شخص خودداری چاہتا ہے خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے خدا اس کو بے نیاز کر دیتا ہے۔ (۳)۔ اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حزامؓ نے آپ ~ صل۳~ سے بار بار مال کا سوال کیا' اور آپ ~ صل۳~ نے ہر بار ان کا سوال پورا کیا لیکن آخیر میں فرمایا کہ اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے خدا اس میں برکت دیتا ہے اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا' ان میں سے اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اس کے بعد کسی کا عطیہ قبول نہیں کیا۔ (۴)۔

فضالہ بن عبید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خوشخبری ہو اسکو جس کو اسلام کی ہدایت ملی' اور اسکی روزی ضرورت کے مطابق ہے اور اللہ نے اسکو اس پر قانع بنا دیا ہے۔ (۵)۔ حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ جبریل امین نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے۔ (۶)۔

---

(۱)۔ فتح الباری ج ۱۱ ص ۲۳۲ بحوالہ صحیح ابن حبان و موارد والطمان الی زوائد ابن حبان للهیثمی قلمی نسخه دار المصنفین باب الغنی غنی النفس۔ (۲)۔ فتح الباری جلد ۱۱ صفحه ۲۳٤ (۳)۔ ابوداؤد کتاب الزکوه باب فی الاستعفاف (٤)۔ ترمذی کتاب الزهد (۵)۔ زوائد صحیح ابن حبان قلمی نسخه دار المصنفین باب فی القناعهت (٦)۔ مستدرك حاکم ٤ ص ۳۵۲ کتاب الرقاق۔

رذائل

رذائل کے معنی ::

رذائل کے (یعنی بری خصلتیں) وہ اخلاق ذمیمہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہگار ٹھہرتے ہیں۔ جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے اور جن کے بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہوجاتی ہے، بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہوجاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یعنی اس کی دینی دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہوجاتا ہے۔

رذائل کے قرآنی نام ::

اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں، مثلاً اکثر ان کو منکر (بری باتیں) اور فحشاء (بے حیائی) اور کبھی فاحشہت (فحش) سیئہت (برا) سوء (برائی) مکروہ (ناپسندیدہ) خطاء (ناصواب یا بھول) اثم (گناہ) عدوان (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ رذائل سے متصف ہونا کتنا گھنونا اور نفرت کے قابل ہے، اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں، فرمایا:

ولا تقتلوا اولادکم خشیہت املاقط نحن نزرقھم وایاکمط ان قتلھم کان خطاء کبیراہ وتقربوا الزنی انہ کان فاحشہتط وساء سبیلا ولا تمش فی الارض مرحاط انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولاط کل ذلک کان سیئہ عند ربک مکروھا۔
(بنی اسرائیل: ۴)

اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے مت مارڈالو ہم ہیں ان کو

اور تم کو روزی پہنچاتے' بے شبہ ان کا مارڈالنا بڑی چوک ہے
اور زنا کے پاس مت جاؤ بے شبہ یہ بے حیائی اور بری راہ ہے
اور زمین میں اترا کر نہ چل کہ تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا' اور نہ
لمبائی میں پہاڑ کو پہنچ جائے گا۔ ان میں سے جو بری بات
ہے وہ تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

رذائل کے لیئے قرآن پاک کا سب سے عام لفظ منکر ہے' چنانچہ سورہ مائدہ میں جن برائیوں کی روک تھام نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے' ان کو ایک ہی لفظ منکر سے ادا کیا گیا ہے۔

کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون (مائدہ: ۱۱)
وہ ایک دوسرے کو اس منکر سے جو کرتے تھے روکتے نہ تھے کیا
برا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔

اس بدکار قوم کی برائیاں گنائی جارہی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہے۔

وتاتون فی نادیکم المنکر۔ (عنکبوت: ۳)
اور تم اپنی مجلس میں منکر کے مرتکب ہوتے ہو۔

اچھے لوگوں کی صفت یہ ہے۔

والناھون عن المنکر (توبہ: ۱۴)
اور منکر سے منع کرنے والے۔

وینھون عن المنکر۔ (آل عمران و توبہ: ۱۲، ۹)
اور منکر سے منع کرتے ہیں۔

اور کہیں فحشاء اور منکر کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے۔

فانہ یامر بالفحشاء والمنکر (نور: ۳)
اور فحشا اور منکر کرنے کو کہتے ہیں۔

نماز کی خوبی یہ ہے کہ:

تنھی عن الفحشاء والمنکر۔ (عنکبوت: ۵)

وہ فحشا اور منکر سے باز رکھتی ہے۔

فحشا، منکر اور بغی ::

کہیں آیت میں تین لفظ جمع ہیں فحشا، منکر اور بغی۔

ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان و ایتاء ذی القربی وینھی عن الفحشاء و المنکر و البغی یعظکم لعلکم تذکرون۔ (نحل:۳)

(مسلمانو)! اللہ انصاف اور احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے، اور فحشا اور منکر اور بغی سے منع فرماتا ہے تم لوگوں کو نصیحتیں کرتا ہے کہ تم خیال رکھو۔

یہ آیت ہر قسم کے فضائل اور رذائل کو محیط ہے، حضرت عثمانؓ بن مظعون کا بیان ہے کہ میں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرم و حیاء سے اسلام لایا، اسلام نے میرے دل میں جگہ نہیں پکڑی تھی، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایمان نے میرے دل میں جگہ پکڑ لی۔(۱)۔

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ قرآن مجید میں خیر و شر کی سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے۔(۲)۔قتادہؒ کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جن اخلاق حسنہ پر عمل کیا جاتا تھا، اور وہ پسند کیے جاتے تھے، ان میں کوئی خلق ایسا نہیں ہے جس کا خدا نے اس آیت میں حکم نہ دیا ہو اور کوئی بد اخلاقی ایسی نہیں ہے جس کی آیت میں ممانعت نہ کی ہو۔(۳)۔

اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں فحشاء اور منکر اور بغی ان میں سے ہر ایک لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

فحشاء کے معنی ::

ان میں پہلا لفظ فحشاء ہے، جس کی دوسری صورت فاحشہت " کی ہے یہ لفظ فحش سے

نکلا ہے۔جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں'(۴)۔اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبح یعنی برائی کے ہیں' کیونکہ جس چیز کی جو حد خالق فطرت نے مقرر کردی ہے اس سے آگے بڑھنا قبیح یعنی برائی ہے یا یہ کہ برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشاء کہلاتی ہے۔قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدود الٰہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں' مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوت شہوانی کی تسکین کے لیئے کچھ حدیں مقرر فرمادیں۔اب جو ان حدود سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدی حدود اور فحشاء اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے' فرمایا:

(۱)۔مسند احمد بن حنبل عن ابن عباسؓ (۲)۔ مستدرک حاکم ج ۲ ص ۲۵۶ و ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور (۳)۔ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور (٤)۔ الصحاح للجوھری لفظ فحش و لسان العرب لفظ فاحش زیر "فحش"۔

والذین ھم لفروجھم حفظون۔ الا علی ازواجھم او ماملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین وفمن ابتغی ورآء ذلک فاولئک ھم العدون۔ (مئومنون: ۱)

اور جو اپنی شرمگاہوں کی نگہبانی کرتے ہیں' لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر' تو انہیں ملامت نہیں کی جائی گی' پھر جو کوئی اس کے سوا کو ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق' ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

منکر کے معنی ::

دوسرا لفظ منکر ہے۔اس کے لغوی معنی نا شناسا کے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے' وہ تو جانا پہچانا کام اسی لیئے اس کو معروف (شناسا) ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

سامنے کچھ ناشنا سا مہمان آ جاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں۔

قوم منکرون۔ (حجر: ذاریات)

یعنی لوگ ان جانے اور ان پہچانے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جب ان کے بھائی آئے تو انہوں نے تو پہچان لیا، مگر وہ لوگ ان کو پہچان نہ سکے، اس موقع پر قرآن میں ہے۔

فعرفھم وھم لہ منکرون۔ (یوسف:۷)

یعنی یوسف نے تو ان کو پہچان لیا مگر وہ ان کو پہچان نہ سکے۔

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے اور اس کے طور و انداز سے بداہتہ "ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے، یہ کیفیت بھی منکر ہے۔ فرمایا:

واذا تتلی علیھم ایتنا بینت تعرف فی وجوہ الذین کفروا المنکر یکادون یسطون بالذین یتلون علیھم ایتنا (حج: ۹)

اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں سنائی جائیں تو کافروں کے چہروں میں تو منکر (بگڑی ہوئی شکل) پہچانے گا، نزدیک ہوتے ہیں کہ وہ ان پر جو ہماری آیتیں سناتے ہیں حملہ کر بیٹھیں۔

اس آیت میں ناخوشگواری کے اثر سے چہرہ میں جو بدنمائی پیدا ہوتی ہے۔ اس کو منکر کہا گیا ہے، ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہیں جس کو ہر شخص فطرۃ" اور بلاشبہ ناپسند کرتا ہے اور ان کی برائی ایسی کھلی ہوتی ہے کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب و ملت اور ہر اچھے تمدن و تہذیب میں وہ یکساں برے سمجھے جاتے ہیں۔

بغی کے معنی ::

تیسرا لفظ بغی ہے جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں:

خصمان بغی بعضنا علی بعض (ص: ۲)

ہم دو جھگڑنے والے ہیں' ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔

خدا فرماتا ہے کہ اگر لوگوں کو بے انتہا دولت دیدی جائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں۔

ولو بسط اللہ الرزق لعبادہ لبغوا فی الارض۔ (شوریٰ: ۳)

اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیئے روزی پھیلا دے تو وہ زمین میں زیادتی کریں۔

اسی سورہ میں ہے۔

انما السبیل علی الذین یظلمون الناس ویبغون فی الارض بغیر الحق۔ (شوریٰ: ۴)

راہ ان ہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں زیادتی کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دوسروں پر زیادتی اور تعدی کے ہیں۔

اخلاق ذمیمہ برے کیوں ہیں ::

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی فحشاء' منکر اور بغی میں منحصر ہیں' صفات ذمیمہ فحشاء یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہیں اور ایسی باتیں ہیں جن کو سارے انسان فطرۃ" ناپسند کرتے ہیں اور ان کے جائز کر دینے سے دوسرے کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے۔

سورہ اعراف کی ایک آیت ہے۔

قل انما حرم ربی الفواحش ما ظہر وما بطن والاثم

والبغی بغیر الحق۔ (اعراف: ۴)

اے پیغمبر! کہدے کہ میرے پروردگار برائی کے سارے کاموں (فواحش) کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ کو ناحق زیاتی کو منع کیا ہے۔

اس آیت میں بھی رذائل کو تین لفظوں میں منحصر کیا ہے ایک فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہوں یا چھپے دوسرے گناہ کے کام اور تیسرے ناحق زیادتی ان اخلاق ذمیمہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکساں برا کہا ہے اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہیں اور دین وشرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں اور اگر ان کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے امان اٹھ جائے اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے۔(۱)۔

رذائل کی ترتیب ::

ان رذائل کی ترتیب دونظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالی کی ناپسندیدگی اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے اوپر کی آیت میں ترغیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گویا تقسیم کردیا گیا ہے سب سے پہلے فحشاء پھر منکر پھر بغی

فحشاء میں جس برائی کی طرف اشارہ ہے وہ اسلئا ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے جیسے ننگے رہنا بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ منکر سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے جیسے شوہر کا ظلم باپ کی سنگدلی اور اولاد کی نالائقی اور بغی جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک وملت کو چھالیتی ہے جیسے چوری قتل ڈاکہ وغیرہ۔

---

(۱)۔منطقی اصطلاح میں فحشاء منکر اور بغی میں مانعہت الخلو ہے یعنی کسی بداخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہو سکتا ہے

مگر کوئی بداخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی' یعنی ہر بداخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی دوسرے نظریہ کے رو سے پہلے صفات ذمیمہ ہیں جن سے خدا کی رحمت چھن جاتی ہے پھر وہ برائیاں ہیں جو خدا کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں' اور پھر وہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

جھوٹ

انسان کے سارے اخلاق ذمیمہ میں سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے' یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جائے' کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہوں' اور جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے۔ اس لیئے یہ برائی ہر قسم کے قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے انسان کے دل کے اندر کی بات سوا خدا کے کوئی دوسرا نہیں جانتا' کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا ہے یا باور کر سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان سے یا عمل سے ظاہر کرے۔ اب اگر وہ اپنی اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہیں ظاہر کرتا بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے' ایسے شخص میں دنیا کی جو ائیاں بھی نہ ہوں وہ کم ہے کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے۔

اسی لیئے نبی کو پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو' چنانچہ بعض پیغمبروں کے لیئے یہ صفت کے طور پر بولا گیا ہے۔ فرمایا:

واذکر فی الکتاب ادریس انہ کان صدیقا نبیا۔
(مریم: ۴)

اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کر' وہ بیشک بڑا سچا نبی تھا۔

اسی لیئے جو کاذب ہے وہ نبی نہیں ہو سکتا' کیونکہ پھر اس کے دعوی اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہوگا' حضرت موسی علیہ السلام نے جب اپنی نبوت کا دعوی فرعون کے سامنے پیش کیا' اور اس نے اس کے ماننے سے انکار کیا تو اس کے ایک درباری نے جو دل میں مسلمان تھا فرعونیوں کے سامنے حضرت موسی کے صدق نبوت پر ان کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی' اور کہا کہ جھوٹا خدا کا نبی نہیں ہو سکتا۔

و ان یک کاذبا فعلیہ کذبہ ط و ان یک صادقا تصبکم
بعض الذی یعدکم ان اللہ لا یھدی من ھو مسرف

کذاب (مئومن: ۴)

اگر یہ جھوٹا ہوگا تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا اور اگر سچا ہوگا
تو تم پر پڑے گا کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے' بے شک اللہ اس کو
راہ نہیں دکھاتا۔ جو بے باک جھوٹا ہو۔

اس آیت میں یہ تلمیح بھی چھپی ہے کہ مدعی نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گزرنے میں بے باک اور جھوٹا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے انبیاء علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں' اور کفار کے طور وطریق پر چلتے ہیں روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوت سے پہلے کیا جھوٹ بولا کرتا تھا۔ ابوسفیان نے جواب دیا نہیں' قیصر نے کہا جو بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خدا پر جھوٹ (۱)۔ باندھے گا؟ یہ نہیں ہوسکتا۔

قرآن پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک اور آیت ہے۔

تنزل علی کل افاک اثیم۔ یلقون السمع و اکثرھم
کذبون (شعراء: ۱۱)

شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر' لا ڈالتے ہیں سنی بات
اور بہت ان میں جھوٹے ہیں۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت اور روش کے سراسر خلاف ہے اسی لیئے جو جھوٹا ہوتا ہے اس کے دل سے خدا کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے' ارشاد ہے۔

ان اللہ لا یھدی من ھو کذب کفار۔ (زمر: ۱)

بیشک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا ہے احسان نہیں مانتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لے جاتا ہے' اور گناہ دوزخ میں' اور بولتے بولتے آدمی خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔ (۲)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جنت میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا سچ بولنا' جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے' وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا۔ اس نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ! دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا جھوٹ بولنا' جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا۔ (مسند احمد اول صفحہ ۷۶ مصر)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آجاتا ہے جس سے زیادہ بری چیز کوئی دوسری نہیں' اور جس کے لیئے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے' وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گھیرے ہوئے ہے' اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے مگر رحمت الٰہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے جس کا منہ جھوٹ کے بادسموم سے جھلس رہا ہے۔

اسلام کے لغت کا سخت ترین لفظ ''لعنت'' ہے' لعنت کے معنی ''اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی'' کے ہیں' قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بتایا گیا ہے' اور اس کے بعد یہودیوں' کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے' لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اسکے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا' کیا جھوٹ بولنے اور جھوٹا الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اور اس پر خدا کی لعنت کی جائے' مباہلہ کے موقع پر یہ فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدائے تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

---

(۱)۔صحیح بخاری بدء الوحی۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ و جامع ترمذی باب ماجاء الکذب و ابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔

ثم نبتهل فنجعل لعنت الله على الكذبين (آل

عمران:٦١)

پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہوتو اسکو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا۔

ان لعنته الله علیه ان کان من الکذبین۔ (نور: ۷)

اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ کافروں اور منافقوں کی طرح بد دعا کا مستحق ہوتا ہے۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی انجان بن جائے حق کا علم رکھ کر بھی اس کے اظہار سے باز رہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹوں پر لعنت فرمائی ہے۔

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات و الهدی من بعد ما بینه للناس فی الکتاب اولئك یلعنهم الله ویلعنهم اللاعنون۔ (بقرہ: ۹۱)

بے شک جو چھپاتے ہیں جو اتارے ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان، اس کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان کو انسانوں کیلئے کھول کر کہہ دیا ہے، ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے، اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے کیونکہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں اور اس کو جھوٹا سمجھیں، اس لیئے وہ جھوٹ کے گو قولاً نہیں، لیکن عملاً مرتکب ہوتے ہیں، اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں۔

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ، اس لیئے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا بھی ضرور ہوگا چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے فرمایا۔

و الله یشهد ان المنافقین لکذبون۔ (منافقین: ۱)

اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے فرمایا کہ منافق کی پہچان تین ہے۔ جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔(۱) لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں، جھوٹ باتیں کرنا تو جھوٹ ہی ہے، اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ معناً" اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا، اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا۔

جھوٹ اکیلی برائی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں، بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری بری صفتیں بھی ظاہر کی ہیں، جیسے:

افاک اثیم (شعراء: ۲۲۱)

جھوٹ بولنے والا گنہگار۔

(۱)۔صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ۔

کذب کفار (زمر: ۳)

جھوٹ بولنے والا، احسان کا حق نہ ماننے والا

مسرف کذاب (مومن: ۲۸)

بے باک جھوٹا۔

ان آیتوں نے بتایا کہ جھوٹا گناہوں میں لت پت ہوتا ہے کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں اس کو چھپالوں گا۔ اس لیئے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جو جھوٹا ہوگا وہ اپنے کسی محسن کا احسان نہیں مانے گا۔ کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا، اور اگر وہ زبان سے کہے بھی

کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس کی بات پر یقین کیوں آنے لگا۔ اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اس کو کسی برے سے برے کام کرنے میں باک نہیں ہوتا' وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں' یا جو اس کے اندرونی علم و یقین کی خلاف ہو لیکن یہ کذب قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے کذب عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے۔

بما اخلفوا اللہ ما وعدوہ بما کانوا یکذبون (توبہ: ۱۰)

اسی لیئے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لیئے کہ جھوٹ بولتے تھے۔

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلوں میں نفاق نے جگہ پکڑی قسم کھا کر اور عہد کر کے کسی کام کو طاقت رکھ کر پھر نہ کرنا' ایک قسم کا فریب تو ہے ہی۔ مگر جھوٹ بھی ہے اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہے۔

وسیحلفون باللہ لو استطعنا لخرجنا معکم یھلکون انفسھم و اللہ یعلم انھم لکذبون (توبہ:۲)

اور وہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ لڑائی میں چلتے' وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں' اور اللہ کو معلوم ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

سورۂ احزاب میں اللہ تعالی نے ان صادقین کا ذکر فرمایا ہے جنھوں نے اپنی سچائی کا عملاً ثبوت دیا اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے ان کو منافقین کا خطاب دیا ہے فرمایا:

لیجزی اللہ الصادقین بصدقھم ویعذب المنافقین ان شاء اویتوب علیھم۔(احزاب:۳)

تا کہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کے سبب سے اجر دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان پر رجوع ہو (یعنی

دکھاوا کرنے والا جھوٹ کے دو پاجامے پہننے والے کی طرح ہے۔ (۱)۔حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو پاجامے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں اس کا ہونا اپنے پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ' اسی طرح جو عالم نہیں وہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے جو دولت مند نہیں وہ دولتمندی کا دکھاوا کرے' یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا درحقیقت دوسرے کو فریب دینے کی کوشش ہے غالبًا اسی لیئے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بھی زور فرمایا ہے۔(۲)۔

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں' اچھے اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو برا نہیں جانتے' جیسے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لئے ان سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی دیر میں بھول جائیں گے' اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے مگر جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے' اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے ایک کم سن صحابی عبداللہؓ بن عامر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے تو ماں نے میرے بلانے کے لئے کہا کہ یہاں آؤ تجھے کچھ دوں گی۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم کہتی ہو مگر تم اس کو کچھ دینا نہیں چاہتی ہو ماں نے کہا اس کو کھجور دیدوں گی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' ہاں اگر تم اس وقت کچھ نہ دیتیں تو یہ جھوٹ بھی تمہارا لکھا جاتا۔(۳)۔

اس تعلیم کا منشا یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال میں بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا چاہیئے' لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لیئے بھی ہے کہ ماں باپ کے غلط رویہ سے بچہ کی تعلیم و تربیت پر برا اثر پڑے وہ بچپن میں بھی کچھ اور سنے گا۔اسی سانچے میں ڈھلے گا۔اس لیئے لوگوں کو چاہیئے کہ بچوں سے بھی جھوٹ نہ

بولیں۔

بعض لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب ان کو کھانے کے لیئے یا کسی اور چیز کے لیئے کہا جاتا ہے تو تصنع اور بناوٹ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں حالانکہ ان کے دل میں اس کی خواہش موجود ہوتی ہے تو یہ بھی جھوٹ ہے چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماءؓ بنت یزید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے اور پھر کہدے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں تو کیا یہ بھی جھوٹ

(۱)۔ابوداؤد کتاب الادب (۲)۔ صحیح بخاری باب الوصل فی الشعر (۳)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔

شمار ہوگا' ارشاد ہوا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے۔(۱)۔

اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش گپی کے موقع پر محض لطف صحبت کے لیئے بولا جاتا ہے اس سے بھی اگر چہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ بعض موقعوں پر یہ ایک دلچسپی کی چیز بن جاتا ہے' تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''جو شخص لوگوں کے ہنسانے کے لیئے جھوٹ بولتا ہے اس پر افسوس' اس پر افسوس (۲)۔ کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے' اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے' اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا سچ جھوٹ برابر ہے۔

اس صورت کے علاوہ وہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کیے ہیں' ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابل اعتبار سمجھتا ہے اس لیئے اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے لیکن وہ شخص اس کے علم و یقین سے ناجائز فائدہ' اٹھاتا ہے' اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب و نقصان میں مبتلا کر دیتا ہے اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے

کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درآنحالیکہ وہ تم کو سچ سمجھتا ہو۔ (۳)۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو۔ یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو زور اور افک وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہیں۔

جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔

فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور۔
(حج: ۴)

بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کہنے سے بچتے رہو۔

زور اگرچہ ایک عام لفظ ہے جس میں کذب و بہتان وغیرہ سب شامل ہیں لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر جھوٹی شہادت مراد ہے، جامع ترمذی میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟ صحابہؓ نے کہا ''ہاں یا رسول اللہ'' فرمایا کہ شرک اور باپ ماں کی نافرمانی۔ راوی کا بیان ہے کہ آپ ﷺ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً اٹھ بیٹھے اور کہا کہ ''جھوٹی شہادت یا جھوٹی بات'' اور برابر یہی کہتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ ﷺ خاموش ہو جاتے۔ (۴)۔

اس آیت پاک اور اس کی تشریح میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی وہ یہی جھوٹ ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا۔

---

(۱)۔مسند احمد و طبرانی کبیر (مجمع الزوائد ھیثمی ص ۲۴۰ باب فی ذم الکذب (۲)۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب باب التشدید فی

الکذب (۳)۔ ادب المفرد باب اذا کذب الرجل وھو لك مصدق۔
(٤)۔ ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی حقوق الوالدین۔

افک اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے' اس کے معنی ہیں کسی پر جھوٹ باندھنا مشرک خدا پر جھوٹ باندھا کرتے تھے' ان کو قرآن نے افک کہا ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے منافقین نے حضرت عائشہؓ پر جو اتہام لگایا تھا اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ افک سے تعبیر کیا ہے' (نور:۱) اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ افک بڑے خبث طینت کا کام ہے فرمایا:

تنزل علی کل افاك اثیم (الشعراء: ۱۱)

اور شیطان (تو) اترا کرتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے بدکردار پر۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے' ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے' اور سوسائٹی میں اس کی بات کی کوئی قدر نہیں ہوتی اس لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع (مقدمہ صحیح مسلم)

آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ کہتا پھرے۔

ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سمعون للکذب (جھوٹ کے بڑے سننے والوں) کا خطاب دیا ہے یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا:

سمعون للکذب (مائدہ:٦)

جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں۔

جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے جو شخص کسی بات کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے وہ اصل میں اپنے بیان کی سچائی پر خدا کو گواہ بناتا ہے' ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیئے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے' اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور سچائی سے دور ہیں وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں' انہیں معلوم ہے کہ لوگ ان کے بیان کو سچا نہیں سمجھتے اس لیئے وہ لوگوں کو فریب دینے کیلئے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔

اول تو بے ضرورت قسم کھانا ہی برا ہے' پھر جھوٹی قسمیں کھانا تو اور بھی برا ہے اس لیئے قرآن پاک میں اسی قسم کے قسم کھانے والوں کی بہت برائی آئی ہے' یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے' جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کو بھی شریک کرتا ہے' اسی لیئے کسی آئندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھالے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے' اور اگر کسی سبب سے پورا نہ کر سکے' تو وہ گنہگار ہوتا ہے' اور اس پر کفارہ لازم آتا ہے' کفارہ یہ ہے کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑے پہنائے' اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روز رکھے اور اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ قسم کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے۔ (۱)۔

(۱)۔ابوداؤد کتاب الایمان والنذور۔

لایئواخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یواخذکم بما عقدتم الایمان فکفارتہ اطعام عشرہت مسکین من اوسط ماتطعمون اھلیکم او کسوتھم او تحریر رقبتہ ط فمن لم یجد فصیام ثلثتہ ایامط ذلک کفارہت ایمانکم اذا حلفتم واحفظوا ایمانکم۔ط (مائدہ: ۱۲)

اللہ تم کو تمہاری بے فائدہ قسموں پر نہیں پکڑتا' لیکن اس قسم پر

کریں لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان فرماتا ہے۔

چونکہ اس طرح کی قسمیں کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں' اسی لیئے یہ نفاق کی بڑی نشانی ہے اور قرآن پاک میں اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے' منافقوں کے تذکرہ میں ہے کہ جب ان پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں ہمارا یہ منشا نہ تھا۔ ہماری نیت نیک تھی۔ خدا فرماتا ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کی بات خوب معلوم ہے۔

فکیف اذا اصابتھم مصیبتہ بما قدمت ایدیھم ثم جاء وک یحلفون باللہ ان

پھر کیسا جب ان کو اپنے ہی کرتوت سے کوئی تکلیف پہنچے پھر تیرے پاس اللہ کی قسم کھاتے آئیں کہ ہماری

اردنا الا احسانا و توفیقا۔ اولئک الذین یعلم اللہ مافی قلوبھم۔ (نساء: ۹)

غرض بھلائی اور ملاپ کی تھی' یہ وہ ہیں جن کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم ہے۔

یعنی اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کچھ ہے اور زبانوں پر کچھ ہے ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر متعلق اشخاص کو خوش کر دیں خدا فرماتا ہے کہ اگر ان کے ایمان ہو تو ان کو چاہیئے کہ سچائی اختیار کر کے خدا اور رسول کو خوش کریں۔

یحلفون باللہ لکم لیرضوکم واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مئومنین۔ (توبہ: ۸)

تمہارے (مسلمانوں کے) آگے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں تا کہ وہ تم کو راضی کر لیں' اور اللہ اور رسول کو راضی کرنا زیادہ ضروری ہے' اگر وہ ایماندار ہیں۔

ایسے منافقوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہیں' اور اس پر پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے تو فوراً مکر جاتے ہیں۔

یحلفون باللہ ماقالوا ولقد قالوا کلمۃ الکفر۔ (توبہ: ۷۴)

خدا کی (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا۔ حالانکہ انہوں نے بیشک کفر کی بات کہی۔

ایک موقع پر منافقوں نے ایک نامعقول کام کیا خدا نے فرمایا کہ جب تم جا کر ان سے پوچھو گے تو وہ خدا کی قسم کھا جائیں گے یحلفون باللہ (توبہ: ۱۲) چنانچہ ایسا ہی ہوا' اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

یحلفون لکم لترضوا عنھم فان ترضوا عنھم فان اللہ لا یرضی عن القوم الفسقین۔ (توبہ: ۹۶)

تمہارے آگے قسمیں کھاتے ہیں' تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں۔

اس لئے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہیں اور زبان سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ مانتے ہیں وہ فاسق اور نافرمان ہیں۔

اسی موقع پر کچھ منافقوں نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کر لی تھی۔ خدا نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو جھٹ قسم کھا بیٹھیں گے کہ ہماری نیت اچھی تھی۔ فرمایا۔

ولیحلفن ان اردنا الا الحسنیٰ واللہ یشھد انھم لکذبون۔ (توبہ: ۱۰۷)

اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی' اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اہل نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے۔

ویحلفون علی الکذب وھم یعلمون۔ (مجادلہ:۳)

اور وہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں۔

اتخذوا ایمانھم جنتہ (مجادلہ:۳، منافقون:۱)

انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے۔

یعنی قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ، اور اس کو اپنے بچاؤ کے لیئے ڈھال بنایا کرتے ہیں۔

اللہ تعالی نے مسلمانوں کو اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی۔

ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدھا وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا ان اللہ یعلم ماتفعلون ولا تکونوا کالتی نقضت غزلھا من بعد قوۃ انکاثا تتخذون ایمانکم دخلا بینکم ان تکون امۃ ھی اربی من امۃ (نحل:۱۳)

اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑ مت ڈالو اور تم نے اپنے پر خدا کو ضامن بنایا ہے، بیشک اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے، اور اس عورت کے جیسے نہ بنو جو اپنے کاتے سوت کو محنت کے پیچھے توڑ کر ٹکڑے کرتی تم اپنی قسموں کو آپس میں بیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر ہو۔

خدا کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا، اور اسکو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے اسی لیئے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا خدا کو ضامن ٹھہرایا اس لیئے قسم کھا کر توڑا نہ کرو، اور لوگوں کو دھوکہ نہ دیا کرو پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے جیسے عرب کی ایک بیوقوف عورت کا تھا جو سوت کات کات کر کھول دیتی، یا ٹکڑے کر ڈالتی۔

جب ایک فریق دوسرے فریق سے خدا کا نام لے کر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے، اب اگر وہ کوئی قوت پا کر بدعہدی کرتا ہے اور

اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا خدا کے نام پر جھوٹ بولنا ہے' اور یہ ایک کے بجائے دو گناہوں کا مجموعہ ہے یعنی غضب اور جھوٹ اور وہ بھی خدا کے پاک اور مقدس نام پر' اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ان الذین یشترون بعھد اللہ وایمانھم ثمنا قلیلا ط اولئک لا خلاق لھم فی الاخرہت ولا یکلمھم اللہ ولا ینظر الیھم یوم القیمہت ولا یز کیھم ولھم عذاب الیم۔ (آل عمران:۸)

بیشک جولوگ خدا کے قرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) تھوڑا سا مال خریدتے ہیں' آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں نہ اللہ ان سے بات کرے گا' اور نہ ان کی طرف دیکھے گا قیامت میں اور نہ ان کو پاک کرے گا' اور ان کے لیئے دردناک عذاب ہے۔

شان نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیوں کی بد دیانتیوں کی تصویر ہے' مگر آیت اپنے حکم کے لحاظ سے بہر حال عام ہے ایک دفعہ حضرت عبداللہ صحابیؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہے گا تو جب وہ خدا کے پاس جائے گا تو خدا اس پر غضبناک ہوگا۔ اشعثؓ بن قیس صحابی نے کہا خدا کی قسم یہ آیت میرے واقعہ میں اتری ہے' میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی اس نے میری ملکیت سے انکار کیا' میں نے یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے' میں نے کہا نہیں' تو آپ ~ صل ۳ ~ نے اس یہودی سے فرمایا کہ تم قسم کھاؤ تو میں نے عرض کی کہ یا

نمایاں ہوتا ہے۔

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصلی حقیقت بتانے میں جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں' اس لیئے خاص طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے فرمایا۔ ''جھوٹی قسم مال بکوا دیتی ہے' لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹا دیتی ہے۔(۱)۔ روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے وہ تو ہے ہی' لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اس کی عام بے اعتباری کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت میں ہے حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تجارت میں بہت قسمیں کھانے سے پرہیز کرو' کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے پھر بے برکتی ہو جاتی ہے' کیسے بلیغ فقرے ہیں۔ (مسلم ونسائی وابن ماجہ)

جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بیباکی کے ساتھ قسمیں کھانا بھی اسلامی شرافت کے خلاف ہے قرآن پاک کی آیت اوپر گزر چکی ہے کہ بے سبب قسمیں کھانا ذلت و خواری کا سبب ہے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''قسمیں کھانا قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے یا ندامت اور شرمساری کا موجب ہے۔(۲)۔

---

(۱)۔ صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین (۲)۔ سنن نسائی باب فی ذکر الکبائر (۳)۔ سنن ابی داؤد کتاب الایمان۔ (٤)۔ صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی' منذری باب ترغیب التجار فی الصدق (٥)۔ ابن ماجہ و صحیح ابن حبان منذری باب ترغیب التجار فی الصدق ۱۲۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے تین باتوں کا ذمہ لوتو میں تمہارے لئے جنت کا ذمہ لیتا ہوں، جب بولو تو سچ بولو، اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو، اور جب امین بنو تو خیانت نہ کرو۔(۲)۔

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

خیانت اور بد دیانتی!

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو اس کے ادا کرنے میں ایمانداری نہ برتنا خیانت اور بد دیانتی ہے' اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اس میں بے جا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو۔ تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو' یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کر کے

(۱)۔ترغیب و ترہیب منذری باب الترغیب فی الصدق (۲)۔ احمد' حاکم' ابو یعلی' بیہقی' منذری باب نجاز الوعد

کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کو کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے' اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اس کو وہ دیانتداری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا۔ علی ہذا عام مسلمانوں' ائمہ وقت اور اپنے متفقہ قومی اور ملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت بد دیانتی ہے' دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے' دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے اسلام کی اخلاقی شریعت میں یہ ساری خیانتیں یکساں ممنوع قرار ہیں۔ فرمایا:

یایھا الذین امنوا لا تخونوا اللہ والرسول وتخونوا امنتکم وانتم تعلمون۔ (انفال: ۳)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں جان کر بد دیانتی کرو۔

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کر کے پورا نہ کیا جائے۔ ایمانداری سے ان کے حکموں کی تعمیل نہ کی جائے' دین و ملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی جائے اور اللہ و رسول اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چھپے چوری امداد پہنچائے یا مسلمانوں کے چھپے راز ان کو بتائے جائیں اسی طرح آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو اس میں وہ ناجائز تصرف کرے' اور کسی کا جو

راز کسی کو معلوم ہو اس کو دوسروں پر ظاہر کر دے۔

یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آ چکی ہے کہ منافق کی تین علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے (۱)۔ ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ خدا کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے لیکن امانت کا' قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا اگر چہ وہ خدا کی راہ میں شہید ہی ہوا ہو' اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو' وہ کہے گا خداوندا! اب کیسے لاؤں دنیا تو ختم ہو چکی' کہا جائے گا اس کو دوزخ کے طبقہ ہاویہ میں لے جاؤ وہاں امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت میں سامنے آئے گی' تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان لے گا' اور اس کے پیچھے گرے گا۔ یہاں تک کہ اس کو پکڑ لے گا اور اس کو اپنے کندھوں پر لاد کر لے چلے گا جب دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ بوجھ اس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ گرتا چلا جائے گا پھر انہوں نے فرمایا نماز امانت ہے وضو امانت ہے تول بھی امانت ہے' ناپ بھی امانت ہے اور بہت سی چیزیں گنا کر فرمایا' اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزوں کا ہے راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث براءؓ بن عازب صحابی کو سنائی' انہوں نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی۔

ان اللہ یامرکم ان تئودوا الامانت الی اھلھا (نساء: ۸)

بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کر دیا کرو۔ (۲)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر جو اس کے بعد آئے گا' پھر جو اس کے بعد آئے گا' پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دیں گے' خیانت کریں گے امانت داری نہیں کریں گے اور نذر مانیں گے تو پوری (۳)۔ نہ کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن بری باتوں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے‘ان میں سے ایک خیانت

(۱)۔صحیحین وغیرہ ۱۲۔(۲)۔مسند احمد بیہقی منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد (۳)۔صحیح بخاری و صحیح مسلم منذری باب مذکور

بھی ہے فرمایا کرتے تھے کہ الٰہی! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا کہ یہ بہت برا اندرونی ساتھی ہے۔(۱)۔

خیانت کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسی جماعت میں شامل ہوکر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر میں لگے رہنا۔ چنانچہ منافقین جو دل میں کچھ رکھتے تھے اور زبان سے کچھ کہتے تھے‘وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشوں میں لگے رہتے تھے مگر ان کی یہ چال کارگر نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ اس کا بھید کھل جاتا تھا‘فرمایا:

ولا تزال تطلع علی خائنۃ منھم۔(مائدہ:۳)

اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے ان کی ایک خیانت کی۔

یعنی ان کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی ہے۔

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے‘ حضرت یوسفؑ نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی‘اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لئے کیا:

ذلک لیعلم انی لم اخنہ بالغیب وان اللہ لا یھدی کید الخائنین۔(یوسف:۷)

تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہوجائے کہ میں نے چوری چھپے اس سے خیانت نہیں کی‘اور بیشک اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلاتا۔

حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں نے اپنے مقدس شوہروں سے بے وفائی کی‘ ان کی بے وفائی یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لائیں اور

کافروں کا ساتھ دیتی رہیں' خدا نے فرمایا:

ضرب اللہ مثلا للذین کفروا امرات نوح و امرات لوط کانتا تحت عبدین من عبادنا صلحین فخانتا ھما فلم یغنیا عنھما من اللہ شیئا۔

خدا نے کافروں کیلئے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان کی' یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں تو ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی تو یہ دونوں (پیغمبر ہو کر بھی) اپنی بیویوں کو خدا سے ذرا نہ بچا سکے۔

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے' بلکہ ایک ایک عضو سے ہو سکتی ہے' یہاں تک کہ چشم و ابرو کے اشاروں سے ہو سکتی ہے' لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپی کی ہر حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو' اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتوں کا خاتمہ کرتا ہے۔ فرمایا:

یعلم خائنۃ الاعین و ما تخفی الصدور۔ (مومن: ۳)

اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری اور جو چھپا ہے سینوں میں۔

پھر اس سے چھپ کر کیوں کر کوئی کام کر سکتا ہے۔

غداری اور دغابازی

غداری اور دغابازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے قرآن پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے' عربی میں عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں' اسلام نے اس کی

(۱)۔ابوداؤد و نسائی ابن ماجہ منذری باب مذکور۔

شدید برائی کی ہے۔ کفار میں سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کر کے بدل جاتے تھے اور بار بار بدعہدی کرتے تھے' ان کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:

الذین عاھدت منھم ثم ینقضون عھدھم فی کل مرۃ وھم لا یتقون۔ فاما تثقفنھم فی الحرب فشرد بھم من خلفھم لعلھم یذکرون۔ واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علی سواء ان اللہ لا یحب الخائنین۔(انفال:۷)

جن سے تو نے معاہدہ کیا' پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ تقوی (خدا کا لحاظ) نہیں رکھتے' سو اگر ان کو تو کبھی لڑائی میں پا دے تو ان کو ایسی سزا دے کہ ان کے پچھلے دیکھ کر بھاگیں۔ شاید وہ عبرت پکڑیں اگر تجھ کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو ان کو تو برابر کا جواب دے اللہ کو دغاباز خوش نہیں آتے۔

اس آیت میں گو ان کافروں کا ذکر ہے' جو ہر دفعہ عہد کر کے بدعہدی اور دغابازی کرتے تھے مگر باتیں ان میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں ایک یہ کہ بدعہدی سراسر تقوی کے خلاف ہے۔ دوسری یہ کہ یہ غداری دغابازی اور بدعہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے' اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے بدر کے قیدیوں کو فدیہ اور وعدہ لے کر چھوڑ دینے کی اجازت جہاں دی گئی ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے۔ کہ اگر یہ خیانت اور دغا کریں تو اللہ ان سے سمجھ لے گا۔ پھر ان کو دوبارہ تمہارے قابو میں لے آئے گا۔ فرمایا:

وان یریدوا خیانتك فقد خانوا الله من قبل فامکن منهم والله علیم حکیم۔(انفال: ۱)

اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ اس سے پہلے خدا سے بھی خیانت (دغا) کر چکے ہیں تو خدا نے ان پر قابو دے دیا اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

خدا سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے' تو خدا تو سب کا حال جانتا ہے اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے اس نے ان کے چھوڑنے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا' قیامت کے دن ہر غدار کا ہر ایک جھنڈا ہوگا۔(۱)۔یعنی اس سے اس کی بدعہدی اور غداری کی تشہیر ہوگی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی فوج کے افسروں کو جو نصیحتیں فرماتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ بدعہدی نہ کرنا۔(۲)۔یعنی دشمنوں سے معاہدہ کر کے پھر غداری نہ کی جائے' ظالم بادشاہوں' حاکموں افسروں' سپہ سالاروں کا ایک چلتا ہوا حلیہ یہ ہوتا ہے کہ امن وامان کا وعدہ کر کے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہیں' اور جب وہ ان کے قابو میں آجاتا ہے تو اس کو سزا دیتے یا مروا دیتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی کو جان کا امن دیا اور پھر مروا ڈالا تو میں اس سے الگ ہوں۔ اگرچہ مقتول کافر ہی کیوں نہ ہو۔(۳)۔خدا فرماتا ہے:

یایها الذین امنوا اوفوا بالعقود۔(مائدہ: ۱)

اے ایمان والو! اپنی گرہوں (قول وقرار) کو پورا کرو۔

---

(۱)۔صحیح مسلم کتاب الجهاد واسیر (۲)۔ ایضاً (۳)۔ سنن ابی ماجه و صحیح ابن حبان منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد۔

عقود کی تعمیم میں وہ تمام شرطیں' وعدے اور معاہدے داخل ہیں۔جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے' یہاں تک کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی جو معاہدہ کریں اس کا حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے' ایک

دفعہ امیر معاویہؓ نے رومیوں سے مدت متعینہ کے لئے کوئی معاہدہ کیا' اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیر موصوف اپنی فوجیں لے کر ان کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کر دیں۔ یہ دیکھ کر عمروؓ بن عنبسہ نامی صحابی سوار ہو کر نکلے اور چلائے اللہ اکبر! اللہ اکبر! بدعہدی نہیں' امیر معاویہؓ نے بلوا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا' میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گرہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے (یعنی نہ اس میں سے کچھ کم کیا جائے) اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کہ معاہدہ کو ایک قلم رد کر دیا ہے۔'' یہ سن کر امیر معاویہؓ واپس چلے آئے۔ (۱)۔غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے معاہدہ کے لفظوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی' لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا' رسول اکرم ﷺ کے تربیت یافتوں نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا۔

بہتان

بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے یا اس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کی جائے' یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے۔ بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔

بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا' لیکن شرارت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سر اس لئے تھوپا جاتا ہے کہ اس کی بدنامی ہو قرآن نے اس کا نام بہتان رکھا ہے۔ یہ دونوں باتیں جھوٹ ہونے کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہیں اور اسی لئے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے میں شریک ہو جاتے ہیں وہ بھی گنہگار اور خیانت کار ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں طعمہ نامی مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابی کے گھر میں چوری کی' مسلمانوں کو اس پر شبہہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا۔ وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا۔ اس منافق کے گھر والوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس کو بری ٹھہرایا آنحضرت ﷺ نے اس کے موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وحی الٰہی نے دفعتًا حقیقت کا پردہ چاک کر دیا۔ دوسری روایت یہ کہ جاتی ہے کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے کو دی' اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کر دیا اور زرہ دوسرے کے گھر میں پھینک دی' لوگوں نے اس کو پکڑا' آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا آپ ؐ صل۳ؐ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا اس وقت یہ وحی آئی۔ (۲)۔ بہر حال واقعہ جو کچھ ہو امر مشترک یہ ہے کہ گناہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گناہگار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتیں ہیں:

(۱)۔سنن ابی داؤد باب الوفاء بالعہد (۲)۔ جامع ترمذی تفسیر سورئہ نساء (۳)۔ طبری سورئہ نساء آیت

ارك الله ولا تكن للخائنين خصيما۔ واستغفر الله ان الله كان غفورا رحيما۔ ولا تجادل عن الذين يختانون انفسهم ان الله لا يحب من كان خوانا اثيما۔ يستخفون من الناس ولا يستخفون من الله وهو معهم اذ يبيتون مالا يرضى من القول وكان الله بما يعملون محيطا۔ (نساء:۱۰۶)

ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر) ایک سچی کتاب اتاری ہے کہ تو لوگوں کے درمیان اس کے ذریعہ جو خدا نے تجھ کو سوجھایا انصاف کر، اور خیانت کاروں کی طرف سے نہ جھگڑنا اور اللہ سے قصور معاف کرا بیشک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے، اور ان کی طرف سے نہ جھگڑ جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں۔ بے شک اللہ خیانت کار گناہگاروں کو دوست نہیں رکھتا وہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ ہی ہے جب رات کو وہ سازش کرتے ہیں، جو خدا کو پسند نہیں اور اللہ ان کے کاموں کو گھیرے ہے۔

آگے چل کر ہے:

ومن يكسب خطيئة او اثما ثم يرم به بريئا فقد احتمل بهتانا واثما مبينا۔ (نساء:۱۰۶)

اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے اس نے طوفان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔

ان آیتوں میں خیانت کار از تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے، سب سے پہلے تو رسول کو انصاف کی تاکید ہے، پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور ان کی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے، پھر فرمایا جو ایسے خائن ہیں وہ بڑے گناہگار ہیں اور خدا کی محبت سے محروم ہیں یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لئے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالتے ہیں، اور خدا سے نہیں شرماتے، جو ہر جگہ ان

کے ساتھ ہے اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کر سکتا اس کے بعد یہ سرزنش اس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لادا۔

پہلے عرب میں دستور تھا جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی وہ ان میں کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی۔ یا مجہول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی نسبت دیتی تھی' خدا نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے۔ اس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آئندہ اس جرم سے باز رہے گی۔

ولا یاتین ببہتان یفترینہ بین ایدیھن وارجلھن۔ (ممتحنہ: ۳)

اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں۔

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بری بات ہے۔ پھر بن کئے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دلی تکلیف پہنچانا کتنی بری بات ہے' خدا نے فرمایا:

والذین یؤذون المؤمنین والمؤمنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بہتانا واثما مبینا۔ (احزاب: ۷)

اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بن کئے (تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہیں انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔

اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہئے کہ بہتان باندھنے والا خدا تعالیٰ کے حضور میں فاسق ٹھہرایا گیا' اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لئے بے اعتبار ہو گئی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا۔ حالانکہ وہ بے گناہ ہو' یعنی اس نے وہ جرم نہیں کیا تھا۔

تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا (۱)۔ یہ گویا قذف یعنی تہمت بیجا کی مثال سزا ہوگی' ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس میں جو برائی نہیں' اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان (۲)۔ ہے'' یعنی اس سے بچنا چاہئے۔

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

چغل خوری

چغل خور کا کام یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکائے اور اپنا رسوخ جتائے' اور چونکے ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی ایسی بات دوسرے کو پہنچاتے ہیں۔ جس سے دوسرے کو پہلے پر غصہ آئے اور اس سے نفرت پیدا ہو' اسی لئے قرآن نے ان لوگوں کے اوصاف میں جن کی بات نہیں ماننی چاہئے۔ یہ لفظ کئے ہیں: مشاء بنمیم۔ (قلم) جو چغلی کھاتا پھرتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرما دیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہیں تو اس کی بات ہی نہ مانی جائے' ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو۔ فرمایا:

یایھا الذین امنوا ان جاء کم فاسق بنبا فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالہت فتصبحوا علی ما فعلتم ندمین (حجرات: ۱)

اے ایمان والو! اگر کوئی گناہگار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو' کہیں کسی قوم پر نادانی سے جا نہ پڑو پھر اپنے کئے پر پچھتانے لگو۔

اس آیت میں غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبریں پھیلانے والے کو خدا نے فاسق کا خطاب دیا اور چونکہ اس بد اخلاقی کا مقصد زیادہ تر دو شخصوں' بالخصوص' عزیز و اقارب اور دوست و احباب میں نا اتفاقی پیدا کرنا ہوتا ہے' اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے برے لوگ کون ہیں' پھر خود ہی فرمایا:

المشائون بالنمیمہت المفسدون بین الاحبہت (مسند احمد ج ۶ صفحہ ۴۵۹ عن اسماء بنت یزید

جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے ہیں۔

صحیحین میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قبرستان کے پاس سے گزرے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا۔(۳)۔

(۱)۔و (۲)۔ سنن ابوداؤد کتاب الادب۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الطھارہ باب من الکبائر ان لا یستتر عن بولہ و صحیح مسلم کتاب الطھارہ باب الدلیل عن نجاستہ البول (٤)۔ مسلم کتاب البر وصلہت باب تحریم النمیمہت

الا انبئکم ما العضہت ھی النمیمہت القالہت بین الناس۔

کیا میں تم کو بتاؤں کہ غصہ کیا ہے، وہ چغلخوری ہے جو لوگوں کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔

لغت میں غصہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہیں، اس لئے اگر اس حدیث میں تفریق کے معنی لئے جائیں تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں علیحدگی کرنا چغل خوری کی حقیقت میں داخل ہے، لیکن اگر سحر کے معنی لئے جائیں تو اس صورت میں بھی سحر اور چغل خوری میں مشابہت و مناسبت ہے کیونکہ سحر سے بھی دو شخصوں بالخصوص میاں بی بی میں علیحدگی کرائی جاتی ہے، چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے:

فیتعلمون منھما ما یفرقون بہ بین المرء وزوجہ۔(بقرہ:۱۲)

اس پر بھی ان (ہاروت ماروت) سے ایسی باتیں سیکھتے ہیں جن کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہیں جو لوگ ہاروت ماروت سے سیکھتے تھے لیکن علماء کے نزدیک یہ مقصد چغلخوری سے حاصل کیا جاتا تھا۔

عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی

لایدخل الجنہت قتات۔ (۲)۔

جنت میں چغلخور داخل نہ ہوگا۔

(۱)۔ابوداؤد کتاب الادب باب فی رفع الحدیث (۲)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی القتات۔

اس قسم کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں تا کہ ان کا اثر بڑھ جائے اسی لئے عربی زبان میں چغلخوری کو ''وشایہ'' کہتے ہیں جس کے معنی نقش و نگار کے ہیں اور ادھر کی ادھر لگانے کے لئے چغلخوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے۔ اسی مناسبت سے چغلخوری کو ''سعایہ'' بھی کہتے ہیں جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں۔

یہ کام اگر چہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے' لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہیں' بلکہ تحریر و کتابت رمز و اشارات سے بھی چغلخوری کی جاسکتی ہے' اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں' یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ فلاں شخص یہ کہتا تھا'' بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ'' فلاں شخص یہ کام کرتا تھا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ''محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ یہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہو جائے۔''

اسی بنا پر چغلخوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ فلاں شخص لوگوں کے جو حالات دیکھے یا سنے ان کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''ترک مالا یعنی'' کی جو ہدایت مسلمانوں کو کی ہے اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

چغلخوری ایک فتنہ پردازی ہے جس کے نتائج بعض حالتوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور قتل و خون ریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے اسی کے

ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے' اور اس میں غیبت' بہتان' تجسس' کذب وفریب' نفاق' غرض مختلف بداخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں' اس لئے وہ ان نتائج اور ان عناصر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے' لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن ومعاشرت کا ایک جزو ہوگئی ہے' اگر امراء کے درباروں میں تملق وخوشامد کے لئے چغلخوری کی جاتی ہے تو عام صحبتوں میں اس سے تفریح خاطر اور لطف صحبت کا کام لیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے اور اس کو لوگ گناہ کبیر نہیں سمجھتے' اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو مردوں کی آواز سنی جن پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا تھا' فرمایا ان پر عذاب ہو رہا ہے لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا۔ حالانکہ دو بڑے گناہ کے کام ہیں۔ ان میں ایک تو پیشاب آڑ میں نہیں کرتا تھا اور دوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا۔ (۱)۔

اس حدیث شریف کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں' یہاں تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپ ﷺ نے یہ فرمادیا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہ کبیر ہے تو اس کو منسوخ کردیا اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونوں بداخلاقیاں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ ان کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگتے ہیں' حالانکہ وہ معمولی چیز نہیں بلکہ کبائر وموبقات میں داخل ہیں۔

(۱)۔بخاری کتاب الادب باب النمیمۃ من الکبائر۔

قرآن مجید میں بھی اس کی نظیر موجود ہے' چنانچہ افک عائشہ کے عام چرچے کے متعلق ارشاد الٰہی ہے۔

اذ تلقونہ بالسنتکم وتقولون بافواھکم ما لیس لکم بہ علم وتحسبونہ ھینا وھو عند اللہ عظیم۔(نور: ۲)

جب تم لگے اپنی زبانوں سے اس کی نقل در نقل کرنے لگے اور
اپنے منہ سے ایسی باتیں کہنے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم
نے اس کو ایسی ہلکی (سی) بات سمجھا حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک
بڑی (سخت بات) ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہیں، عام دلچسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہیں، حالانکہ وہ معمولی نہیں ہوتیں۔

کشف عورت اور کشف عیوب میں جو مناسبت ہے وہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے، یہ بداخلاقی زیادہ تر نہایت وفی الطبع، پست حوصلہ، متبذل اور نا قابل اعتبار اشخاص میں پائی جاتی ہے۔ بغض و انتقام لینے یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہاں رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی میں شریک ہونے کے لئے اور کوئی ذریعہ نہیں پاتے تو چغلخوری سے کام لیتے ہیں، اس لئے ان کے شر و فساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کی بات نا قابل اعتبار قرار دی جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے اور قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

ولا تطع کلا حلاف مھین ھماز مشاء بنمیم مناع
للخیر معتداثیم۔ (قلم: ۱)

اور تو ایسے کا کہا نہ مان جو بہت قسمیں کھاتا ہے۔ آبرو باختہ
ہے (لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے، چغلیاں لگاتا پھرتا ہے
اچھے کاموں سے (لوگوں کو) روکتا رہتا ہے، حد سے آگے
بڑھ گیا ہے، بدکار ہے۔

غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی عزت و آبرو محفوظ رہے اور ان کے باہمی تعلقات خوشگوار رہیں اس بنا پر جن بداخلاقیوں سے مسلمانوں کی عزت و آبرو کو صدمہ پہنچتا ہے اور ان کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوتی ہے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجموعی طور پر ان کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے:

یایھا الذین امنوا لا یسخر قوم من قوم عسی ان یکونوا خیرا منھم ولا نساء من نساء عسی ان تکن خیرا منھن ولا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان ومن لم یتب فاولئک ھم الظالمون۔ یایھا الذین امنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض

مسلمانو! مردمردوں پر نہ ہنسیں عجب نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (خدا کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں عجب نہیں کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ ان سے بہتر ہوں آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو نام دھرو ایمان لائے پیچھے بدتہذیبی کا نام ہی برا ہے اور جو (ان حرکات سے)

الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتا فکرھتموہ واتقوا اللہ ان اللہ تواب رحیم۔ (حجرات: ۲)

باز نہ آئیں تو وہی خدا کے نزدیک ظالم ہیں مسلمانوں! لوگوں کی نسبت بہت شک کرنے سے بچتے رہو کیونکہ بعض شک داخل گناہ ہیں اور ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے بھلا تم میں سے

کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے
بھائی کا گوشت کھائے تو تم کو گھن آئے اور اللہ سے تقوی کرو
بیشک اللہ رجوع ہونے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول وعمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہئے' لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریقہ سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے' وہ غیبت ہے' امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ تعریض' تصریح رمز و اشارات' تحریر و کتابت اور محاکات و نقالی' ہر طریقہ سے دوسرے کے عیوب بیان کئے جاسکتے ہیں اور ایک شخص کے نسب' اخلاق' دین و دنیا' جسم' کپڑے لتے' غرض ہر چیز میں عیب نکالا جاسکتا ہے' اس لئے اللہ تعالی نے نہایت پرزور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے' اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہہ دی ہے' جس میں بلاغت کے بہت سے نکتے ہیں۔

۱۔ انسان کا گوشت محض اس کی عزت وحرمت کی وجہ سے حرام ہے اس لئے جو چیز اس کی عزت وحرمت کو نقصان پہنچاتی ہے وہ اس کے گوشت کی طرح حرام ہے۔

۲۔ لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدت غضب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہیں اگر چہ یہ بھی ایک برا فعل ہے تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے' لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مرجانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے اسی طرح اگر کوئی شخص رو در رو کسی کو برا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی' لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے' اور بعینہ ایسا ہے' جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے۔

۳۔ لوگ شدت محبت سے بھائی کی مردہ لاش کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے' اس لئے

جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے' اس سے اس کی سخت قساوت و سنگدلی اور بغض وعداوت کا اظہار ہوتا ہے' اور یہ اس لطف ومحبت کے منافی ہے جس کو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

۴۔ مردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت میں جائز ہے اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کے بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا۔ اس لئے غیبت اس وقت جائز نہیں ہوسکتی جب تک کوئی شرعی' معاشرتی' اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرے' اور اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہو علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہئے' اور صرف رمز و اشارہ سے کام لینا چاہئے اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ شب معراج میں میرا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جس کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بولے یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے' اور ان کی عزت وآبرو لیتے تھے۔(۱)۔

اعمال اور اعمال کی جزا وسزا میں مناسبت ہوتی ہے' یہ لوگ چونکہ لوگوں کا گوشت نوچ کھاتے تھے۔ یعنی ان کی غیبت کرتے تھے اس لئے عالم برزخ میں ان کی یہ سزا مقرر کی گئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہیں۔

ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمان کی غیبت کرتے ہیں۔(۲)۔

اس حدیث میں بھی اعمال اور جزا وسزا کی مناسبت ظاہر ہے' مردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے' اس لئے یہ بدبو اسی مردار خوری کا نتیجہ تھی۔

اس حدیث میں ایک نکتہ یہ بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ عیوب کی تشہیر و تفضیح کی جائے اس لئے جس طرح غیبت کرنے والے لوگ عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہیں اسی طرح ان کے عمل کی نجاست و گندگی کی بو بھی دنیا میں پھیل کر لوگوں کو ان سے متنفر کرتی ہے' اسی نکتہ کو آپ ﷺ نے دوسری حدیث میں بلا تشبیہ و تمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا اور فرمایا: اے وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جاگزیں نہیں ہوا ہے' نہ مسلمانوں کی غیبت کرو' اور نہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہو' کیونکہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش میں رہے گا' خداوند تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا' اور خدا جس کے عیب کی تلاش کرے گا خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کرے گا۔ (۳)۔

لغت کی رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کے بیان کو کہتے ہیں' مگر مذہبی تعلیم میں شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لئے کوئی قید نہیں اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی برائیاں ظاہر کی جائیں تو یہ غیبت نہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے ان دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے۔ کہا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں' تو فرمایا اگر وہ عیب اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔ (۴)۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جز نہیں بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہوگی' لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہل لغت کے

نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی میں کی جائے۔ باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہیں ہے بلکہ سب وشتم میں داخل ہے۔

(۱)۔ابوداؤد کتاب الادب باب الغیبہت (۲)۔ ادب المفرد باب الغیبہت (۳)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبہت (٤)۔ ایضًا

اسی طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہیں ہے بلکہ ہاتھ پاؤں، اور آنکھ کے ذریعہ سے بھی غیبت کی جاسکتی ہے، کسی شخص کی نقل کرنا، مثلاً ایک شخص لنگڑا ہے تو اس کے اس عیب کو نمایاں کرنے کے لئے لنگڑا چلنا بھی غیبت ہے، ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔(۱)۔

اسی طرح چشم وابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ دری کرنا بھی غیبت ہے اور قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں غیبت کے ان ہی مخفی طریقوں کی برائی بیان کی ہے۔

ھماز مشاء بنمیم (قلم: ۱)

(لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے (ادھر کی ادھر) چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔

ویل لکل ھمزہ لمزہ۔(ھمزہ)

ہر شخص جو (لوگوں کی) عیب چینی کرتا (اور ان پر) آوازے کستا ہے اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے۔

ان آیتوں میں غیبت کے جن مخفی اور لخراش طریقوں کی مذمت کی گئی ہے ان کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کے لئے اہل لغت کی تصریحات پیش نظر رکھنی چاہئیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ھمز سامنے اور لمز پیٹھ پیچھے برائی کرنا۔

۲۔ھمز خاص طور پر لوگوں کے نسب کی برائی بیان کرنا۔

۳۔ھمز ہاتھ کے اشارے سے اور لمز زبان سے غیبت کرنا۔

۴۔ھمز زبان سے اور لمز آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا۔

۵۔لمز برے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا۔

۶۔لمز آنکھ، ہاتھ، سر اور ابرو کے اشارے سے ہم نشینوں کی برائی بیان کرنا۔اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ غیبت کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

کسی کی برائی بیان کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے، لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی واقعی برائی بیان کی جائے تاکہ ان کو تنبیہ اور ندامت و شرمندگی ہو، اگر بروں کی برائی بیان کرنے کو یک قلم بند کر دیا جائے تو ان کی برائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہو سکے گی۔اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہیں رہ سکتا، قرآن پاک میں کافروں مشرکوں اور منافقوں کی علانیہ برائیاں کی گئی ہیں، مگر کہیں کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ہمیشہ عموم کے ساتھ پردہ میں یا صیغہ مجہول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یوں کہا گیا ہے کہ جھوٹ بولتے ہیں، یا کفر کرتے ہیں، ان کا حال یہ ہے اس طریقہ تعبیر میں یہ فائدہ ہے کہ بروں کی برائی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہیں پہنچتا اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لئے گئے ہیں وہ اس لئے کہ ان کی یہ برائیاں عالم آشکارا تھیں۔

لیکن معاملات میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں، جہاں تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے۔قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے ان موقعوں کی تعین بھی معلوم ہوتی ہے

قرآن پاک کا چھٹا پارہ اس آیت سے شروع ہوتا ہے۔

(۱)۔ابوداؤد و کتاب الادب باب فی الغیبت

لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلمط و کان اللہ سمیعا علیماط(نساء: ۲۱)

اللہ کو بدگوئی پسند نہیں آتی، لیکن جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ سنتا

اور جانتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی کسی کی برائی کو پکار کر کہتا پھرے، لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگوں سے بیان کرے اور ظلم کے ظالمانہ کاموں کو آشکارا کرے اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے، ظالم کو اس کے برے اعمال کی سزا دے گا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بازیابی کی اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ اپنے خاندان میں کس قدر برا شخص ہے، لیکن جب وہ پاس آیا تو اس نے نہایت لطف و کرم کے ساتھ گفتگو کی۔ (۱)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لئے اس کے احوال واقعی کا اظہار جائز ہے۔ غرض جس اظہار میں دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو، اس کو یا تو غیبت ہی نہیں کہہ سکتے اور اگر کہہ سکتے ہیں تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ان مقاصد کو چھ صورتوں میں محدود کر دیا ہے۔

۱۔ حاکم کے مظالم کی بارگاہ سلطانی میں فریاد کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: لصاحب الحق مقالا۔

۲۔ مذہبی اور اخلاقی برائیوں کا انسداد کرنا یعنی بغرض احتساب (چنانچہ اسی بنا پر کفار اور منافقوں کی برائیاں قرآن نے طشت از بام کی ہیں۔)

۳۔ فتویٰ طلب کرنا، اسی بنا پر حضرت ہند بنت عتبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حضرت ابوسفیانؓ کے بخل کی شکایت کی، اور آپ ﷺ نے سن کر اس کا مناسب جواب دیا۔

۴۔ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کا بچانا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے اسی غرض سے ایک شخص کو بئس ابن العشیرہ ''قبیلہ کا برا آدمی'' کہا تھا۔

۵۔ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اس کا عیب ظاہر ہو مگر غایت شہر کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑ نہ ہو مثلاً اعمش یا اعرج' کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار دیا گیا ہے اور یہ اس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ایک صحابی کو ذوالیدین (دو ہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا۔

۶۔علانیہ فسق وفجور کرنے والے کی برائی بیان کرنا (تا کہ) اس کو متنبہ اور دوسروں کو عبرت ہو مثلاً مخنث کو مخنث کہنا۔

---

(۱)۔ بخاری کتاب الادب مایجوز من اغیاب اھل الفساد والریب۔

دورخاپن

اگر دوشخصوں میں اختلاف ہوتو ایک شخص خلوت وصداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے لیکن اس قسم کے تعلقات میں دورخاپن نہیں پایا جانا چاہئے یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہئے' بلکہ یہ بداخلاقی چغلخوری سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ چغلخو رصرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دورخاپن آدمی دونوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے۔

دورخے پن کیلئے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے اور اسکے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے تو بھی وہ دورخا کہلائے گا۔نفاق میں جوخصوصیات پائی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے' اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسکو بھی نفاق سمجھتے تھے ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ ''ہم لوگ امرا اور احکام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور جب انکے یہاں سے نکلتے تو کچھ کہتے ہیں۔'' بولے ''ہم لوگ عہد رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے۔(۱)۔اور قرآن مجید میں بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے۔

واذا لقوا الذین امنوا قالوا امنا واذا خلوا الی شیطینھم قالوا انا معکم انما نحن مستھزء ون۔(بقرہ:۲)

اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے تو کہتے ہیں ہم (بھی تو) ایمان لا چکے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں' ہم تو صرف مسلمانوں کو بناتے ہیں۔

معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقتوں کو اردو میں دو رخا اور

عربی میں ذوالوجہین کہتے ہیں اور احادیث میں اس قسم کے لوگوں کے لئے وعید شدید آئی ہے مثلاً فرمایا ''قیامت کے دن خدا کے نزدیک تم سب سے برا دو رخے کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور (۲)۔'' ایک اور حدیث میں فرمایا:

''دنیا میں جس کے دو رخ ہوں گے قیامت کے دن اس کے منہ میں دو زبانیں ہوں (۳)۔گی۔'' یہ گویا اس کی اس عادت ذمیمہ کی تمثیل ہوگی کہ وہ لوگوں سے دو رنگ کی باتیں کیا کرتا تھا۔

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کے کام میں بد نیتی معلوم ہوتی ہے اور کسی کے کام میں اس کو حسن نیت نظر نہیں آتا۔ دوسروں کی طرف ان ہوئی باتیں منسوب کرنے لگتا

---

(۱)۔صحیح بخاری باب ماقیل فی ذی الوجھین۔ (۲)۔ بخاری کتاب الادب باب ماقیل فی ذی الوجھین و صحیح مسلم و مالك

(۳)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب ذی الوجھین

ہے۔ دوسرے کو بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی کترانے لگتا ہے' اس سے آپس میں نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔

یاایھا الذین امنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم (حجرات: ۲)

اے ایمان والو! بہت گمانی سے بچاؤ کرو بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض و حسد اور دوسرے کے معاملات کے تجسس و تلاش کی بھی ممانعت فرمائی کیونکہ وہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہیں فرمایا:

''تم بدگمانی سے بچو' کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے تم دوسروں کے ٹوہ میں نہ رہا کرو' اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرو' اور نہ آپس میں حسد رکھو' اور نہ بغض رکھو' اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو' اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے۔ آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ''(۱)۔

یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کام کر رہا ہو' یا کسی ایسی حالت میں جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے' تاکہ دوسرا فتنہ میں نہ

پڑے، اس کی مثال خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش فرمائی ہے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کو ازواج مطہراتؓ میں سے کوئی آپ ﷺ سے ملنے آئیں آپ ﷺ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں دو انصاری آ پڑے، وہ آپ ﷺ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے اور واپس پھرنے لگے آپ ﷺ نے فوراً آواز دی اور فرمایا یہ میری بیوی فلاں ہیں انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپ ﷺ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے (۲)۔

مداحی اور خوشامد

مداحی اور خوشامد' اخلاق کی پستی' دناعت اور رذلت کی علامت ہے اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہے' اور یہ اس کے لیئے بھی تباہی کا سامان ہے جس کی مداحی اور خوشامد کی جاتی ہے' خوشامد اور مداحی کرنے والا تین گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفیں کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتی ۔ یہ جھوٹ ہے دوسرا یہ کہ وہ منہ سے جو تعریفیں کرتا ہے اس کو اپنے دل مین خود درست نہیں سمجھتا' یہ نفاق ہے ۔ تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدوں کے لیئے ارباب قدر و جاہ کی خوشامدانہ تعریف کر کے ان کی اور لوگوں کی نظر میں اپنے کو ذلیل و رسوا کرتا ہے ۔ جس سے ان کی دناعت اور ذلت ظاہر ہوتی ہے ۔

---

(۱) ۔صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد ترمذی و مالك' باب تحریم الظن ۔ (۲) ۔ صحیح مسلم باب انه یستحب لمن روی خالیا بامراهت یقول هذه فلانهت

بے جا تعریفوں سے ممدوح میں بھی دو برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں' ایک غرور اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی' تعریفیں سن کر وہ خوش ہوتا ہے اور پھر اپنے اس مفروضہ کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرور ہو کر دوسرے کو آنکھ نہیں لگاتا اور پے در پے تعریفیں سن کر اس کو یقین آ جاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے' اور توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے' بادشاہوں' امیروں' دولت مندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بدولت جو مضحکہ انگیز برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں' اور جس طرح وہ برخود غلط ہو جاتے ہیں اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے ۔

قرآن پاک میں یہودیوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا (۱) ۔ ہے اور ان کے انجام کی یہ خبر ان کو دی ہے ۔

لاتحسبن الذین یفرحون بما اتواویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلو افلا تحسبنهم بمفازه من العذاب ولهم

عذاب الیم (ال عمران: ۱۹)

جو اپنے کارنامہ پر اتراتے ہیں اور جو انہوں نے نہیں کیا اس پر تعریف کیئے جانے کو پسند کرتے ہیں تو ان کو نہ سمجھنا پھر نہ سمجھنا کہ وہ سزا سے بچ جائیں گے اور ان کے لیئے دردناک سزا ہے۔

ان آیتوں کا شان نزول گو خاص ہے' مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام (۲)۔ ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کیئے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کیئے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا اتنی بری بات ہے کہ بن توبہ اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے مگر یہ کہ مغفرت الٰہی دستگیری فرمائے' اور قرآن پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں ان کے کرنے پہ اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گنہگار ہوتے ہیں وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہیں۔ اس گناہ میں کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں جس کی تفصیل بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے' ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ امیز تعریف کرتے ہوئے سنا تو فرمایا تو نے اس کو برباد (۳)۔ کر دیا۔ ایک اور موقع پر ایک صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا تم نے اپنے ساتھی کی گردن ماردی اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو تو یوں کہو کہ میں یہ گمان کرتا ہوں بشرطیکہ اس کے علم میں وہ واقعی ایسا ہو' اور قطعیت کے ساتھ غیب پر حکم نہ لگایا جائے (۴)۔۔

مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی تو وہ اس کو سن کر مغرور ہو جائے گا اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لئے بھی حکم نہیں لگانا چاہئے کہ کسی کو دوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہیں معلوم۔

ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفیں جو لوگوں کے منہ کی جاتی ہیں ان کو سن کر ان کے نفس موٹے ہو جاتے ہیں اور ان کے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھوں کی روشنی

زائل ہو جاتی ہے' ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے منہ پر ان کی تعریفیں کی تو حضرت مقدادؓ صحابی نے اس کے منہ میں خاک جھونک دی اور فرمایا'

(۱)۔صحیح بخاری تفسیر آل عمران (۲)۔ فتح القدیر ثوبر کافی (۳)۔ صحیح بخاری باب کراھیھت التماوح۔ (٤)۔ صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد باب مذکور

رسول ﷺ نے فرمایا کہ ''مداحی کرنے والوں سے ملو تو ان کے منہ میں خاک جھونک دو'' (۱)۔ادب المفرد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ~ صل ۳~ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے' آپ ~ صل ۳~ نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہے تو اس نے اس کی بڑی تعریفیں شروع کیں' آپ ﷺ نے فرمایا ''اس کو سنا کرمت کہو کہ اس کو برباد ہی کر دو'' (۲)۔

بخل

بخل بھی اساسی بداخلاقیوں میں سے ہے' یعنی ایسی بداخلاقی جو بہت سی بداخلاقیوں کی جڑ ہے' خیانت بددیانتی بےمروتی' بعض دفعہ بےرحمی' بدسلوکی اور دناعت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے' حرص' لالچ' تنگ نظری' کم ہمتی' پست طبعی اور بہت سی برائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلہاڑی ماری اور بھوکوں کو کھلانا' ننگوں کو پہنانا محتاجوں کو دینا' یتیموں کی خبرگیری اور مقروضوں کی امداد مسلمانوں کو ضروری فرض قرار دیا' ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوہ اور اس کے مصارف ہیں' جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے' آنحضرت ﷺ نے جب حضرت خدیجہؓ کے سامنے جبرائیلؑ کی آمد کا حال سنایا تو حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی نبوت کا یقین جن دلیلوں کی بناپر دلایا وہ یہ ہیں۔

''یا رسول اللہ! آپ قرابت والوں کا حق اور مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں' غریبوں کو سرمایہ دیتے ہیں' مہمانوں کو کھلاتے ہیں اور حق کے مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں''۔ (صحیح بخاری' باب بدءالواحی)

غور کیجئے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتوں کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی ''بخیل'' نہیں ہوتا ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کے خصوصیات قرار نہ پاتے۔

بخالت ان بیماریوں میں سے جو درحقیقت اعمال کی جزا وسزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہوسکتا' سورہ مدثر آغاز نبوت کی سورتوں میں سے ہے اس میں دوزخیوں کے سوال وجواب کا ایک مکالمہ ہے' ان سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گئے' تو کہیں گے ہم نماز نہیں

پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے' مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم دین حق پر اعتراض کیا کرتے تھے اور یہ سب اس لیئے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزا وسزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

ماسلککم فی سقر قالو الم نک من المصلین - ولم نک نطعم المسکین و کنا نخوض مع الخائضین و کنا نکذب بیوم الدین (مدثر: ۲)

تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی' کہیں گے ہم نمازیوں سے نہ تھے اور مسکین کو کھلاتے نہ تھے اور بحث کرنے والوں کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے اور روز اجر کو جھٹلاتے تھے۔

---

(۱)۔صحیح مسلم و ابوداؤد باب کراھیت النماوح (۲)۔ باب یخشی فی وجوہ المداحین۔

اس سے ظاہر ہو گا کہ بخل کی برائی دوزخ تک پہنچا کر رہتی ہے اور وہ عمل کی جزا وسزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے کیونکہ جیسا کہ کہا گیا جو مذہبی جزا وسزا کا قائل' وہ اخلاص سے دوسروں کے ساتھ فیاضی بھی نہیں کر سکتا' یہی نکتہ سورہ ماعون میں جو مکہ کی پرانی سورتوں میں سے ہے دہرایا گیا ہے' فرمایا۔

اریت الذی یکذب بالدین فذالک الذی یدع الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین (ماعون)

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کے دن کو جھٹلاتا ہے پس یہی وہ ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور فقیر کو کھانے پر آمادہ نہیں کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کیئے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہیں کیونکہ یہ فیاضی اس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہیں ہو سکتی جو قبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے' بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اسی دنیا

میں پانے کا متوقع رہتا ہے اور جہاں کہیں اس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتی تو وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا' اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں یہ یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا خدا کے پاس ہے اور کبھی ضائع نہیں جاسکتی۔

ایک اور مکی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کیا ہے جس کی روزی زیادہ نہیں اور اس کو اپنے خدا سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے' خدا نے فرمایا ہے:

کلا بل لا تکرمون الیتیم ولا تحضون علی طعام المسکین و تاکلون التراث اکلا لما و تحبون المال حبا جما (فجر)

یہ خیال صحیح نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ تم بن باپ کے بچہ کو توقیر نہیں کرتے اور فقیر کے کھانے پر ایک دوسرے کو رغبت نہیں دلاتے اور مردہ کے متروکہ مال کو کھا جاتے ہو اور مال و دولت سے بڑی محبت رکھتے ہو۔

ان آیتوں میں باتیں کئی بیان کی گئی ہیں مگر یہ سب کی سب بخل کی مختلف صورتوں کی تشریح ہیں' سورہ ہمزہ میں اس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو دولت کی تھیلیوں کو گویا اپنی حیات جاوید کی اکسیر جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کے بدولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائے گا اور یہ چیز اس سے کبھی علیحدہ نہ ہوگی حالانکہ یہ کتنا خیال خام ہے فرمایا:

الذی جمع مالا وعدده یحسب ان ماله اخلده کلا لینبذن فی الحطمه (ہمزہ)

جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گنا کیا اس کو سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا' ہرگز یوں نہیں وہ بالضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے اور کار خیر میں خرچ نہ کرنے والے کو

اس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے جو کھال تک کھینچ لے گی۔

کلا انھا لظی نزاعۃ للشوی تدعوا من ادبر و تولی وجمع فاوعی (معارج ۱۸)

ہرگز نہیں وہ تپتی آگ ہے کھال کھینچ لینے والی' پکارے گی اس کو جس نے (حق سے) پیٹھ پھیری اور منہ موڑا اور اکٹھا کیا اور سینتا۔

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں' بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے' سونے اور چاندی کی اینٹیں خود بخود روٹی کپڑا اور مکان کی چار دیواری نہیں بن سکتیں' اس لیئے ان کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں' ان کو ضروری اور اعلیٰ مقصودوں کے حصول میں خرچ نہیں کرتا' وہ اپنے لیئے درہم و دینار نہیں جمع کرتا' اپنے سینہ اور پیشانی کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے۔ فرمایا:

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم و جنوبھم و ظھورھم ھذا ما کنترتم لا نفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون (توبہ: ۵)

اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سنا دے' جس دن اس کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا' پھر اس سے ان کی پیشانیاں' کروٹیں اور پیٹھیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لیئے گاڑ کر رکھا تھا تو جس کو گاڑ کر رکھا کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔

یہ بخیل کی اس حقیقت سے بھی نا آشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی

دولت ہے اس کو چلتا پھرتا رہنا چاہئے' اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف اور اس جماعت کے لیئے مضر ہے جس کے رکن وہ خود ہیں۔

ولا یحسبن الذین یبخلون بما اتھم اللہ من فضلہ ھو خیرا لھم بل ھو شر لھم سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیمہ (آل عمران: ۱۸۰)

اور جو لوگ اس مال کو جو خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو دیا ہے روکے رکھتے ہیں' وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے' جس مال کا وہ بخل کرتے ہیں اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں قیامت کے دن پہنایا جائے گا۔

یعنی جس دولت کو انہوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا ہے وہ قیامت کے عالم مثال میں واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا' حدیث میں ہے کہ یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں گلے میں پڑا ہوا نظر آئے گا(۱)۔۔

جو بخیل ہوتا ہے اس کو خلق خدا اور خدا کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی' اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے۔

واللہ لا یحب کل مختال فخور الذین یبخلون و یامرون الناس بالبخل (حدید:۷)

اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز سے محبت نہیں کرتا جو آپ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔

(۱)۔صحیح بخاری کتاب الزکوہ

اور جس سے خدا محبت نہ کرے اس سے کون محبت کر سکتا ہے اس لیئے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے اور عزیز و اقارب بھی محبت نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کو جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ ان کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اور اس

جماعت کو پہنچتا ہے، جس کا وہ بھی ایک فرد ہے۔

ھانتم ھولاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ فمنکم من یبخل و من یبخل فانما یبخل عن نفسہ و اللہ الغنی و انتم الفقراء (محمد: ۴)

ہاں! تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلایا جا رہا ہے تو تم میں کوئی بخل کرتا ہے اور جو کوئی بخل کرتا ہے سو اپنے ہی سے بخل کرتا ہے اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

یعنی اس کے بخل کے برے نتیجے اسی کو بھگتنے پڑیں گے۔

بخیل آدمی دنیا میں بھی طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے نہ اچھا پہننا، نہ قرینہ کا گھر، نہ عزت، نہ آبرو ہر شخص اس کو ذلیل و خوار جانتا ہے، ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے، فقراء اس کے لیئے بد دعا کرتے ہیں، یہاں تک کہ بیوی بچے جن کے لیئے وہ سب کچھ کرتا ہے وہ بھی اس سے خوش نہیں رہتے، ہر ایک اس کی دولت کا خواہاں رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ سانپ راستہ سے ہٹ جائے تو اس پر قبضہ کر لے، چور اس کے درپے، ڈاکو اس کے لاگو، زہر وہ پاتا ہے، حملے اس پر ہوتے ہیں، مگر ان تمام مصیبتوں کو وہ سہتا ہے اور اپنی زندگی بھر اس میں سے کچھ خرچ نہیں ہونے دیتا، لیکن ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر اس کے وارثوں نے اللے تللے اس کو اڑا دیا، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لیئے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے وہ اس مال مفت کو دم کی دم میں اڑا دیتی ہے اور ہزاروں بری عادتوں میں مبتلا اور آخر میں مفلسی و قلاش ہو جاتی ہے۔

خدا اپنے رسول ﷺ کی زبانی فرماتا ہے۔

واما من بخل و استغنی و کذب بالحسنی فسنیسرہ للعسری و ما یغنی عنہ مالہ اذا تردی (الیل)

اور لیکن جس نے دینے سے بخل کیا اور (خدا کی یا نیکی کی باتوں کی) پرواہ نہ کی' اور اچھی بات کو جھٹلایا' تو ہم اس کو سخت کام کے لیئے آسان بنائیں گے اور جب وہ کرے گا تو اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا۔

وہ سخت کام جس کو خدا اس کے لیئے بطور سزا کے آسان کر دیتا ہے وہ بری عادت و خصلت اور برے کردار ہیں جن میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے اور ان کو صرف اس لیئے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے بڑی آسانی سے کر گزرتا ہے' بھوکا وہ رہتا ہے' ننگا وہ رہتا ہے' میلا وہ رہتا ہے' مصیبتیں وہ جھیلتا ہے' راتوں کو آرام سے سو نہیں سکتا' دنیا کی چیز سے دل بھر کر لطف نہیں اٹھا سکتا' عزیز و اقارب' دوست و احباب سے اس کو مسرت نہیں ہوتی' وہ سب سے نالاں اور اس سے سب نالاں رہتے ہیں' پھر جب وہ کسی افتاد یا موت یا دوزخ کے گڈھے میں گرتا ہے یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی اس وقت افسوس آئے گا تو اللہ تعالی پہلے ہوشیار کر دیتا ہے۔

وانفقوا من ما رزقناکم من قبل ان یاتی احدکم الموت فیقول رب لو لا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق و اکن من الصالحین (منافقون: ۲)

اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے اس میں سے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے (خدا کی راہ میں) خرچ کرو' (ایسا نہ ہو کہ موت آنے لگے) تو کہے کہ میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی دیر اور کہیں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات کرتا اور نیک کاروں میں سے ہو جاتا۔

اللہ تعالی جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا یہ وقت ٹالے ٹل نہیں سکتا اس کا سامان پہلے سے چاہیئے تھا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غریب ہوتے ہیں تو بڑی بڑی دعائیں کرتے

ہیں، خوب خوب وعدہ کرتے ہیں کہ اگر خدا نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے دولت دی تو ہم یہ کریں گے، مگر اللہ تعالیٰ ان کو دولت دے دیتا ہے، تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہیں اور نیکی کے ہر راستہ سے منہ موڑ لیتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے۔

و منهم من عهد الله لئن اتينا من فضله لنصدقن و لنكونن من الصالحين فلما اتهم من فضله بخلوا به و تولوا و هم معرضون (توبہ: ۱۰)

اور ان میں کوئی ایسا ہے جس نے خدا سے عہد کیا کہ اگر خدا نے ہم کو اپنے فضل سے دیا تو ہم مزدور خیرات کریں گے اور نیکوکاروں میں سے ہوں گے پھر جب خدا نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخالت کرنے لگے اور ٹل کر پھر گئے۔

خدا فرماتا ہے کہ بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں نفاق نے گھر کرلیا۔

فاعقبهم نفاقا فی قلوبهم (توبہ: ۱۰)

تو اللہ نے ان کے دلوں میں اس کا نتیجہ نفاق رکھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے شاید اسی لیئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دو خصلتیں سچے مومنوں میں جمع نہیں ہوتیں بخل اور بدخلقی (۱)۔ رسول ﷺ جن برائیوں سے بچنے کی خدا سے دعا مانگا کرتے تھے ان میں سے ایک بخل بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ ''خدا میں بخل کسل مندی، کبرسنی قبر کے عذاب اور زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں''۔(۲)۔

اسلام میں زکوٰۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات و مبرات کی ترغیبات شریعت محمدی ﷺ میں اسی لیئے ہیں کہ انسانوں کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک رہیں۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال و دولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام

الذین ھم یرائون و یمنعون الماعون (ماعون: ۱)

پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی نماز سے بے پرواہ رہتے ہیں، وہ جو دکھاوا کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو مانگے نہیں دیتے۔

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہیں ادا کرتے اور صرف دکھاوے کے لیئے پڑھتے ہیں یہ حقوق الٰہی سے تغافل ہے اور دوسری آپس میں مانگے کی معمولی چیزوں میں جیسے نمک، آگ، پانی اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزوں میں بخل سے کام لینا ہے، یہ بندوں کے حقوق سے غفلت ہے، اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصہ کے عدم تعمیل کا سبب بنتا ہے اور اس لیئے اس کی برائی جتنی بھی کی جائے کم ہے۔

حرص وطمع

حرص وطمع یا لالچ وہ برائی ہے جس میں نفس کی دناعت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے' خصوصاً وہ حرص وطمع جس میں بخالت کی بھی آمیزش ہو' عربی میں ان کو شح کہتے ہیں جس کی برائی قرآن میں کئی موقوں پر آئی ہے' خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے' گھر کا مالک زیادہ دینا نہیں چاہتا' اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں' شوہروں کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے اس لیئے وہ زیادہ خرچ نہیں دیتے اور بیویاں لالچ سے زیادہ کا مطالعہ کرتی ہیں یا ایک شخص کے کئی بیویاں ہوں تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میرا حق زیادہ رہے اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے اس سے خانگی معاملوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف میں رہتا ہے' اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان وایثار کا سلوک ہو اور ہر ایک دوسرے کے آرام کو اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے تو پھر وہی گھر جو پہلے غمکدہ تھا عشرت کدہ بن جائے گا' میاں بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ میں قرآن کی تعلیم ہے:

واحضرت الانفس الشح و ان تحسنوا و تتقوا فان الله کان بما تعملون خبیرا (نساء: ۹)

اور طبیعتوں (نفوس) میں حرص دھری ہے' اور اگر تم احسان کرو اور تقوی اختیار کرو تو اللہ کو تمہارے کاموں کی ساری خبر ہے۔

یعنی میاں بیوی دونوں حرص اور لالچ چھوڑ دیں اور احسان اور تقوی کی راہ اختیار کریں اور اللہ تعالی جو ہر ایک کے کاموں سے واقف ہے سب کو ان کے کاموں کے مطابق جزا دے گا۔

اس کاروباری دنیا میں ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے جب تک انسان اپنی حرص وطمع کو روک کر اچھے کاموں میں روپیہ خرچ نہیں کرے گا وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا' خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی فرمایا:

مطلب یہ ہے کہ خدا نے کسی چیز میں کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوس اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیوں مل گئی کاش خود اسے ملتی بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض و کرم میں سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لیئے ہاتھ پھیلانا چاہیئے' اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہو گا تو وہ عنایت کرے گا۔ اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت میں قناعت پیدا ہو گی' ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا' اس لیئے فرمایا:

ولقد اتینٰک سبعا من المثانی و القران العظیم لا تمدن عینیک الی ما متعنا به ازواجا منهم (حجر: ٦)

اور بے شک ہم نے تجھ کو دیں سات آیتیں' اور قرآن جس کا درجہ بڑا ہے تو اپنی آنکھیں ان چیزوں پر مت پسار جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ اٹھانے کو دی ہیں۔

یعنی جس کو قرآن جیسی دولت ملی اس کی نظر میں دنیاوی دولت کیا چیز ہے۔

یہی حرص و طمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسرے کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے' آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ حرص و طمع سے بچو کہ اس نے تم سے پہلوں کو برباد کیا' اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انہوں نے خون بہایا اور حلال کو حرام سمجھا (۱)۔' یہ صحیح مسلم کی روایت ہے' صحیح ابن حبان اور حاکم میں اس سے زیادہ مفصل ہے فرمایا ''حرص سے بچو کیونکہ اسی نے اگلوں کو اس کی دعوت دی کہ انہوں نے (بے گناہوں کا) خون بہایا' اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا (۲)۔''۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا ''حرص سے بچو کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں' اسی نے ان کو کہا تو انہوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا' اسی نے کہا تو انہوں نے بخل کیا' اسی نے ان کو فسق و فجور کیلئے کہا تو انہوں نے فسق و فجور کیا (۳)۔''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا انسان میں سب سے بری بات کڑھانے والی حرص اور گھبرا دینے والی نامردی ہے (۴)۔''۔ حریص آدمی ہمیشہ غم

میں کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا' فلاں کے پاس یہ ہے' میرے پاس نہیں' اس لیئے آنحضرت ﷺ نے حرص کو ہمیشہ غم کو کڑھن میں رکھنے والی فرمایا' نسائی میں ہے کہ آپ ~ صل۳~ نے فرمایا کہ ''ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے (۵)۔۔سبب ظاہر ہے کہ ایمان کامل کا نتیجہ صبر' توکل اور قناعت ہے' اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی بے صبری اور ہوس ہے' ایک دفعہ برائی کے لہجہ میں فرمایا کہ ''انسان بوڑھا ہوتا ہے مگر اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں جینے کی خواہش اور مال کی حرص (۶)۔۔کئی صحابیوں کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دو بھیڑیے جو بکریوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیئے جائیں وہ ان کو اتنا برباد نہیں کرتے جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برباد کر دیتی ہے (۷)۔۔

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے اور وہی اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے' کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتیں محفوظ اور مامون ہیں اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے' اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے' وہ فطرت کے نظام عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے' اسلام نے اس نظام عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصر سی آیت میں بیان کر دیتا ہے۔

یاایھا الذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل (نساء: ۵)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے مت کھاؤ۔

اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمانداری کے خلاف ہیں اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے چار لفظوں میں خاتمہ کر دیا ہے یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے یا زور و ظلم سے لے یا غصب کرے یا چوری کرے یا اس میں خیانت کرے' رشوت لے سود کھائے' غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے' اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے۔

---

(۱)۔صحیح مسلم باب تحریم الظلم (۲)۔ صحیح ابن حبان و مستدرک حاکم (۳)۔ صحیح ابن حبان و ابوداؤد کتاب الجهاد باب الجراه والجبن (٤)۔ ابوداؤد و حاکم (٥)۔ نسائی (٦)۔ ترمذی (٧)۔ ترمذی و صحیح ابن حبان و طبرانی و ابویعلی و بزار منذری ۲ ص ۲۳۸

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''جس نے ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھایا اور جس نے ہم (مسلمانوں) کو دھوکا دیا' وہ ہم (مسلمانوں) میں سے نہیں (۱)۔''۔ جان اور مال

معاملات میں دو اہم چیزیں ہیں آنحضرت ﷺ کے اس مختصر سے فقرہ نے دونوں کی حفاظت کی اہمیت بتا دی' ایک دفعہ آنحضرت ﷺ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک غلہ کا ڈھیر پڑا دیکھا' آپ ﷺ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سوکھا ہے۔ آپ ﷺ نے غلہ والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے فرمایا اس کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیں' جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہیں (۲)۔ رسول سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔

ارشاد ہوا ''وہ جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لیئے جھوٹی قسم کھائے گا وہ خدا سے ملے گا تو خدا اس پر غضبناک (۳)۔ ہو گا'' ایک دفعہ ایک معاملہ میں ایک شخص نے اسی طرح کی قسم کھانا چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر اس نے قسم کھالی تا کہ وہ ظلم سے مال نہیں لے لے تو خدا سے جب وہ ملے گا تو خدا اس سے منہ پھیر لے گا (۴)۔۔ کسی کے مال و جائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو ''غضب'' کہتے ہیں' غضب کر لینا ظالمانہ فعل ہے' حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے قصہ میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے جو غریب مچھیروں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا' خضرؑ نے فرمایا:

اما السفینۃ فکانت لمسکین یعملون فی البحر فاردت ان اعیبھا و کان وراء ھم ملک یاخذ کل سفینۃ غصبا (کھف: ۷۹)

وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبوں کی تھی' جو دریا میں محنت کرتے تھے تو میں نے چاہا کہ اس میں کچھ عیب کر دوں اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو چھین کر لیتا تھا۔

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی برائی تھی کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا' اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

حضرت سعیدؓ بن زید صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی دبائے گا طوقہ اللہ فی سبع ارضین تو اس کو زمین کی

ساتوں طبقوں میں سے ہر ایک سے اتنے حصہ کو اٹھانے کو کہا جائے گا''۔ یا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اسکے گلے میں زمین کے یہ ساتوں طبق ہار کی طرح ڈالے جائیں گے (۵)۔۔

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے' کتنے لوگ ہیں جو وکیلوں کی قوت بیان اور حکام کے ناجائز فیصلوں کے زور سے غیروں کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں' حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہیں' آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'فریقین میں سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں' اگر میں نے اس کو کوئی چیز دلائی جو اس کی نہیں تو وہ خود نہ لے' کیونکہ میں نے اس کو آگ کا ٹکڑا دیا ہے (۶)۔۔

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہیں' اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جا کر فریق کے دعوے کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کرا دیتے ہیں۔

---

(۱)۔صحیح مسلم کتاب الایمان باب من حمل علینا السلاح فلیس منا۔ (۲)۔ صحیح مسلم کتاب الایمان باب من غشنا فلیس منا (۳)۔ مسلم کتاب الایمان باب من قطع حق مسلم (٤)۔ صحیح کتاب الایمان باب من قطع حق مسلم (٥)۔ صحیح مسلم باب تحریم الظلم و غصب الارض' یہ عبارت کئی طرح سے ہے۔ (٦)۔ شرح نووی بر مسلم حدیث مذکور (۷)۔ ابوداؤد کتاب الاقضیہ

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل و تدلوا بها الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم و انتم تعلمون (بقرہ: ۱۸۸)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ پہنچاؤ حاکموں تک اس کا معاملہ' تاکہ کھا جاؤ۔

لوگون کا کچھ مال گناہ سے اور تم جان رہے ہو۔

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعویٰ اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے اسی طرح کمزوروں کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس میں پا کر ان کا مال خلاف انصاف نہیں کھانا چاہیئے جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے۔

ان الذین یاکلون اموال الیتامی ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارا و سیصلون سعیرا(نساء: ۱)

بے شک جو یتیموں کا مال ظلم سے کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں اور اب وہ آگ میں بیٹھیں گے۔

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے اسی لیئے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے یعنی ہاتھ کاٹ ڈالنا۔

والسارق والسارقہت فاقطوا ایدیھما جزاء بما کسبا نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم (مائدہ:۶)

اور جوکوئی چور ہومرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو سزا ان کی کمائی کی تنبیہ اللہ کی طرف سے اور اللہ ہے زور آور حکمت والا۔

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے' بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے' دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ سے اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔

بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا مرتکب فعل کے خبث باطن کو ظاہر کرتا ہے پھر اس کی بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں اور چور چونکہ بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے' اس لیئے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے' اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفائے جرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے۔

اہل عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری پھیلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لیئے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی' سورۂ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے جن کا عہد مسلمان ہونے والی بیبیوں سے لیا

کم از کم یہ کہ فعل کے ارتکاب کے وقت اس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہیں دیکھتے تو خدا بھی ہم کو نہیں دیکھتا اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا۔(۱)۔

حجتہ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ''تم میں سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہے، مگر حق کے ساتھ۔''(۱)۔جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو، یا اسی کا کوئی کام کر کے معاوضہ میں حاصل کرو، یہی بات قرآن پاک کی اس آیت میں فرمائی گئی۔

یاایھا الذین امنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم۔(نساء:۵)

اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ، لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس کی خوشی سے۔

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے، جس میں ہر اس مال کو حرام بتایا گیا ہے، جو کسی سے ناجائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔

---

(۱)۔صحیح بخاری کتاب النفقات۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الحدود۔ (۳)۔ ایضًا (٤)۔ ایضًا

عرب میں قبیلہ مخزوم کی ایک عورت تھی جو لوگوں سے چیزیں رعایت لے کر مکر جاتی تھی، یہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی، اچھے اچھے لوگوں نے اس کی سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا تم سے پہلے قومیں اس لیئے تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو ان کو سزا دیتیں، اور جب کوئی معزز آدمی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتیں، خدا کی قسم اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی فاطمہ بھی یہ کام کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹتا۔(۱)۔

ایک صحابیؓ ایک چادر سر ہانے رکھ کر سو رہے تھے' ایک چور آیا اور اس نے چالاکی سے ان کے سر ہانے سے اس کو کھینچ لیا' وہ پکڑا گیا تو صحابی موصوف نے آ کر سفارش کی کہ یا رسول اللہ! یہ چادر صرف تیس درہم کی تھی' کیا تیس درہم کے لیئے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا' میں نے یہ چادر اس کے ہاتھ بیچ دی' اور قیمت اس کے ذمہ رہی' آپ ﷺ نے فرمایا مجھ تک معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں کر لیا۔ (۲)۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز میں مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت میں آپؐ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا' نماز سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکڑی سے حاجیوں کا سامان چرا لیتا تھا' اور اگر مالک ہوشیار ہو جاتا تو کہہ دیتا تھا کہ اتفاق سے اس میں پھنس کر چلا آیا اور اگر بے خبر رہتا تو لے جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اس کو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹتا پھرتا تھا۔

ناپ تول میں کمی بیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہے جس کو سرقہ کہتے ہیں' اور جس کی پاداش میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے اور جس کی برائی ہر مذہب اور اخلاقی مسلک نے یکساں کی ہے لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہے کہ اس نے ان نازک سے نازک ناجائز معاملوں کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہیں سمجھا جاتا تشریح کی اور ان کی برائیوں کی تشہیر کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عملی تعلیموں سے ان کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی بیشی ہے جس سے ہر شخص کو ہر وقت کام پڑتا ہے اور جس میں خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہیں اور جس سے سب سے زیادہ غریبوں کو نقصان پہنچتا ہے اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین میں سے ایک بڑا قانون عدل ہے جس کا منشا یہ ہے کہ جو چیز ہو وہ اس کو دیدی جائے یہی وہ میزان یعنی ترازو ہے جسے خدا نے دنیا میں قائم کیا ہے' اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہئے جو شخص دوسرے کا جو حق ہے اس کو نہیں دیتا یا دینے میں کمی کرتا ہے وہ اس ترازو سے کام نہیں لیتا ہے فرمایا۔

(۱)۔ابوداؤد کتاب الحدود۔(۲)۔ابوداؤد کتاب الحدود۔

والسماء رفعها و وضع الميزان الا تطغوا فی الميزان۔ واقيموا الوزن بالقسط ولا تخسروا الميزان۔ (رحمان: ۱)

اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ مت زیادتی کرو ترازو میں' اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو اور مت گھٹاؤ تول۔

اس ترازو سے انسان کا ہر قول و فعل تلتا ہے اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

نظر سے دیکھئے تو یوں کہیے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں ساکھ جاتی رہتی ہے اور یہ بالآخر ان کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے' یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھالیں گے مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے'

حضرت شعیبؑ کی یہی نصیحت پھر سورہ اعراف میں دہرائی گئی ہے۔

فاوفوا الکیل والمیزان ولا تبخسوا الناس اشیاء ھم ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا ذالکم خیر لکم ان کنتم مئومنین۔(اعراف: ۱۱)

تو ناپ اور تول پورا کرو' اور مت گھٹا دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو' یہ تمہارے لیئے بھلا ہے اگر تم کو یقین ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ حضرت شعیبؑ کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی' اسلام میں جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کے بعد ہے۔

واوفوا الکیل والمیزان (انعام: ۱۹)

اور ناپ اور تول کو پورا کرو۔

سورۂ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے۔

واوفوا الکیل اذا کلتم وزنوا بالقسطاس المستقیم ذالک خیر و احسن تاویلا (اسرائیل: ۴)

اور جب تم ناپو تو ناپ پورا بھر دو' اور سیدھی ترازو سے تولو' یہ بہتر ہے' اور اس کا انجام اچھا ہے۔

آیت کا آخیر ٹکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول گو شروع میں کتنا ہی فائدہ پہنچائے مگر آخر کار وہ بیوپاری کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے۔

خوب غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس بد اخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ

ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین گم ہو جاتا ہے کہ ان کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھیں ہر طرف کھلی ہیں۔ اور ایک دن آئے گا جب ان کو خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا۔ سورۂ مطففین میں جہاں اس بد اخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے اس بیماری کا یہ علاج بھی بتایا گیا، فرمایا:

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون۔ الا یظن اولئک انھم مبعوثون لیوم عظیم۔ یوم یقوم الناس لرب العلمین (مطففین: ۱)

خرابی ہے اس گھٹا کر دینے والوں کی جو اوروں سے جب ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر دیں تو گھٹا دیں، کیا ان کو اٹھایا جائے گا جس دن سب لوگ دنیا کے مالک کے لیئے کھڑے ہوں گے۔

چھپا کر لینا

جو سامان و اسباب کئی آدمیوں میں ابھی تک مشترک ہو اور وہ بانٹ کر علیحدہ علیحدہ نہ کیا گیا ہو اس میں سے کوئی چیز دوسرے ساجھیوں سے چھپا کر لے لینا غلول کہلاتا ہے، مگر زیادہ تر مال غنیمت میں جو بد دیانتی اور چوری کی جائے اس کو کہتے ہیں غنیمت کا مال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیوں کا حصہ ہے جب تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک حصہ الگ الگ نہ کر دے، یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دیدے اس میں سے کچھ چھپا کر لے لینا غلول ہے اور یہ ایسی برائی ہے جس میں بد دیانتی اور چوری دونوں ملی ہوئی ہیں۔

اس فعل کے مرتکب کو یہ خیال ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز میں ہر ایک کا حصہ ہے تو اس میں سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہئے لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہیں ہوا ہے، اس میں ایک کا برابر حصہ ہے، اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لئے حلال نہیں ہو سکتا، دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی اس میں سے کوئی چیز چھپا کر لیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی تنہا ملکیت نہیں، اسی لیئے وہ دوسروں سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے، تیسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو چھپا کر لے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوہرا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا باقاعدہ بانٹ سے پائے یہ صریح بے ایمانی ہے۔

قرآن پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیر عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گنہگار ٹھہرے گا، اور چونکہ انبیاء علیہم السلام بھی امیر ہوتے ہیں اور وہ گناہوں سے مبرا ہوتے ہیں، اس لیئے ان کی نسبت تو کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اس کا ارتکاب کریں گے۔

وما کان لنبی ان یغل (آل عمران:۱۷)

اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ غنیمت میں سے چھپا کر لے لے۔

پھر فرمایا:

ومن یغلل یات بما غل یوم القیمۃ ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون (آل عمران:۱۶۱)

اور جو کوئی غنیمت کا مال چھپا کر لے گا تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لے کر آئے گا' پھر ہر کوئی اپنا کمایا پورا پورا پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

غزوۂ خیبر کے مال غنیمت میں سے مدعم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا' خیبر سے چل کر جب لوگ وادی القریٰ پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اس غلام کو آ کر ایسا لگا کہ اس کا کام ہی تمام ہو گیا' مسلمانوں نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو' یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا' قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جس شملہ کو اس نے خیبر میں تقسیم سے پہلے لے لیا تھا وہ اس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہے لوگوں نے یہ سنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا' اس کو بھی لا کر سامنے ڈال دیا' یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ آگ کا تسمہ ہے آگ کا۔(۱)۔

خیبر میں ایک اور واقعہ یہ گزرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی جب اس کا جنازہ تیار ہوا تو آپ ﷺ سے عرض کیا گیا' آپ نے فرمایا' تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو' یہ سن کر لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا اور سمجھے کہ کوئی بات ہے' یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا' تمہارے بھائی نے مال غنیمت کی ایک چیز چھپا کر لی ہے' صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو جھوٹے موتیوں کا ایک ہار نکلا جو چند آنوں سے زیادہ نہ تھا۔(۲)۔

قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلالؓ تین بار منادی کرتے سب لوگ اپنا اپنا مال غنیمت لے کر آتے پھر اس میں سے پانچواں حصہ نکالا جاتا اور اس کے

بعد بانٹ دیا جاتا اس کے بعد جو لے کر آتا وہ قبول نہ ہوتا اور وہ مجرم قرار پاتا' بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا' ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالوں کی ایک لگام لے کر آیا' اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ ہم نے لوٹا تھا' فرمایا کہ تم نے بلالؓ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی' اس نے کہا سنی تھی پوچھا پھر اس وقت کیوں لے کر نہیں آئے' اس نے معذرت کی فرمایا تم اس کو قیامت میں لے کر آنا' میں نہیں قبول کرتا۔(۳)۔

غمال کو ہدایت کی گئی کہ ان کو جو ملے اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں لا کر پیش کریں' فرمایا اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو وہ ایک سوئی بھی چھپا کر لے جائے گا تو وہ غلول ہے' وہ اس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا۔(۴)۔

---

(۱)۔و (۲)۔ ابوداؤد کتاب الجهاد' باب فی تعظیم الغلول۔ (۳)۔ ابوداؤد کتاب الجهاد (باب فی تعظیم الغلول۔ (٤)۔ سنن ابی داؤد کتاب الاقضیه۔

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت ہے' رشوت کے معنی ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالب کے پورا کرنے کے لیئے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے موافق کرلے۔(۱)۔

پہلے عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدموں کے فیصلے کرتے تھے' اہل عرض ان کو اس کے لئے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے' اس کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے' اسلام آیا تو اوہام کا یہ دفتر ہی اڑ گیا اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کاہن کے حلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی۔(۲)۔

عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے اور چونکہ دولت اور تمول نے ان میں اونچے نیچے طبقے قائم کردیئے تھے' اس لیئے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہشمند رہتے تھے قانون کی زد سے بچنے کے لیئے علانیہ رشوت دیتے تھے' اور ان کے کاہن اور قاضی علانیہ لیتے تھے' اور ایک کا حق دوسرے کو دلا دیتے تھے اور اس ذریعہ سے توراہ کے احکام پر مصالح وضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈال دیتے تھے' (۳)۔ چنانچہ توراہ کے قوانین میں تحریف کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خواری تھی قرآن مجید کی اس آیت میں ان کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہے۔

ان الذین یکتمون ما انزل اللہ من الکتاب و یشترون بہ ثمنا قلیلا' اولئک ما یاکلون فی بطونھم الا النار ولا یکلمھم اللہ یوم القیمۃ ولا یزکیھم ولھم عذاب الیم۔ (بقرہ: ۲۱)

خدا نے کتاب سے جو اتارا اس کو جو چھپاتے ہیں اور اس کے ذریعہ معمولی معاوضہ حاصل کرتے ہیں' وہ اپنے پیٹوں میں

آگ بھرتے ہیں' خدا ان سے قیامت کے دن بات نہ کرے
گا' نہ ان کو پاک صاف کرے گا' اور ان کے لیئے دردناک
عذاب ہے۔

''پیٹ میں آگ بھرنا'' اس لیئے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آ کر خدا کے احکام میں ردوبدل اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے اس لیئے یہی سزا ان کو ملے گی۔ ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علماء کو اس لیئے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو اوصاف توراہ میں ہیں وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں' لیکن قرآن پاک کے نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکام الٰہی میں عام طور سے ردوبدل کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے دنیا کی دولت کماتے تھے' چنانچہ سورہ مائدہ میں ان کی اس حرام خوری کا ذکر دو دفعہ ہے فرمایا۔

---

(۱)۔مجمع البحار علامہ فتنی۔ (۲)۔ ترمذی باب ماجاء فی کراھتیہ مھر البغی۔ (۳)۔ صحیح بخاری رجم زانی۔

وترى كثيرا منهم يسارعون في الاثم العدوان و اكلهم السحت لبئس ما كانوا يعملون۔ لولا ينهاهم الربانيون والاحبار عن قولهم الاثم واكلهم السحت لبئس ما كانوا يصنعون۔ (مائدہ: ۹)

اور تو نے ان میں سے بہتوں کو دیکھا کہ وہ گناہ اور زیادتی اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں' کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں' ان کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔

سموعون للكذب اكلون للسحت۔ (مائدہ:۶)

جھوٹ کے بڑے سننے والے اور حرام کے بڑے کھانے والے

قرآن پاک کی ایک آیت جو پہلے گزر چکی ہے یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے۔

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل و تدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم و انتم تعلمون۔ (بقرہ:۱۸۸)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ' اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ تا کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسروں نے اختیار کیا ہے' رشوت کی ممانعت میں صاف وصریح ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے(۱)۔ رشوت دینے والے پر' یوں کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے' اور جرم کی اعانت قانون اور اخلاق دونوں میں منع ہے۔

خیبر کے یہودیوں سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبداللہ بن رواحہ صحابی کو بھیجتے وہ ایمانداری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے ور کہہ دیتے کہ ان دو میں جو چاہو لے لو' یہودیوں نے اپنے دستور کے مطابق ان کو بھی رشوت دینی چاہی' آپس میں چندہ کر کے اپنی عورتوں کے کچھ زیور اکٹھے کیے اور کہا کہ یہ قبول کرو' اور اس کے بدلہ تقسیم میں ہمارا حصہ بڑھا دو۔ یہ سن کر حضرت ابن رواحہؓ نے فرمایا'' اے یہودیو! خدا کی قسم تم خدا کی ساری مخلوق میں مبغوض ہو' لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا' اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ حرام ہے' ہم (مسلمان) اس کو نہیں کھاتے'' یہودیوں نے ان کی یہ تقریر سن کر کہا کہ'' یہی وہ انصاف) ہے جس سے آسمان وزمین قائم ہیں۔(۴)۔

کیے جائیں گے' اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا اور اس کا حساب ہوگا تو اگر تم نے نیکی کی ہوگی' اور مقروضوں کو معاف کیا ہوگا تو خدا کے یہاں پورا پورا مل جائے گا۔

جاہلیت میں ربا کی یہ صورت تھی کی غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کر دینے کے وعدے پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے' جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کر سکتے تو مہاجن کہتے کہ ہم مدت بڑھا دیتے ہیں تم جنس کی مقدار بڑھا دو' مثلاً ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کر دیتے' اور اسی طرح جب تک وہ قرض نہ ادا کر دیتے یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی' یہاں تک کہ اصل سے کئی گنا سود ہو جاتا' خدا نے فرمایا:

یـایھـا الـذیـن امـنـوا لا تـاکـلـوا الـربـوا اضعـافـا مـضـاعفـہت و اتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ و اتقوا النار التی اعدت للکفرین۔ (آل عمران: ۱۳۰)

اے ایمان والو! (اصل سے) دوگنا چوگنا سود مت کھاؤ اور خدا سے تقوی کرو' شاید کہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے بچو جو منکروں کے لیئے تیار کی گئی ہے۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ سود خواری کی سزا جہنم ہے' وہ جہنم جو کافروں کے لیئے تیا کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ایک رویائے صادقہ میں سود خواروں کو جس حال میں دیکھا اس کی تصویر یہ ہے فرمایا میں نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ میں پتھر لیے کنارہ پر کھڑا ہے پہلا آدمی تھک کو جب کنارہ پر آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہے کہ اس کا منہ کھل جاتا ہے اور وہ پتھر لقمہ بن کر اس کے پیٹ میں چلا جاتا ہے' وہ پتھر کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے' جبرائیل نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر میں تیر رہا ہے' سود خوار ہے۔(۱)۔

سزا کی مواثلت ظاہر ہے' لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہیں' سود خوار آسانی سے اس پر قبضہ کر لیتا ہے تو وہ انسان کے خون میں تیرتا ہے اور جو پتھر لقمہ بن کر اس کے منہ میں چلا جاتا ہے تو وہ دولت ہے جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے۔

گناہ کے شریک وہ بھی ہیں جو کسی گناہ کی اعانت میں شریک ہوں اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود کھانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی۔(۲)۔

ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منہ سکرا ورزقا حسنا ان فی ذلک لایہ لقوم یعقلون۔ (نحل:۹)

اور کھجور اور انگور کے میوے دیے تم ان سے نشہ بناتے ہو اور اچھی روزی' اس میں ان لوگوں کے لیئے خدا کی نشانی ہے جو سمجھتے ہیں۔

اس آیت میں نشہ کو ''رزق حسن'' کے مقابلہ میں رکھا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ نشہ رزق حسن نہیں آیتوں میں میرے نزدیک درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں (۳)۔ اوپر دودھ اور گوبر اور خون اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلائشوں کے اندر سے کیسا پاک وصاف نکلتا ہے' یہی حال کھجور اور انگور کا ہے کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک' اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوئی ہیں۔

مدینہ میں آ کر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا' حکم ہوا:

لاتقربوا الصلوہ وانتم سکاری حتی تعلموا ماتقولون۔ (نساء:۷)

تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو۔

اس آیت نے ہوشیاروں کو چونکا دیا' کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑ دی اور دوسروں نے اپنے پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا' اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ کنایہ تصریح کی صورت اختیار کرے' لوگوں کے دلوں میں آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوئے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا۔

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما۔ (بقرہ:۲۷)

(اے پیغمبر)! تجھ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کیلئے کچھ فائدہ کی چیزیں بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑا ہے۔

فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہوتا ہے' صحبت اور تفریح طبع کا لطف آتا ہے لوگ کھاتے پیتے ہیں' دوسروں کو بھی ان کے بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے' لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں' اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہوشیار کر دیا اور وہ شراب سے تائب ہو گئے' لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہ آیا تھا اس لئے اس کے فائدہ کے پہلو کی رخصت سمجھ کر کچھ لوگ پیتے بھی تھے' آخر یہ آیت اتری۔

(۱) سبعہ معلقہ میں طرفہ کا قصیدہ اور صحیح بخاری میں حضرت حمزہؓ کا قصہ۔ (۲) تفسیر کبیر امام رازی۔ (۳) مفسرین کی مختلف راہیں ہیں۔

یایھاالذین امنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون۔ انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوبت والبغضاء فی الخمر والمیسر و یصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوبت فھل انتم منتھون۔ (مائدہ: ۱۲)

اے ایمان والو! شراب اور جوا اور چڑھاوے کے بت اور پانسے گندے کام ہیں' شیطان کے سوا ان سے بچتے رہو' شاید تمہارا بھلا ہو' شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں شراب اور جوئے سے دشمنی اور بیر ڈال دے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے پھر اب تم باز آتے ہو۔

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہ نے چلا کر کہا' خداوندا! ہم باز آ گئے' (۱)۔ اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر طرف گلیوں میں خم الٹے جا رہے تھے اور شراب زمین پر بہائی جا رہی تھی۔ (۱)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیے اول یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور تیسرا

یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت سے ضروری کاموں سے غافل کر دیتی ہے ان تینوں اسباب کی سچائی روز روشن کی طرح آج بھی اشکارا ہے۔

اوپر کی آیت میں شراب اور جوئے کو جو شیطان کا کام بتایا گیا ہے' اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے' یعنی شراب اور جوئے کو چڑھاوے کے بتوں اور بانٹ کے پانسوں کے ساتھ ملا کر شیطان کے ناپاک اور برے کاموں میں سے شمار کیا ہے' اس لیئے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شک ہی نہیں اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی برائی کا اظہار بھی ہے' جیسا کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ جب ان کے گھونسہ سے اتفاقاً ایک قبطی مر گیا تو فرمایا:

هذا من عمل الشيطن (قصص:۲)

یہ ہوا شیطان کے کام سے۔

یعنی بہت ہی برا کام ہوا' اسی طرح اس آیت:

ان المبذرين كانوا اخوان الشياطين (بنی اسرائیل:۳)

بے شبہ فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

کی روشنی میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب جوئے' بتوں کے چڑھاوے' اور جیتے ہوئے جانوروں کو بے کار ذبح کر کے پانسوں سے ان کی بانٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا' مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے کون نہیں جانتا' شراب خوری' قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان اور قوم کو تباہ کر دیا ہے جن کی مثالیں زمانہ کے صفحوں پر لکھی آج بھی ملتی ہیں۔

اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو برائیاں قرآن نے بتائی ہیں' ایک معاشرتی' اور دوسری مذہبی' معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے

اور وہ کام کر گزرتے ہیں جن کو وہ ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے' کتنے قتل' کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کے بدولت روزانہ پیش آتے ہیں' مذہبی برائی

یہ

(۱)۔ابوداؤد' اشربہ۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔

ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ خدا کی یاد' اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے غافل ہو جاتا ہے' بلکہ خود اپنے مفید و دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے۔

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب قرآن نے اس کے لیئے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے' خمر کہتے ہیں چھا جانے کو' اس لیئے ہر وہ شئے جس کا کھانا پینا عقل اور ہوش کو چھالے وہ خمر میں داخل ہے' حضرت عمرؓ نے منبر نبوی ﷺ پر کھڑے ہو کر فرمایا ''ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے (۲) حرام ہے۔'' فرمایا جس نے دنیا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی' وہ آخرت میں اس سے محروم (۳)۔ رہے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب معراج میں تشریف لے گئے تو آپ ﷺ کے سامنے دست غیب نے دو پیالے رکھے۔ ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ ناموس وحی حضرت جبرائیل نے کہا ''اس خدا کی حمد جس نے آپ ﷺ کو فطرت کی راہ دکھائی' اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ ﷺ کی امت گمراہ ہو جاتی'' (۴)۔ گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''کوئی مومن جب شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔ (۵)۔ یہ بھی فرمایا ''قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا'' (۶)۔

اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سد ذرائع کے طور پر حرام کیے یہاں تک کہ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کیا' جن میں شراب عموماً بنائی جاتی ہے' پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے تو اس سختی کو اٹھا دیا۔(۷)۔

اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آ چکا ہے کہ :

ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (مائدہ: ۱)

گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو۔

کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا' بنانا' بیچنا' خریدنا' لینا' لے جانا' سب حرام ٹھہرایا گیا' فرمایا ''خدا نے شراب' اس کے پینے والے' پلانے والے' بیچنے والے' خریدنے والے' دوسروں کے لیئے نچوڑنے والے' اپنے لیئے نچوڑنے والے' اس کے لے جانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے' سب پر لعنت فرمائی ہے۔''(۸)۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ ''ہر نشہ کی چیز حرام ہے' اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو ایسا کا تھوڑا پینا بھی ویسا ہی حرام ہے''(۹)۔

---

(۱)۔صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔ (۲)۔ صحیحین کتاب الاشربہ۔ (۳)۔ ایضاً۔ (٤)۔ ایضاً۔ (٥)۔ ایضاً۔ (٦)۔ ایضاً۔ (۷)۔ ایضاً۔ (۸)۔ ابوداؤد کتاب الاشربہ۔ (۹)۔ صحیحین و ابوداؤد ترمذی کتاب الاشربہ۔

غیظ وغضب

غیظ وغضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے' بہت سے ظالمانہ اور بے دردانہ کام انسان صرف غیظ وغضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے' اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے اس لیئے ایک مسلمان کو چاہئے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ و غضب کا اظہار نہ کرے' اللہ تعالی نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے۔

والکاظمین الغیظ (آل عمران: ۱۴) اور وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں' اور دوسری جگہ فرمایا واذا ما غضبو ھم یغفرون (شوری: ۴) اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے' لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہیں ہے' لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے اور معاف کر دے اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے۔ (۱)۔

حضرت ابو ہریرہؓ' حضرت ابن عمرؓ حضرت جاریہؓ بن قدامہ' حضرت ابو ذرؓ وغیرہ کی صحابیوں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے' ارشاد ہوا کہ ''غصہ نہ کیا کرو۔'' اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی' تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرضی کی' آپ ﷺ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ ''غصہ نہ کیا کرو'' (۲)۔ مسند احمد میں ہے کہ ان صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ

مشہور صحابی ابو سعیدؓ خدری کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے عصر کی نماز کے بعد صحابہ کو کھڑے ہو کر نصیحتیں فرمائیں' جن میں سے ایک یہ تھی۔ فرمایا ''آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کیئے گئے ہیں' ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے

اور سکون جلد ہو جاتا ہے' اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے' اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے' تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے' اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آ جاتا ہے اور دفع بہت دیر میں ہوتا ہے تو ہاں! ان میں سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آئے اور دور ہو جائے' اور ان میں سب سے برا وہ ہے جس کو غصہ جلد آ جاتا ہے اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو' ہاں! غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے' دیکھتے نہیں کہ اس کی آنکھیں لال اور اس کی رگیں پھول جاتی ہیں' تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کے چاہئے کہ وہ زمین سے لگ جائے۔" (۳)۔

ابو داؤد میں ہے کہ آپ ~ صل ۳~ نے فرمایا "غصہ شیطان سے ہے' اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے' جس کو غصہ آئے اس کو چاہئے کہ وضو کر لے" (۴)۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہئے کہ بیٹھ جائے اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہئے کہ لیٹ جائے۔" (۵)۔

---

(۱)۔ صحیح مسلم باب فضل من یملك نفسه' عند الغضب و بخاری کتاب الادب باب یحذر من الغضب۔ (۲)۔ صحیح بخاری و مسند احمد و ابن حبان و طبرانی (منذری باب الترهیب من الغضب۔ (۳)۔ جامع ترمذی (منذری باب مذکور) (٤)۔ سنن ابی داؤد کتاب الادب باب من کتم غیظا۔ (۵)۔ ایضاً۔

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہو گئیں' ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ غصہ سے لال ہو گیا اور رگیں پھول گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا' پھر فرمایا مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ کہے۔ (۱)۔

اس اخیر حدیث کی تائید قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔

خذ العفو و امر بالعرف واعرض عن الجهلین' و اما

یـنزغنك من الشیطن نزغ فاستعذ باللہ انه سمیع علیم۔ (اعراف: ۲۴)

معاف کرنے کی عادت ڈال نیکی کی بات کہہ اور نادانوں سے درگزر کر اور اگر شیطان کی چھیڑ تجھ کو ابھار دے تو اللہ کی پناہ پکڑ' بیشک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اسی قسم کی آیت سورۂ حم السجدہ (۵) میں بھی ہے' جس کا ترجمہ یہ ہے۔

''نیکی اور بدی برابر نہیں' برائی کا جواب نیکی سے دے' پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہوگی وہ ایسا ہو جائے گا' جیسے دوست رشتہ والا اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے' اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ' بیشک وہی سننے والا جاننے والا ہے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں' ایک روحانی اور دو ظاہری' روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے' یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے اس لیئے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہئے کہ خداوندا! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) خدا اس کی سنے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کرے گا' ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہوگا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے تو خدا کا نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے' مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کر لے' اس سے منشا یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے' آنکھیں لال ہو جاتی ہیں۔ چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی' اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بغض و کینہ

دل میں کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیرپا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے' یہ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے۔

ربنا اغفر لنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا

اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے آگے ایمان میں پہنچے' معاف کر اور ہمارے دلوں

---

(۱)۔صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب و مسلم باب فضل من یملك نفسه' عندالغضب۔

انك رئوف رحیم۔ (حشر: ۱)

میں ایمان والوں کا کینہ مت رکھائے ہمارے پروردگار تو نرمی والا مہربان ہے۔

جنت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے آپس میں بھائی بھائی ہوں گے وہاں بغض و کینہ کا گذر نہ ہوگا' فرمایا:

ونزعنا مافی صدورهم من غل اخوانا علی سرر متقبلین۔ (حجر: ۴)

اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا بھائی بھائی ہو کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے۔

ونزعنا مافی صدورهم من غد تجری من تحتهم الانهر (اعراف: ۵)

اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا نہریں ان کے نیچے بہتی ہوں گی۔

ان آیتوں کے اشارہ سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیوں میں کینہ رہے گا جنت کا تخت ہاتھ نہ آئے گا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا

دست درازی اور ظلم ہے جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن و امان کو برباد کر ڈالے اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے تا کہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں گو کسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لیئے دی گئی تا کہ یہ برائی آگے نہ بڑھنے پائے فرمایا۔

والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون و جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا(شوری: ۴)

اور جن پر ظلم ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا عوض اسی طرح کی برائی ہے۔

یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی برائی اس کے ساتھ کی جائے۔

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کر دے تو مظلوم اپنا انصاف خدا کے ہاں پائے گا اور ظالم خدا کی محبت سے محروم رہے گا۔

فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ انہ لایحب الظالمین (شوری: ۴)

پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے بیشک اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی جا سکتی۔

ولمن انتصر بعد ظلمہ فاولئک ماعلیھم من سبیل (شوری: ۴)

راہ ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق دھوم مچاتے ہیں ان کے لیئے دکھ والی سزا ہے۔

اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طلب قصاص کی منصفانہ اجازت دی گئی۔

ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیه سلطانا فلا یسرف فی القتل انه کان منصورا۔ (اسرائیل: ۴)

اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے زور دیا ہے تو وہ خون کرنے میں زیادتی نہ کرے، بے شبہ اس کو مدد دی جائے۔

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کی جائے، تاکہ دنیا میں عدل قائم ہو لیکن مقتول کے وارثوں کو بھی چاہئے کہ انتقام کے جوش میں حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزوں اور دوستوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگیں ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کاروائیوں کو علانیہ بیان کرے اس کے دو فائدے ہیں ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے میں کچھ ہچکچائیں گے، دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی، فرمایا۔

لا یحب الله الجهر بالسوء من القول الا من ظلم و کان الله سمیعا علیما۔ (نساء: ۱۴۸)

اور اللہ کو بری بات کا پکارنا پسند نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کو اجازت ملی ہے کہ سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو خدا کے قانون کے آگے سرنگوں کریں:

فان بغت احدهما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفی الی امر الله (حجرات: ۹)

تو اگر ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھ آئے تو سب لڑو اس چڑھائی والے پر، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پھر آئے۔

یہ تو مسلمانوں کے آپس کی بات تھی، لیکن اگر فریق مخالف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی

نہ کی جائے اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے تو دوسرے مسلمانوں کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہئے' فرمایا۔

ولا یجرمنکم شنان قوم ان صدوکم عن المسجد الحرم ان تعتدوا وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب۔ (مائدہ: ۱)

اور کسی قوم کی دشمنی اس لیئے کہ وہ تم کو مسجد حرام سے روکتی تھی' اس جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور نیکی اور تقوی کے کام پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو' اور اللہ سے ڈرتے رہو' بیشک وہ سخت سزا والا ہے۔

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا اور موثر حربہ جس کا نام آج کل عدم تعاون اور نان کوا پریشن ہے اسلام نے اس کو بہت پہلے پیش کیا ہے' اور صاف وصریح حکم دیا ہے کہ گناہ اور ظلم وتعدی کے کاموں میں ظالموں کا ساتھ نہ دیا جائے اور ان کے ظلم کے کاموں میں شریک نہ ہوا جائے البتہ اس عدم شرکت کی صورتیں زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو فرمایا ''تم اپنے بھائی کی مدد کرو' خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم'' صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے' مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے' فرمایا'' اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے'' (۱)۔ اس طریقہ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالیئے۔ ظالم کی مدد کی ترغیب دلا کر سننے والوں کے دلوں میں توجہ کی خلش پیدا کر دی' اور جب ظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل و جان متوجہ ہو گئے تو اس مال التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے

کہ اس کو ظلم کی برائی سے روکا جائے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ یہ حدیث قدسی بڑے موثر انداز میں سنائی فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ ''اے میرے بندو! میں نے اپنے لیئے اور تمہارے لیئے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔(۲)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا۔(۳)۔ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں' ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے ہماری زبان میں اسی لفظی رعایت کی ساتھ اس کا ترجمہ یوں ہوسکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو۔کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہو جائے گا۔یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہوگی۔انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے' یہ اندھا پن قیامت کے دن ہولناک دن میں اندھیر ابن کر نمودار ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے' چاہیئے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے۔''(۴)۔

براء بنؓ عازب کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا اور سات باتوں سے روکا ہے' ان میں ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے'(۵)۔حضرت معاذؓ کو امیر بنا کر جب آپ ﷺ نے یمن بھیجا تو ان کو نصیحت فرمائی کہ ''مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کیونکہ اس کے اور خدا کے بیچ میں کوئی پردہ نہیں۔''(۶)۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی چیز پر ظلم کیا ہو تو اس کو چاہیئے کہ آج ہی اس سے پاک ہو لے اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینار ہوگا نہ درہم ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دلوائی جائیں گی' اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم پر لاد دی جائیں گی۔''(۷)۔فرمایا کہ ''ظالم کو خدا مہلت دیتا ہے' پھر جب اس کو پکڑتا

ہے تو پھر چھوڑتا نہیں۔''(۸)۔

فرمایا اہل ایمان دوزخ سے پاک ہوچکیں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل کے پاس روکے جائیں گے وہاں دنیا میں ایک نے دوسرے پر ظلم کیے تھے ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا' جب اس سے بھی پاک ہو جائیں گے تب ان کو بہشت میں جانے کی اجازت ملے گی۔(۹)۔

---

(۱)۔صحیح بخاری ابواب المظالم و صحیح مسلم باب نصر الاخ ظالما" و مظلومًا (۲)۔ صحیح مسلم باب تحریم الظلم و ترمذی کتاب الزھدو مسند احمد۔ جلد ۵ صفحہ ۱۵٤' ۱٦۰' ۱۷۷' ادب المفرد بخاری باب الظلم۔ (۳)۔ صحیح مسلم باب تحریم الظلم و صحیح بخاری ابواب المظالم۔ (٤)۔ صحیح بخاری ابواب المظالم۔ (۵)۔ ایضًا۔ (٦)۔صحیح بخاری ابواب المظالم۔ (۷)۔ ایضًا۔ (۸)۔ صحیح مسلم باب تحریم الظلم۔ (۹)۔ صحیح بخاری ابواب المظالم۔

فخر وغرور

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں، لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اور لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا یا کم پایا جاتا ہے، اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں دنیا میں سب سے پہلے اس بداخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا، اس نے آدم کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا۔

انا خیر منہ۔ (اعراف: ۲)

میں اس سے بہتر ہوں۔

وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں، خدا تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا، اور فرمایا:

فاھبط منھا فما یکون لک ان تتکبر فیھا فاخرج انک من الصغرین۔ (اعراف: ۲)

یہاں سے اتر جاؤ، یہاں تجھے غرور کرنا زیبا نہیں، نکل جا تجھے بڑائی کے بدلہ یہاں ذلت کی چھوٹائی ملی۔

کبر وغرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے جس کے لیئے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں، بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے میں یہ نہیں پسند کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا نہیں تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔(۱)۔

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنا دیا، پیغمبروں کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے کو اور لوگوں سے بڑا

سمجھتے ہیں' اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو غریب اور عام لوگ پیغمبروں کی ہدایت کو قبول کر لیتے۔

وبرز واللہ جمیعا قال الضعفو اللذین استکبروا انا کنا لکم تبعا فھل انتم مغنون عنا من عذاب اللہ من شیط (ابراہیم:۳)

اور قیامت کے دن) سب لوگ خدا کے روبرو نکل کر کھڑے ہوں گے تو (جو لوگ دنیا میں) کمزور (تھے اس وقت) ان لوگوں سے جو بڑی عزت رکھتے تھے' کہیں گے کہ ہم تو تمہارے قدم بقدم چلنے والے تھے تو کیا (آج) تم عذاب خدا میں سے کچھ (تھوڑا سا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو۔

اللہ تعالی نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون کو بڑی بڑی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے اعیان دولت کے پاس بھیجا' لیکن انہوں نے خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے اس لیئے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے۔

(۱) ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر۔

فاستکبروا و کانوا قوما عالین (مئومنون:۳)

تو وہ سب شیخی میں آ گئے اور وہ تھے (بھی) سرکش لوگ۔

اسی تکبر کی بنا پر وہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہو' اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے' ان کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں' اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں۔

فقال الملا الذین کفروا من قومہ مانرک الا بشرا مثلنا وما نرک اتبعک الا الذین ھم ارا ذلنا بادی الرای و ما نری لکم علینا لکم علینا من فضل بل نظنکم کذبین (ھود:۳)

اس پر ان کی قوم کے سردار جو (ان کو) نہیں مانتے تھے لگے کہنے کہ ہم کو تو تم ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے ہو' اور

ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ تمہارے پیرو ہو گئے ہیں جو ہم میں رذالے ہیں (اور پیرو ہو بھی گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے اور ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

غرض پیغمبروں کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگوں کو انکار تھا جو اپنے آپ کو مذہبی، قومی سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگوں سے یا خود پیغمبروں سے بڑا سمجھتے تھے، اس لیئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت شدت سے ان لوگوں کی برائی بیان کی ہے اور مختلف الفاظ میں بیان کی ہے، تا کہ کبر و غرور کے تمام مدارج پیش نظر ہو جائیں عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہیں، بعض جگہ اس کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

بل الذین کفروا فی عزہت وشقاقط (ص: ۱)
لیکن جو لوگ منکر ہیں (ناحق کی) ہیکڑی اور مخالفت میں (پڑتے) ہیں۔

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قومی لفظ اختیار کیا ہے۔

کذلك یطبع اللہ علی کل کلب متکبر (مومن: ۴)
جتنے مغرور اور سرکش ہیں اللہ ان کے دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔

دو موقعوں پر اس کے لیئے کا لفظ آیا ہے، یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو گھمنڈ ہوا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے مغرور اور فخار میری محبت کی عزت سے محروم ہیں۔

ان اللہ لا یحب من کان مختا لا فخورا۔ (نساء: ۲)
اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو مغرور اور فخار ہو۔

انہ لا یحب المستکبرین (نحل: ۳)
اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ان کو جہنم کی خوشخبری بھی یہیں دے دی گئی ہے۔

فرمایا کہ ''جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہیں اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالینا چاہئے۔'' ایک بار آپ ﷺ خود عصا ٹیکے ہوئے نکلے تو صحابہ کرام تعظیم کے لیئے کھڑے ہو گئے فرمایا کہ عجمیوں کی طرح تعظیم کے لیئے کھڑا نہ ہوا کرو۔(۲)۔

بڑے آداب والقاب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کرنا اگر وہ خلاف واقعہ ہوں تو جھوٹ ہے اور اگر واقعہ کے مطابق ہوں تو فخر وغرور کا ذریعہ ہیں' عجمی بادشاہ اپنے کو فخریہ ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے۔(۳)۔

کبر وغرور کی چند عام اور بدنما صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے مثلاً۔

ولا تمش فی الارض مرحا انك لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا۔ (بنی اسرائیل:۴)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چلا کر کیونکہ (اس دھماکے کے ساتھ چلنے سے) پہاڑوں کو تو پھاڑ نہیں سکے گا' اور نہ (تن کر چلنے سے) پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔

ولا تصعر خدك للناس ولا تمش فی الارض مرحا ان الله لا یحب کل مختال فخور۔ (لقمان:۲)

اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اترا کر نہ چل' بے شک اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جس کو گھمنڈ ہو فخار ہو۔

گنہگار کی شان یہ بیان کی ہے۔

ثانی عطفه (حج:۱)

اینٹھتا ہوا۔

---

(۱)۔ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل' الرجل۔ (۳)۔ صحیح بخاری۔ (٤)۔ ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار۔ (۵)۔ ترمذی ابواب الزهد۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من جر ثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیمہت۔

جو شخص غرور سے اپنے کپڑے گھسیٹے گا خدا اس کی طرف قیامت کے دن نہ دیکھے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ گزشتہ لوگوں میں ایک شخص ایک جوڑا پہن کر اتراتا ہوا نکلا تو خدا نے زمین کو حکم دیا جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس میں دھنسا چلا جا رہا ہے' (۱)۔ اس کے برعکس بہت سے افعال ہیں جو تواضع و خاکساری پر دلالت کرتے ہیں' اور ان ہی کو خدا نے اپنی خاص عبودیت کی علامت قرار دیا ہے۔

وعباد الرحمان الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجھلون قالوا سلما (فرقان: ۲)

اور (خدائے) رحمان کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں' اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (انکو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوزانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا اس نے کہا بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے فرمایا ''خدا نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہے متکبر اور سرکش نہیں بنایا ہے۔'' (۱)۔

ایک صحابی نے جن کو لوگ مغرور و متکبر سمجھتے تھے' اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں' حالانکہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں' کمل اوڑھتا ہوں اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ ''جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس میں غرور نہیں پایا جاتا۔'' (۲)۔

کبر و غرور کے اسباب بہت سے ہیں لیکن عام طور پر دنیا دار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں وہ یہ ہیں حسب و نسب حسن و جمال' مال و دولت' قوت اور اعوان و انصار

کی کثرت' اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر و غرور کا ذریعہ نہیں۔

یاایھاالناس انا خلقنکم من ذکر و انثی و جعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا (حجرات: ۲)

لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا' اور (پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔

س کے بعد بتایا کہ شرافت و عظمت کی بنا نسب و حسب پر نہیں بلکہ روحانی فضائل پر ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقکم (حجرات: ۲)

اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیز گار ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی مزید تشریح کی' اور فرمایا کہ ''خداوند تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا' اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں مومن پرہیز گار اور بدکار بدبخت' تم لوگ آدم کے بچے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیئے گئے تھے' لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو

(۱)۔ابن ماجہ کتبا الاطعمتہ باب الاکل متکئا۔ (۲)۔ ترمذی ابواب البر و الصلتہ باب ماجاء فی الکبر۔

جہنم کا کوئلہ ہیں یا خدا کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹتا چلتا ہے۔(۱)۔

جہاں تک زیب و زینت اور جسم کی ظاہری آرائش اور پاکیزگی کا تعلق ہے' حسن و جمال کو ایک قابل قدر چیز قرار دیا' چنانچہ ایک خوبرو شخص نے جب آپ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتا عمدہ ہو' تو فرمایا کہ خدا حسن کو پسند کرتا ہے' (۲)۔ یعنی اس کا نام غرور نہیں' البتہ جن صورتوں میں حسن و جمال غرور و

تکبر کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے' شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے چنانچہ ایک صحابی کو آپ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں' جن میں ایک نصیحت یہ تھی کہ تہ بند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے اور خدا غرور کو نہیں پسند کرتا۔ (۳)۔

تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال و دولت کی اہمیت کو قائم رکھا اور اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی' مال و دولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی' اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے اس کو شہید کا لقب عنایت کیا لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر و غرور کا ذریعہ بنالیا جائے تو اس کی حقیقت جلوہ سراب سے زیادہ نہیں۔

اعلموا انما الحیوۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم و تکاثر فی الاموال والاولاد (حدید:۳)

(لوگو) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشا اور ظاہری طمطراق اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال اور اولاد کا خواستگار ہونا (بس یہی کچھ ہے)

احادیث میں مال و دولت کی برائی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے' ان میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر و غرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بن جاتا ہے حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں' ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کو مال و دولت کی طلب میں باہمی مسابقت نے غافل کر دیا' آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال' حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا' کھا پی ڈالا' اور پہن کر پھاڑ ڈالا۔ (۴)۔

قوت ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہر قسم کے تمدنی' مذہبی اور سیاسی کام انجام دیئے جاسکتے ہیں اس لیے اس قسم کے موقعوں پر وہ ایک قابل ستایش وصف

ہے یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کو قوی امین کہا ہے اور حضرت لوط نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے۔

قال لو ان لی بکم قوتہ او اوی الی رکن شدید (ھود:٦)

(لوط) بولے کہ اے کاش (آج) مجھ کو تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی' یا کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام بنی نوع انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے۔

---

(١)۔ترمذی ابواب البر والصلتہ باب ماجا فی الکبر۔ (٢)۔ ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجا اسبال الازار۔ (٣)۔ ترمذی کتاب الزھد باب ماجا فی الزھادہ فی الدنیا۔ (٤)۔ ترمذی کتاب الزھد باب ماجا فی الزھادہ فی الدنیا۔

اللہ الذی خلقکم من ضعف ثم جعل من بعد ضعف قوہ ثم۔ (روم:٦)

اللہ (ہی) وہ (قادر مطلق) ہے جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے) بنا کھڑا کیا' پھر (طفلی کی) کمزوری کے بعد (جوانی کی) توانائی دی۔

اور مسلمانوں کو طاقتور بننے پر اور سامان جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا ہے۔

واعدوا لھم ما استطعتم من قوہ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ و عدو کم واخرین من دونھم لاتعلمونھم اللہ یعلمھم۔ (انفال:٨)

اور (مسلمانو)! سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہو سکے کافروں کے (مقابلہ) کے لیئے ساز و سامان مہیا کیئے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اور (نیز) ان کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے

(اور) اللہ ان (کے حال) سے (خوب) واقف ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے ایک حدیث میں ہے کہ طاقتور مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب (۱)۔ ہے اگر چہ متعدد حدیثوں میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے' تاہم غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہیں' بلکہ تواضع و خاکساری کی فضیلت ہے جو ایک قابل ستائش وصف ہے اسی بنا پر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر وغرور کے ساتھ کیا گیا ہے' ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

الا اخبر کم باھل الجنتہ کل ضعیف متضعف الا اخبر کم باھل النار کل عتل جواظ متکبر۔ (۲)۔

کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس کو کمزور سمجھیں' کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ' بدخو اور مغرور شخص

دوسری حدیث میں ہے۔

الجبارون المتکبرون و قالت ھذہ یدخلنی الضعفاء والمساکین۔ (۳)۔

دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا دوزخ نے کہا مجھ میں جبار اور متکبر لوگ داخل ہوں گے اور جنت نے کہا کہ مجھ میں کمزور اور مسکین لوگ۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ضعف بجائے خود قابل مدح وصف نہیں ہے بلکہ اس کو صرف اس لیئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع و خاکساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا مظہر ہے۔

---

(۱)۔مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوہ و ترک العجز۔ (۲)۔ بخاری کتاب الادب باب الکبر۔ (۳)۔ مسلم کتاب صفات المنافقین

و احکام باب النار یدخلها الجبارون۔

اعوان و انصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لیئے ایک ما بہ الامتیاز چیز رہی ہے بالخصوص غیر متمدن قو میں ہمیشہ کثرت مال اور کثرت اولاد فخر وغرور کرتی ہیں اور اس فخر وغرور کے نشہ میں دوسروں کو حقیر سمجھتی ہیں' بلکہ خدا کو بھی بھلا دیتی ہیں' زمانہ سابق میں اسی قسم کا ایک شخص تھا جس کو اپنی دولت اور اعوان و انصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزیں ہمیشہ قائم رہیں گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی' اور اگر آئی بھی تو قیامت میں بھی اس کی یہی شان قائم رہے گی' وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے۔

انا اکثر منک مالا واعز نفرا (کہف:۵)

میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور (میرا) جتھا (بھی) بڑا زبردست (جتھا) ہے۔

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کے لیئے اس قدر کبر و غرور جائز نہیں۔

اکفرت بالذی خلقك من تراب ثم من نطفہت ثم سوٰك رجل (کہف:۵)

کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے جس نے تجھ کو (پہلے) مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا' پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عذاب الٰہی نے اس کی دولت کو ملیا میٹ کر دیا اور اس کا جتھا ٹوٹ گیا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپائیدار چیز فخر وغرور کے قابل نہیں' اہل عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے' اور زندوں سے گزر کر مردوں کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے' اس فخر وغرور میں باہم مقابلہ ہوتا تھا اور اس مقابلہ کے لیئے ایک خاص لفظ ''تکاثر'' ایجاد ہو گیا تھا' جس نے ان کو دینی امور سے غافل و بے پرواہ کر دیا تھا اس لیئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ میں انسانوں کو

خطاب کر کے اس پر سرزنش کی:

الھکم التکاثر حتی زر تم المقابر (تکاثر: ۱) تم کو مال اور اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے غافل بنا دیا ہے' یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملتے ہو۔

لیکن اسی کے ساتھ اسلام میں یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں' بلکہ اجتماعی اور تمدنی حیثیت سے نسلی ترقی ایک قابل فخر چیز ہے' بشرطیکہ فخر و غرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے اور اسی لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم۔ ~}~

محبت کیش اور بچے جننے والی عورت سے نکاح کرو' کیونکہ کثرت تعداد میں تم پر دوسری قوموں کے مقابل میں فخر کروں گا

آج تعداد کی اسی اقلیت و اکثریت کے مسئلہ نے قوموں اور ملکوں کی سیاست کا رخ بدل دیا ہے اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا۔

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح باب فی تزویج الابکار۔

ریاء

ریاء کے لغوی معنی دکھاؤ اور نمائش کے ہیں' انسانی اعمال کی اصل حقیقت ان کی نیت اور غرض پر مبنی ہے' اس لیئے اعمال کی راستی و ناراستی اور اچھائی کا بہت مدار غرض و نیت پر ہے صحیح حدیث میں ہے کہ:

انما الاعمال بالنیات۔

عمل نیت سے ہے۔

اور ریاء اسی نیت یعنی اعمال کی غرض و غایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کر دیتی ہے' جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے' نمائش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی و برائی کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسن ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا کر کے دکھائے' غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے' کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ اور نہیں' اسی لیئے قرآن نے ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی ہے اور ان کی برائی بیان کی ہے' جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش تمہاری لڑائی کا مقصد نہ ہو' بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہو' فرمایا۔

ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرا و رئاء الناس (انفال:٦)

اور ان (کافروں) جیسے نہ بنو' جو مارے شیخی کے اور لوگوں کے دکھانے کیلئے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔

یہ حیا اور نمائش انسان کے ہر اس عمل میں ظاہر ہوتی ہے جو خالصتاً لوجہ اللہ نہ کیا جائے بلکہ اس سے کوئی اور دینوی غرض مطلوب ہو' اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرک خفی اور شرک اصغر رکھا ہے کیونکہ دینوی غرض کی آمیزش سے ان اعمال میں خدا کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کر لیا جاتا ہے' اسی لیئے خدا نے فرمایا:

ارایت من اتخذ الھہ ھواہ (فرقان:٤)

کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنالیا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک سے بے نیاز ہوں تو جو شخص میرے لیئے کوئی ایسا عمل کرے جس میں کسی اور کو بھی شریک کرے تو مجھ کو اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ اسی کے لیئے ہے جس کو اس میں شریک کرلیا گیا ہے۔

ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں جو خدا کے لیئے کیا گیا ہے، کسی اور کو شریک کرلیا ہے وہ اس کا ثواب اسی سے طلب کرے کیونکہ اللہ شرک سے بے نیاز ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف ہے لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چاند، سورج اور بتوں کی پرستش کرنے لگے گی، بلکہ خدا کے علاوہ اور لوگوں کے لیئے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی۔(۱)۔

(۱)۔ سنن ابن ماجه باب الرياء والسمعه۔

اسلام کے لغت میں کفر کے بعد برائی میں نفاق کا درجہ ہے، نفاق کیا ہے؟ یہ ہے کہ دل میں کچھ ہو اور زبان سے کچھ کہا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عمل خیر کی حقیقت ریا اور نمائش کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی ہے، وہ دل سے تو خدا کا منکر ہوتا ہے لیکن خوف وخطر یا دوسرے دینوی فائدوں کے لیئے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجالاتا ہے اس لیئے قدرتی طور پر ان اعمال میں ریا کاری پائی جاتی ہے اس بنا پر قرآن مجید میں جابجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے۔

یایھا الذین امنوا لا تبطلوا صدقتکم بالمن و الاذی کالذی ینفق ماله رئا الناس ولا یؤمن بالله و الیوم الاخر۔ (بقرہ:۲۶۴)

مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور (سائل کو) طعن دے کر اس شخص کی طرح اکارت مت کرو جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیئے خرچ کرتا ہے' اور اللہ اور روز آخرت کا یقین نہیں رکھتا۔

منافقوں کے ریا کارانہ اعمال کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں' ایک تو یہ کہ ان کا مقصد ایک جماعت میں شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا' دوسرے یہ کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں پر اثر ڈالنا اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے پہلا مقصد چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے اس لیئے وہ نہایت بے پروائی' غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں' اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لیئے مصنوعی خشوع وخضوع' للّٰہیت اور محویت و استغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔

عہد رسالت میں منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہیں اس لیئے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کے ساتھ ادا کرتے تھے' تا کہ لوگ اس ظاہری نمائش سے ان کو مسلمان سمجھتے رہیں اسی لیئے ایسے شخص کے عمل میں للّٰہیت اور خلوص نہیں پیدا ہو سکتا۔

ان المنفقین یخدعون اللہ وھو خادعھم واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالی یرائون الناس ولا یذکرون اللہ الا قلیلا۔ (نساء: ۱۴۲)

منافق (مسلمانوں کو دھوکا دے کر گویا) خدا کو دھوکا دیتے ہیں حالانکہ (حقیقت میں) خدا ان ہی کو دھوکے میں رکھے ہے اور (یہ لوگ) جب نماز کے لیئے کھڑے ہوتے ہیں تو الکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں (ظاہرداری کر کے) لوگوں کو دکھاتے ہیں' اور (دل سے) اللہ کو یاد نہیں کرتے'

مگر کچھ یوں ہی سا۔

فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتہم ساھون الذین ھم یرائون۔(ماعون)

تو ان (منافق) نمازیوں کی (بڑی) تباہی ہے جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت کرتے ہیں اور وہ جو (کوئی نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہؓ مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آ نکلے اور فرمایا ''کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیئے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔'' صحابہؓ نے کہا ''ہاں'' فرمایا ''شرک خفی'' اور یہ کہ آدمی نماز کے لیئے کھڑا ہوا اور اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے اس لیئے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے۔(۱)۔

چونکہ ریا اور نمائش اعمال کی اصلی شکل وصورت ہی کو بگاڑنا چاہتی ہے اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخ کنی ضروری سمجھی اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریاکاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب کی ممانعت فرمائی مثلاً ان میں پہلی چیز تو داد و دہش ہے جو عام طور پر نیک نامی شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے بالخصوص عرب کے فضائل اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی اور لوگ محض نام و نمود کے لیئے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے اسلام نے صدقہ و خیرات کا حکم دیا تو اس بد اخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا اس لیئے قرآن و حدیث میں باقاعدہ زکوۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ و خیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی تاکہ اس میں ریاکاری کا آمیزش نہ ہونے پائے۔

ان تبدوا الصدقت فنعماھی وان تخفو ھا وتئو توھا

الفقراء فھو خیر لکم۔ (بقرہ:۲۷۱)

لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دوتو وہ بھی اچھا' (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس کو چھپاؤ اور حاجت مندوں کو دوتو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے (کہ اس میں نام ونمود) کا دخل ہونے پاتا۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب کے خدا کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا' خدا سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جس میں ایک شخص وہ ہوگا جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں کو یہ نہ معلوم ہوسکا اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا۔(۲)۔

عرب کے محاسن اخلاق میں سب سے زیادہ نام ونمود کی جو چیز تھی وہ شجاعت تھی' اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانوں کے لیئے اظہار شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا' اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دینوی فوائد حاصل ہو سکتے تھے اس لیئے وہ ریا کاری کی نمائش گاہ بن سکتا تھا۔لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے مسلمانوں کو اس کی اصلی حقیقت بتائی' چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لیئے' ایک شخص شہرت کے لیئے اور ایک شخص اظہار شجاعت کے لیئے لڑتا ہے تو ان میں کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے فرمایا' ''اس شخص کا جو اس لیئے لڑتا ہے کہ خدا کا کلمہ بلند ہو۔''

آپ ﷺ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہار شجاعت کے لیئے لڑتا ہے' ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص ریا سے جہاد کرتا ہے تو کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے' وہی پہلا جواب ملا۔(۳)۔

(۱)۔ابن ماجہ باب الربا' والسمعہ۔ (۲)۔ بخاری کتاب الزکوٰہ باب الصدقہ بالیمین۔ (۳)۔ مسلم کتاب الامارہ باب من قاتل لتکون کلمتہ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔

ریا کاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہے' اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی' اس لیئے اس میں ریا کاری کی جو آمیزش ہوسکتی تھی اس کے نتائج بد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت موثر طریقہ سے بتائے' ایک حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائے گا اور خدا اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے ان سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا اور شہید ہوا' خدا کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو' تم صرف اس لیئے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا' پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا لوگوں کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا' اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا' علم سکھایا اور تیرے لیئے قرآن پڑھا' ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو' تم نے علم اس لیئے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ قرآن اس لیئے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ۔ پھر اسی طرح گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا اس کے بعد ایک دولتمند شخص لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا وہ کہے گا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے میں نے سب میں اپنا مال صرف کیا ارشاد ہوگا کہ جھوٹ بکتے ہو تم نے یہ سب صرف اس لیئے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہیں' پھر اسی طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (۲)۔

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے اترانے اور لوگوں کو دکھاتے نکلے۔

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمائش کو نکلے تھے۔ جب کسی قوم میں تمدن کی وسعت، دولت کی بہتات اور خوشحالی عام ہو جاتی ہے تو افراد میں خودغرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے، نہ اللہ کا فرض یاد رہتا ہے اور نہ بندوں کا حق، ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ میں رہتا ہے اور یہی ان کی تباہی کا وقت ہوتا ہے فرمایا:

وکم اھلکنا من قریۃ بطرت معیشتھا (قصص:۶)

اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کر دیں جب وہ اپنے گزران میں اترا کر چلیں۔

یہ تو چند بستیوں کی تباہی کا حال تھا، لیکن ایک وقت آئے گا جب ساری دنیا ایک ساتھ برباد ہو جائے گی، یعنی قیامت آئے گی اس بربادی کے دن کی جو نشانیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتائی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہوگی، اور اسی پر ناز کرے گا اور اترائے گا اور یہی وہ موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہیے۔(۱)۔

مذہبی حیثیت سے جن لوگوں کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے، ان کو اسی عجب و خود بینی کی بنا پر اپنی پرہیزگاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعلّی کی ممانعت فرمائی ہے۔

فلا تزکوا انفسکم ھوا علم بمن اتقی (نجم:۲)

تم (بہت) اپنی پاکیزگی نہ (جتایا) کرو پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود و نصاریٰ میں عجب و خود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر

دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے۔

وقالت الیھود والنصاری نحن ابنئوا اللہ واحبائوہ (مائدہ:۳)

اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔

قل یاایھاالذین ھادوا ان زعمتم انکم اولیاء للہ من دون الناس (جمعہ: ۱)

(اے پیغمبر ان یہودیوں سے) کہو کہ اے یہود اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ اور تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے چہیتے ہو۔

ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب و خود بینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوہ سراب سے زیادہ نہ تھی، لیکن معاشرتی اور سیاسی

(۱) ابوداؤد کتاب الملاحم۔

حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہو جاتا ہے، مگر مذہبی حیثیت سے آخر میں چاک ہوگا۔

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے، اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہے حدیث میں ہے کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ ''تم نے اس کو ہلاک کر دیا۔'' ایک بار آپ ﷺ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی، آپ ﷺ نے فرمایا ''تم نے اس کی گردن کاٹ لی، اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں'' (۱)۔ مدح کی یہ ممانعت اس لیئے کی گئی ہے کہ اس سے ممدوح میں عجب و خود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ

نہ سمجھے' بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور عطیہ سمجھے' اسی لیئے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے فرمایا' لاتفرحوا بما اتاکم (حدید : ۳) خدا نے جو دیا ہے اس پر اتراؤ نہیں۔

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے، چونکہ اسلام عرب میں آیا، اور عربوں کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی، اس لیئے تمام مذہبوں میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے فضول خرچی کو روکا ہے اور انسان کو اپنی حد میں رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بری طرح برباد ہو کر فنا ہو جاتا ہے، اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، نیز فضول خرچی عموماً فخر وغرور اور نمائش کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے، اور ان بداخلاقیوں کی برائی چھپی نہیں۔

اہل عرب جب جلسوں میں شراب پیتے اور جوا کھیلتے تو جوا میں جو کچھ جیتتے، نشہ کے ترنگ میں اسی وقت لٹا دیتے، جانور ملتے تو اسی وقت بے محبہ ذبح کر ڈالتے جاہلیت کی شاعری میں اس قسم کے فخریہ اشعار بکثرت ہیں، شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کے لیئے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے، یہاں تک کہ دونوں میں ایک کے تمام اونٹ ختم ہو جاتے تھے، تو وہ اپنے حریف کے مقابل میں مغلوب سمجھا جاتا تھا، اس کو معاقدہ کہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا۔ (۲)۔

اہل عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر وغرور اور نام ونمود پر قائم تھی، اور اس نے ان کی فیاضی میں بے اعتدالی پیدا کر دی تھی، اس کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ خدا کے نزدیک مقبول نہ تھی، اور دینوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال و دولت کو اڑا کر خود مفلس اور قلاش ہو جاتے تھے۔ پھر اس قسم کی فیاضی کیلئے جائز مال کافی نہیں ہوتا تھا، تو وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے، اور نمائش کے موقعوں پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے اس بے اعتدالی کے دور کرنے کیلئے اللہ تعالی نے حقوق مقرر فرمائے اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا۔

(۱)۔بخاری کتاب الادب باب مایکرہ من التماوح۔ (۲)۔ ابوداؤد۔

وات ذا القربی حقه والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیرا' ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین و کان الشیطان لربه کفورا۔ (اسرائیل:۳)

اور رشتہ دار اورغریب اور مسافر (ہرایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو اور (دولت کو) بیجا مت اڑاؤ (کیونکہ دولت کے) بیجا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں' اور شیطان اپنے پروردگار کابڑا ہی ناشکرا ہے۔

آیت کے آخیر ٹکڑے سے ثابت ہے کہ فضول خرچی خدا کی ناشکری ہے' امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں ''بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہل عرب کی عبادت کے موافق ہے' کیونکہ وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے' پھر اس کو فخر وغرور کے حاصل کرنے کے لیئے صرف کرتے تھے۔''

ولا تجعل یدك مغلولة الی عنقك ولا تبسطها کل البسط فتقعد ملوما محسورا۔ (بنی اسرائیل:۳)

اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکڑو کہ (گویا) گردن میں بندھا ہے اور نہ بالکل اس کو پھیلا ہی دو (ایسا کروگے) تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی کریں گے (اور) تم تہی دست بھی ہوگے۔

چونکہ یہ اعتدال کا وصف خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا اس لیئے اللہ تعالی نے اس کو مسلمانوں کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا۔

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا و کان بین ذلك قواما (الفرقان:۶)

اور خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں بلکہ ان کا خرچ افراط اور تفریط کے درمیان بیچ کا۔

کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدحیثیتی کو پسند کرتا ہے اور کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے، بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہئے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہیں کرنا چاہئے مطلب ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اس کی اپنی ذات ہے سورہ اعراف میں خدا فرماتا ہے:

و کلوا واشربوا ولا تسرفوا انه لا یحب المسرفین۔
(اعراف:۳)

اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بیشک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہیں، مگر اس میں بھی بعض مفسروں کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہیں۔

کلوا من ثمره اذا اثمر واتوا حقه یوم حصاده ولا تسرفوا انه لا یحب المسرفین (انعام:۱۴۱)

درخت کے پھل سے جب وہ پھلے تم کھاؤ، اور اس کا حق ادا کرو جب فصل کٹے اور حد سے آگے نہ بڑھو اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔

حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً اس کو علم و فضل، مال و دولت، عزت و شہرت یا اور کوئی دینی یا دینوی نعمت عطا فرمائے، تو ان چیزوں کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک و منافست کہتے ہیں اور یہ کوئی بداخلاقی نہیں بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے، لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسرے کے لیئے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں، تو اسی کا نام حسد ہے اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے کیونکہ عہد رسالت میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا خاص احسان کیا تھا کہ ان کو قرآن و ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی، جس کو دیکھ کر مسلمانوں کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے۔

ام یحسدون الناس علی ما اتھم اللہ من فضلہ۔ (النساء:۸)

یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو جو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے اس پر جلے مرتے ہیں۔

اور ان کی خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانوں سے چھین لی جائے۔

ود کثیر من اھل الکتاب لو یردو نکم من بعد ایمانکم کفارا حسدا من عند انفسھم (بقرہ:۱۳)

(مسلمانو)! اکثر اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں۔

حسد کی تین قسمیں اور درجے ہیں۔

۱۔ یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے، گو وہ اس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان ہی کی طرح کافر ہو

جائیں: ودوا لوتکفرون کما کفروا فتکونون سواء (نساء: ۱۲) ان منافقوں کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہو گئے ہیں، اسی طرح تم (سچے مسلمان) بھی کفر کرنے لگو (اور وہ) اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اس کی خواہش ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے، اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ جائے اس کو مل نہیں سکتی، اس لیئے بالفرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے، دوسری صورت میں چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا، اس لیئے اس کو حقیقی معنوں میں حسد تو نہیں کہہ سکتے تاہم قرآن مجید میں ہے۔

ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض (النساء: ۵)

اور خدا نے جو تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے اس کا کچھ ارمان نہ کرو۔

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو بعینہ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے، اس لیئے یہ بھی مذموم ہے، البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہیں، اسی لیئے فرمایا:

وسئلوا اللہ من فضلہ۔ (نساء: ۵)

اور خدا سے اس کا فضل مانگو۔

تیسری صورت بالکل مذموم نہیں بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے، اور شریعت میں اسی کو مسابقت کہتے ہیں۔ حسد کے سات اسباب ہیں۔

۱۔
بغض وعداوت' کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونوں یکساں ہوں اس لیئے ایک دشمن کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی دشمن پر مصیبت آئے' اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے' اس کے بجائے جب خدا اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا' اور اسی کا نام حسد ہے۔
کفار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو عداوت تھی وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

ودوا ماعنتم قد بدت البغضاء من افواههم وما تخفی صدورهم اکبر (آل عمران:۱۲)
چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے دشمنی تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو ہی چکی ہے اور (غیظ وغضب) جو ان کے دلوں میں (بھرے) ہیں وہ (اس سے بھی) بڑھ کر ہیں۔

ان تمسسکم حسنة تسؤهم وان تصبکم سیئة یفرحوا بها (آل عمران:۱۳)
(مسلمانو)! اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔

بغض وعداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے اس کے لیئے مساوات شرط نہیں بلکہ ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے بڑے شخص کا بدخواہ ہوسکتا ہے۔

۲۔حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے' کیونکہ امثال وقرآن میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گزرتا ہے' اور وہ اس کے اس ترفع کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب ان سے چھن جائے تاکہ وہ ان کے مساوی ہوجائے۔

۳۔حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص کو اپنا مطیع ومنقاد بنانا چاہتا ہے' اس لیئے

جب وہ کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقہ اطاعت سے نکل جاتا ہے' تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے' تا کہ وہ اس کا مطیع و منقاد ہو سکے کفار قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی حقیر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے۔

اھئو لا ء من اللہ علیھم من بیننا (انعام:٦)

کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں (اسلام کی توفیق دے کر) اپنا فضل کیا ہے۔

حسد کا یہ سبب اکابر و اشراف سے تعلق رکھتا ہے' اور اس کے لیئے کبر و غرور اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل لازمی ہے۔

۴۔ حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے پندار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے' تو ان کو تعجب ہوتا ہے' اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں کفار اسی وجہ سے پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے' اور تعجب سے کہتے تھے۔

ابعث اللہ بشرا رسولا (بنو اسرائیل: ١١)

کیا خدا نے آدمی (کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا ہے۔

۵۔ حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ جب دو شخصوں کا مقصد ایک ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں جب ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے' تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہو جاتا ہے ایک شوہر کی متعدد بیویوں اور ایک باپ کی متعدد بیٹوں میں جو رشک و حسد ہوتا ہے' اسی کی وجہ یہی ہوتی ہے' حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی اس کا سبب یہی تھا۔ اذ قالوا لیوسف و اخوہ احب الی ابینا منا ونحن عصبۃ۔ جب یوسف کے (بے مات) بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ باوجود یکہ ہم (حقیقی) بھائیوں کی بڑی جماعت ہے' تاہم یوسف اور اس کا (حقیقی) بھائی (بن یامین) ہمارے والد کو ہم سے البتہ بہت ہی زیادہ عزیز ہیں۔

۶۔حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے' اس لیئے جو لوگ اس حیثیت سے یگانہ روزگار رہنا چاہتے ہیں جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک و سہیم ہوگیا ہے تو یہ ان کو سخت گراں گزرتا ہے اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف و امتیاز سے دوسرا شخص جاہ و منزلت میں ان کا شریک ہوگیا ہے وہ اس سے چھن جائے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لیئے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا' لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوق جاتا رہا' اس لیئے وہ اسلام ہی کی بیخ کنی پر آمادہ ہوگئے منافقین میں عبداللہ بن ابی کو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے' لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کردیا' اس لیئے اس کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا۔(۱)۔

۷۔حسد کا ساتواں سبب خبث نفس اور بدنیتی ہے کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے' اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو ان کو مسرت ہوتی ہے' اس صورت میں حسد کے پیدا ہونے کے لیئے اشتراک' رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی' بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہیں۔

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر ان لوگوں سے تعلق رکھتے' جن میں کوئی چیز مابہ الاشتراک ہوتی ہے' اس لیئے بیگانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ صرف ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے' جن میں باہم رابطہ و اشتراک ہوتا ہے۔

---

(۱)۔بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین۔

ایک عالم دوسرے عالم پر ایک عابد دوسرے عابد پر اس لیئے حسد کرتا ہے کہ ان میں ایک چیز یعنی علم و عبادت مشترک ہے' اس کے بخلاف ایک عالم یا عابد کو کسی تاجر پر

حسد نہیں ہوتا کیونکہ ان میں کوئی چیز ما بہ الاشتراک نہیں۔

اسلام نے مسلمانوں میں باہم اخوت کا رشتہ قائم کرکے نہایت وسیع اور عالمگیر اشتراک پیدا کر دیا تھا اس لیئے ان میں حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکتا تھا اور حسد کے جس قدر اسباب و مراتب ہیں وہ سب کے سب اس وسیع برادری میں جمع ہو سکتے تھے اس لیئے اصولاً جو بداخلاقیاں اس اخوت کا شیرازہ باہم کر سکتی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب سے مسلمانوں کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تباغضوا وکونوا عباد اللہ اخوانا

بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے نہ لوگوں کے عیوب کی ٹوہ لگاؤ نہ باہم حسد کرو نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو نہ باہم بغض رکھو بلکہ اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

المعنی کونوا کاخوان النسب فی الشفقتہ و الرحمہت والمواساہت والمعاونہت والنصیحہت

اس کے معنی یہ ہیں کہ رحم و شفقت غم خواری محبت اعانت اور خیر خواہی میں نسبی بھائیوں کی طرح ہو جاؤ۔

لیکن یہ اخوت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب ان تمام بداخلاقیوں سے احتراز کیا جائے ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہو جائے گی اور یہ اس قسم کی تمام محاسن اخلاق جو اخوت کا لازمہ نتیجہ ہیں یا ان سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے فنا ہو جائیں گے چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔

کانہ قال اذا ترکتم ھذہ المنھیات کنتم اخوانا مفھومہ اذلم تتد کوھا تصیروا اعداء و معنی کو نوا اخوانا اکتسبوا ما تصیرون بہ اخوانا مما سبق ذکرہ و غیر ذلک من الامور المقتضیہت لذلک نفیا و اثباتا۔

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم لوگ منہیات کو چھوڑ دو گے تو بھائی بھائی ہو جاؤ گے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب ان کو نہ چھوڑو گے تو دشمن ہو جاؤ گے اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اخلاقی خوبیاں حاصل کرو جن کی وجہ سے بھائی بھائی بن جاؤ' اور یہ اخلاقی خوبیاں وہ ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جو اخوت کو نفیا" یا اثباتا پیدا کرتے ہیں۔

ان بد اخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے' کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے بمشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے' ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شکون' بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا کہا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے' فرمایا شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو اس سے اس کو مت چھوڑ دو' اور جب بدگمانی پیدا ہو تو مت اس کی سچ سمجھو' اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔(۱) لیکن عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہوا تو اسلام کے تمام محاسن اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا' اور یہ شرارہ خرمن اسلام کو پھونک کر خاک سیاہ کر دے گا' اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا۔

ایاکم و الحسد فان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب۔ (۲)۔

تم لوگ حسد سے بچو' کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

ومن شر حاسد اذا حسد۔

اور برا چاہنے والے کی بدی سے جب وہ حسد کرے۔

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمیں ہیں، ایک قسم تو قوت شہوانیہ سے تعلق رکھتی، اور اس کے مرتکب زیادہ تر رند، بیباک نوجوان اور بے تکلف دوست واحباب ہوتے ہیں، مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں تو عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں اس قسم کے حالات وواقعات بیان کیے جاتے ہیں جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

عربی زبان میں اس قسم کی فحش گوئی کو رفث کہتے ہیں اور قرآن مجید کی اس آیت میں۔

فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج۔ (بقرہ:۱۵)

حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی۔

اس کی ممانعت کی گئی ہے لیکن زمانہ حج کی تخصیص اس لیئے کی گئی ہے کہ اس زمانہ میں مردوں اور عورتوں کا عام اجتماع ہوتا ہے اور اس سفر میں پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے اس لیئے اس قسم کے چرچے نہایت آزادی کے ساتھ کیے جاسکتے ہیں حالانکہ یہ زمانہ صرف ذکر الٰہی کا ہوتا ہے ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ اسلام میں عام طور پر اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہے، چنانچہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے عورت اور مردوں کے ایک (۳)۔مجمع میں خطبہ دیا اور حمد وثناء کے بعد مردوں کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ ''کیا تم میں کوئی ایسا آدمی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے، اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس طرح خدا کے پردہ میں چھپ جاتا ہے؟'' لوگوں نے کہا ''ہاں'' پھر فرمایا کہ ''اس کے بعد لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا۔ اس پر سب لوگ خاموش ہو رہے، پھر عورتوں کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ ''کیا تم نے

(۱)۔مصنف عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۰۳ مصر۔

(۲)۔ ابوداؤد کتاب الاداب فی الحسد۔ (۳)۔ دونوں کی نشستیں الگ تھیں "اس"۔

سب اسی قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟" اس پر ایک عورت نے دوزانوں بیٹھ کر کہا کہ "ہاں" مرد اور عورت دونوں اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ "فرمایا تم لوگ جانتے ہو کہ اس کی کیا مثال ہے؟ اس کی مثال اس چڑیل کی ہے جو گلی میں ایک شیطان سے ملی اور اس نے اس سے مباشرت کی' حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے۔"(۱)۔

مقصود یہ ہے کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونوں کی بے شرمی کی صورت یکساں ہے اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدود الٰہی کی حرمت کا تخیل ہر حال میں برقرار رہے' ورنہ جب باتیں زبانوں پر آئیں گی تو وہ اہمیت کھو دیں گی' اور قول عمل کیلئے ایک دن راستہ صاف کر دے گا' یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتوں کے بیان کیلئے جب ناگزیر ضرورتیں پیش آتی ہیں تو مجاز و استعارہ کی زبان میں ان کو ادا کیا جاتا ہے' تاکہ مدعا ظاہر ہو' اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے' چنانچہ قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات مجاز و استعارہ ہی کے پردہ میں بیان کے گئے ہیں مثلاً۔

وقد افضی بعضکم الی بعض (نساء:۳)

حالانکہ ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میاں بی بی ہم صحبت ہو چکے) یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو (یعنی ان سے صحبت کی ہو)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ خدا شرمیلا اور شریف ہے' اسی لیئے اس نے جماع کو کنایتاً لمس (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے' اسلام نے اس کے لیئے جو الفاظ پیدا کیئے ہیں' جو فقہی مسائل کی تشریح میں مجبوراً آتے ہیں گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں' لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنائے اور استعارے ہیں' اسلامی تعلیمات کے مطابق پائخانہ' پیشاب اور دوسرے

نفرت انگیز اور شرمناک امراض کا ذکر بھی کنایۃً" کرنا چاہئے۔ پائخانہ اور پیشاب کے لیئے احادیث میں ''قضائے حاجت'' کا لفظ مستعمل ہے جو ایک کنایہ ہے' قرآن مجید میں اس کے لیئے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں۔

او جاء احد منکم من الغائط (نساء:۷)

یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہوکر) آیا ہو۔

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لیئے پست زمین کو پسند کرتے ہیں اس لیئے استعارتہ اس سے پائخانہ مراد لیا گیا۔

اس موقع پر یاد رکھنا چاہئے کہ پائخانہ بھی ایک استعارہ ہے' جس کے اصل پائیں خانہ ہے' چونکہ پائخانے عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں' اس لیئے استعارتہ "ان کو پائیں خانہ کہا گیا' پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پائخانہ ہوگیا' اور اب کثرت استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی' قرآن مجید میں خدواند تعالی نے ''برص'' کی تعبیر ''سوء'' کے لفظ سے کی ہے جس کے معنی برائی یا عیب کے ہیں۔

واضمم یدک الی جناحک تخرج بیضاء من غیر سوء آیہت اخری (طہ: ۱)

اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بغل میں رکھ لو (اور پھر نکالو) تو وہ بدوں اس کے کہ کسی طرح کا روک ہو' سفید (براق) نکلے گا (اور یہ) دوسرا معجزہ (ہے)۔

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح باب مایکرہ من ذکر الرجل۔

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوت غضبیہ سے ہے جس کا نام سب وشتم یا گالی گلوچ ہے اور یہ صورت عموماً جنگ وجدل کے موقع پر پیش آتی ہے' زمانہ حج میں چونکہ عام اجتماع ہوتا ہے' اور اس حالت میں لڑائی جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہے' اس لیئے

خداوند تعالیٰ نے ایک لفظ ''فسق'' سے اس کی ممانعت کی۔

فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج۔ (بقرہ:۲۵)

حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے' نہ فسق کی' نہ جھگڑے کی۔

گالی گلوچ کی مختلف صورتیں ہیں' بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے اس کے نسب میں عیب نکالتا ہے کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے' یہاں تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً برص یا جذام میں مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی برا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی برا برتاؤ کیا گیا ہے تو اس کا اظہار کرتا ہے۔

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہے۔

لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلم۔ (نساء: ۲۱)

اللہ کو بری بات کا پکار کر کہنا پسند نہیں مگر جس پر ظلم ہوا ہو (وہ ظلم کو برملا بیان کر سکتا ہے۔)

اور قرآن وحدیث میں جا بجا بد زبانی سے بچنے کے حکم ومصالح نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ ایک مصلحت یہ ہے کہ گالی گلوچ میں لوگ عموماً تعدی کرتے ہیں' یعنی اگر ایک شخص ایک گالی دیتا ہے تو دوسرا دو دیتا ہے' اگر ایک شخص کسی کے باپ کو برا کہتا ہے تو دوسرا اس کے باپ ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے' اس لیئے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریقہ ہے کہ کسی کو گالی نہ دی جائے خداوند تعالیٰ قرآن مجید کی اس آیات میں یہی نکتہ بیان کیا ہے۔

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم (انعام:۱۳)

اور (مسلمانو)! خدا کے سوا دوسرے جن معبودوں کو یہ پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے بڑھ کر خدا کو بڑا کہہ بیٹھیں گے۔

اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ ماں پر لعنت بھیجے' کہا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی اپنے باپ ماں پر کیونکہ لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا ''اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو برا بھلا کہے گا۔''(۱)۔

۲۔ بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں' حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملنے آیا۔ آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ ''اپنے قبیلہ میں یہ نہایت برا آدمی ہے۔'' لیکن جب وہ آپ کے پاس بیٹھا تو آپ ﷺ اس سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے' جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ جب آپ ~ صل۳~ نے اسکو دیکھا تو برا کہا' پھر اس سے نہایت لطف ومحبت کے ساتھ ملے' فرمایا ''عائشہؓ! تم نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ خدا کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اسکو چھوڑ دیں۔''(۱)۔

۳۔ بدزبانی دور وحشت و جہالت کی یادگار اور تہذیب وشائستگی کے خلاف ہے' ایک بار حضرت ابوذرؓ نے ایک غلام کو گالی دی' رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔(۲)۔ امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔

۴۔ رفق وملاطفت وشرم وحیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی

(۱)۔ بخاری کتاب الادب باب الالیسب الرجل والدیہ۔

تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی ان کے بالکل خلاف ہے ایک بار کچھ یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے ''السام علیکم'' (تم کو موت آئے) کہا حضرت عائشہؓ نے جواب میں کہا علیکم ولعنکم اللہ وغضب اللہ علیکم یعنی تم کو موت آئے' خدا تم پر لعنت بھیجے' اور تم پر خدا کا غضب نازل ہو' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا تو فرمایا ''اے عائشہ نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو۔'' (۳)۔

۵۔ گالی گلوچ کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کے سننے اور سنانے کی جرات پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یہی سبب ہے کہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا' ارشاد ہے کہ ''بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے' اور حیاء جس چیز میں ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے۔'' (۴)۔ اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے۔

۶۔ گالی گلوچ سے لوگوں کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے' حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہئے اسی لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں مردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لیئے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مردوں کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے۔ (۵)۔

۷۔ گالی گلوچ لڑائی کا پیش خیمہ ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے اس لیئے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق ضرور ہے اس لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

سباب المسلم فسوق وقتاله کفر (۲)۔

مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر۔

(۱)۔بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ولا متفحشا۔ (۲)۔ بخاری کتاب الادب باب ماینھی من الباب واللعن۔ (۳)۔ بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی فاحشا ولا متفحشا۔ (٤)۔ ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الفحش۔ (٥)۔ مسلم کتاب الایمان باب بیان تفاضل الاسلام ای امورہ افضل۔ (٦)۔ ترمذی ابواب البر والصلہ ماجا فی الشتم۔

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدزبانی اور فحاشی اسلامی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے' اس لیئے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے' وہ اس بداخلاقی میں مبتلا رہنا پسند نہ کرے گا اس لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لیس المئومن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی۔ (۱)۔

جو مسلمان ہے وہ طنز و تشنیع نہیں کرتا لعنت نہیں بھیجتا بدزبانی اور فحش کلامی نہیں کرتا۔

ایک اور حدیث میں بدزبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

یہ تمام وجوہ انسانوں کی باہمی گالی گلوچ اور لعن طعن سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس قسم کی بدزبانیاں صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں' بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزوں سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتے ہیں مثلاً جب کوئی شخص حوادث زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے' یہ نہیں سوچتا کہ ان میں زمانہ کا کیا قصور ہے یہ جو کچھ ہوا ہے مشیت الٰہی سے ہوا ہے اس بنا پر اسلام نے ان چیزوں کے برا بھلا کہنے کی بھی ممانعت کی ہے' اور اس مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ ''خدا کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے حالانکہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن

میرے ہاتھ میں ہیں۔'' (۴)۔یعنی زمانہ کو برا بھلا کہنا خود خدا کو برا بھلا کہنا ہے۔

ایک بار ایک شخص کی چادر کو ادھر ادھر اڑانے لگی' اس نے ہوا پر لعنت بھیجی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''اس پر لعنت نہ بھیجو' وہ تو صرف خدا کی فرمانبردار ہے۔'' (۵)۔

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اونٹنی کو الگ کر دیا اور یہ (۶)۔اس عورت کی سزا تھی تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے۔

اسلام میں گالی گلوچ کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغلظات سنائے جائیں' بلکہ وہ بات جس سے کسی کی توہین اور دلآزاری ہو گالی کسی کو فاسق یا کافر کہنا اگرچہ عرف عام میں گالی نہیں' لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے۔کیونکہ اگر وہ فاسق و کافر نہ ہوگا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے پر لوٹ آئے گی۔ (۷)۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہوگا تو اس کا کہنے والا فاسق و کافر نہ ہوگا' تاہم اگر اس کا مقصود محض اس شخص کی تفضیح و تشہیر ہو تو وہ گنہگار ضرور ہوگا۔ (۸)۔بہرحال اسلام نے جان و مال کی طرح ہر مسلمان کی عزت و آبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مقدس دن' ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر میں (یعنی حجتہ الوداع میں) ایک خطبہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ خدا نے

---

(۱)۔بخاری کتاب الادب باب ماینهی من السباب واللعن۔ (۲)۔ ترمذی ابواب البر والصله باب ماجا فی اللعنه۔ (۳)۔ بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق۔ (٤)۔ بخاری کتاب الادب لاتسبوا الدهر۔ (٥)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی اللعن۔ (٦)۔ ابوداؤد کتاب الجهاد باب النهی عن لعن البهیمته۔ (۷)۔ بخاری کتاب الادب باب ماینهی من السباب واللعن' و مسلم کتاب الایمان۔ (۸)۔

تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے جس طرح تمہارا یہ دن تمہارے اس مہینہ اور تمہارے اس شہر میں محترم ہے۔

رذائل پر مختصر تبصرہ

گزشتہ صفحوں میں جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی بداخلاقیوں اور بری عادتوں کو گنایا جا سکتا ہے، جن کی ممانعت اسلام میں کی گئی ہے مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورۂ بالا رذائل میں سے کسی کے تحت میں ہیں، اس لیئے ان کے پورے استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور چونکہ ان رذائل کے اخذ ورہیں خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہیں کی گئی ہے اس لیئے صرف ان ہی کے بیان پر قناعت نہیں کی گئی جن کو فلسفہ اخلاق کے مصنفوں نے رذائل میں شمار کیا ہے۔ بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اخلاق و عادات ذمیمہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔

اس فہرست پر ایک نظر ڈال لینے سے یہ بھید کھل جاتا ہے کہ اسلام نے تین اساسی برائیاں قرار دی ہیں اور جس قدر رذائل ہیں ان میں ہی تین میں سے کوئی برائی پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلی اساسی برائی عدم صدق ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان میں یکسانی نہ ہو، جھوٹ، غیبت، خلاف وعدگی، اتہام، بدگمانی، خوشامد، چغل خوری، دو رخاپن، جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں، دوسری اساسی برائی حب مال سے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہے بحالت حرص وطمع، چوری، غضب، خیانت، غلول، ناپ تول میں کمی بیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں تیسری اساسی برائی حب ذات ہے، اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر

معمولی شغف ہے' حسد تکبر' عجب فخاری غیظ وغضب' ظلم' کینہ وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں' اس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص ان تینوں اساسی برائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا' وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کر لے گا۔ یہ تینوں اساسی برائیاں ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہشیں ہیں جو ان سے اپنا دامن بچائے گا وہ جنت میں آرام پائے گا۔

واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی۔ (نازعات: ۲)

اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا' اور اپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا تو جنت اس کی آرام گاہ ہے۔

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے بولنے چالنے، کھانے پینے سونے جاگنے، نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جز ہیں، آداب کہلاتے ہیں، ان ہی آداب کی پابندی کے بدولت وحشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے ان کے آداب میں خوبی اور لطافت ملحوظ رکھنا حسن ادب ہے، اس کی پابندی سے اجتماعی اور معاشرتی امور میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے اور انسان مہذب شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کاموں کے بجالانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے جس سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے، اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہو جائے اور یا یہ کہ وہ کام خوبی، خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے، پیغمبر اسلام علیہ السلام نے اپنی عملی وقولی ہدایات سے مسلمانوں کے لیئے اس کا بہترین نمونہ قائم کر دیا ہے۔

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب وعوائد یعنی اپنی کیٹ کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں، عیسائی قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب و آئین یونان اور روم سے حاصل کیا، لیکن اسلام میں جو مذہب کا سرچشمہ ہے وہی اس کے آداب وعوائد کا ماخذ بھی ہے، اسی لیئے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لے کر جاتا ہے اور ان کو چند روز میں مہذب اور شائستہ بنا دیتا ہے۔

ہمارے محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارم اخلاق سے الگ کر دیا ہے اور ان کو کتاب الطہارۃ، کتاب الاطعمۃ، کتاب الاشربۃ، کتاب اللباس، کتاب الاستیذان، کتاب الاداب اور کتاب السلام میں درج کیا ہے، ہم صحاح وسنن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد کے ان ہی

ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

فطری آداب

اسلام دین فطرت ہے اس لیئے کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے یعنی فطرتاً وہ پسندیدہ ہیں' اور تمام انبیاء علیہم السلام نے ان کی پیروی کی ہے' یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں انسانوں کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے' اس کے بال بڑھتے ہیں' ناخن بڑھتے ہیں' بدن گندہ ہوتا ہے' کپڑے میلے ہوتے ہیں تو ان سب چیزوں کی اصلاح شائستہ اور ناشائستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں' حیا کرنا' عطر لگانا' مسواک کرنا' اور نکاح (۱)۔کرنا' ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے۔

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا' یعنی ستر عورت اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا' عطر لگانا اور مسواک کرنا' صفائی اور طہارت کے تمام اقسام کو بتاتا ہے' اور ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی مبارک نسل کی سنت ہے' یہاں تک کہ تورات کے بیان کے مطابق یہ خدا اور حضرت ابراہیم کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہے۔(۲)۔

(۱)۔ترمذی ابواب النکاح۔ (۲)۔ توراہ پیدائش۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی جب کہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے جن کو خصال فطرت کہتے ہیں امام بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے ختنہ کرایا مونچھیں ترشوائیں اور ناخن کٹائے۔(۱)۔ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خصال فطرت پانچ ہیں' ختنہ کرنا' موے زیر ناف اور بغل کے بال صاف کرنا اور ناخن اور مونچھیں ترشوانا' (۲)۔ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے

ہیں‘ مونچھ ترشوانا داڑھی بڑھانا‘ مسواک کرنا‘ ناک میں پانی ڈالنا‘ ناخن‘ ترشوانا‘ انگلیوں کے درمیان جوجگہ ہے اس کو دھونا‘ بغل کے بال بنوانا‘ موئے زیر ناف کو صاف کرنا‘ پانی سے استنجا کرنا‘ راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا غالباً کلی کرنا ہوگی۔(۳)۔

فطرت کے یہ آداب اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہیں چنانچہ وضو میں مسواک کرنا مستحب اور انگلیوں کا دھونا ناک میں پانی ڈالنا اور کلی کرنا‘ واجب قرار دیا گیا ہے۔

ناخن ترشوانا‘ بال بنوانا‘ مونچھیں ترشوانا‘ صفائی کے ضروری لوازم ہیں جن کے ناخن بڑے اور مونچھیں بڑی ہوتی ہیں وہ کھانے پینے کی ہر چیز کو گندہ کر کے کھاتے پیتے ہیں‘ جس سے نہ صرف دوسروں کو کراہت ہوتی ہے بلکہ خود ان کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے‘ یورپ میں ناخن بڑھانا اور ان کو ریت ریت صاف کرنا اور اسی طرح بعض لوگوں میں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے‘ مگر یہ دونوں باتیں صریحًا خلاف فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں۔

مونچھوں کے بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے مگر داڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے بلکہ اب تو داڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے‘ یہ تمام باتیں اسلامی شعار کے خلاف ہیں اور اس شعار کے مخالف ہیں جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کے لیے مقرر کیا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ (۴)۔ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ'' (۵)۔ ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرتمند مسلمانوں کا مذہبی

فرض ہے اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم و رواج کا واہمہ ہے، جس رنگ کی عینک لگائیے دنیا اسی رنگ کی نظر آئے گی۔

(۱)۔ایضاً۔ (۲)۔ باب الخشان الکبر۔ (۳)۔ صحیح مسلم باب خصال الفطرہ۔ (٤)۔ ایضاً۔ (٥)۔ صحیح مسلم خصال الفطرہ۔

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

طہارت اور اس کے آداب

تہذیب و شائستگی کی باتوں میں سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے' گو کہ اسلام ایک ایسے ملک میں ظاہر ہوا جہاں پانی نسبتًا بہت کم تھا' پھر بھی اس نے بعض خالص حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا' زن و شو کی ہم بستری کے بعد جب تک دونوں غسل نہ کرلیں نماز جو فرض ہے ادا نہیں ہو سکتی' فرمایا۔

وان کنتم جنبا فاطھروا (مائدہ: ۲)

اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو۔

کپڑے شرعی طور سے پاک ہوں' فرمایا:

و ثیابک فطھر۔ (مدثر: ۱)

تو پاک مٹی کا قصد کرو۔

جب نماز پڑھنا چاہیں تو پہلے ہاتھ منہ اور پاؤں دھولیں اور بھیگے ہاتھوں کو سر پر پھیر لیں اس کا نام وضو ہے۔

اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برئوسکم وارجلکم الی الکعبین (مائدہ: ۲)

جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں دھوؤ۔

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہا دھو کر جماعت میں شریک ہوں' تا کہ کسی کی گندگی بدبو سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف نہ ہو اور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجا کرنا اور عضو خاص و مقام خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھہرایا گیا' ان احکام سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ وہ خدا کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے:

ویحب المتطھرین۔ (بقرہ: ۲۸)

پیدا کرے گا۔

۵۔ عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرنا چاہئے' کیونکہ اس حالت میں یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑ جائیں' نیز بے ستری کا بھی امکان ہے اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے اگر یہ احتمالات نہ ہوں یا زمین پر بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے۔

۶۔ پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہئے کیونکہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑ سکتے ہیں۔

۷۔ غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہئے خصوصاً جب کہ وہ کچی ہو' کیونکہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹیں گندی اور ناپاک ہو کر اڑیں گی' اور بدن کو ناپاک کریں گی' یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل میں پیدا کریں گی۔

۸۔ بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہئے' ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھو لینا چاہئے' استنجا بائیں ہاتھ سے کیا جائے' اس میں داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے۔

۹۔ طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہئے۔ (۳)۔

۱۰۔ ہفتہ میں ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا' کپڑے بدلنا' عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہے۔ اسلام نے اس لیئے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے' جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگ دست اور پشمینہ پوش تھے' اور محنت مزدوری کرتے تھے' ان کی مسجد نہایت تنگ اور اسی کی چھت نہایت پست تھی' جو چھپر کی تھی' ایک بار گرم دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیئے آئے تو لوگوں کو اس پشمینہ میں پسینہ آیا اور اس کی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا کہ لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کرلیا کرو' اور ہر شخص کو جو بہترین تیل میسر ہو سکے لگائے۔ (۴)۔ جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بو دار چیز مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی۔ (۵)۔

(۱)۔ایضاً۔ (۲)۔ ایضاً۔ (۳)۔ یہ تمام مسائل کتب سنن کی کتاب الطھارہ میں دیکھئے۔ (۴)۔ ابوداؤد کتاب الطھارہ۔ (۵)۔ مسلم کتاب الصلوٰۃ۔

۱۱۔ جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہئے' چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں' تو فرمایا کہ اس کے پاس بال ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس کو پانی نہیں ملتا تھا' جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھولیتا۔ (۱)۔

اس کے ساتھ اسلام نے طہارت ونظامت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے' اور ایسی تعلیم نہیں دی جو تشدد' غلو اور وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے اس بنا پر اسلام نے بعض سختیوں کو دور کیا ہے جو اس معاملہ میں اور مذاہب میں پائی جاتی تھیں' مثلاً یہودیوں کے مذہب کی رو سے ناپاکوں کی پاکی کے لیئے ضروری تھا کہ نہانے کے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے تب نہانے والا پاک ہو' لیکن اسلامی تعلیمات کی رو سے انسان کو اس معاملہ میں صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہئے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر کپڑے پر نہ پڑنے پائیں' اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو کی درجہ تک پہنچ جاتی ہے چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ شدت احتیاط کی وجہ سے شیشی میں پیشاب کیا کرتے تھے کہ بنواسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے' لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی کرتے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (۲)۔

یہودیوں کے یہاں یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ویسئلونك عن المحیض قل ھوا ذی فاعتزلوا النساء فی المحیض ولا تقربو ھن حتی یطھرن فاذا تطھرن فاتو ھن (بقرہ:۲۸)

(اے پیغمبر! لوگ) تم سے حیض کے بارہ میں دریافت کرتے ہیں تو (ان کو) سمجھا دو کہ وہ گندگی ہے تو حیض کے دنوں میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک پاک نہ ہو لیں' ان سے مقاربت نہ کرو' اور جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ۔

اس کے مطابق آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وقاع کے علاوہ اس سے سب کام لے سکتے ہو' اور خود اپنے طرز عمل سے اس کی مثالیں قائم کر دیں' چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی' اور آپ کے سر کو دھوتی تھی' ایک بار آپ ﷺ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی میں نے معذرت کی تو فرمایا' یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔(۳)۔

ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً مسجد میں نہیں جا سکتے قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہ نے حالت جنابت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے

(۱)۔ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثواب۔ (۲)۔ صحیح مسلم کتاب الطھارہ باب المسح علی الخفین۔ (۳)۔ صحیح مسلم کتاب الطھارہ باب جواز غسل الحائض راس زوجھا۔

سے اجتناب کیا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان نجس نہیں ہوتا۔'' (۱)۔یعنی

مسلمان جنابت اور حاجت غسل سے ایسا نجس نہیں ہو جاتا تا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے۔

ایک عورت نے حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لمبے ہوتے ہیں اور میں گندے مقامات پر چلتی ہوں، یعنی زمین پر گھسٹنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو بولیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے (۲)۔ یعنی اس کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے، وہ اس نجاست کو زائل کر دیتی ہے، ایک عورت نے آپ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو رستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے جب بارش ہو تو ہم کیا کریں، فرمایا کہ اس کے بعد اس سے اچھا راستہ نہیں ہے؟ بولیں ہاں ہے، فرمایا تو وہ اس کی تلاش کر دیتا ہے، غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے اور پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں پاک کر سکتی ہے اسی لیئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ زمین میرے لیئے پاک کر دی گئی ہے اور اسی لیئے وہ حالت تیمم میں پانی کی قائم مقام ہو جاتی ہے جوتا زمین پر رگڑ لینے سے پاک ہو جاتا ہے۔

اسلام میں اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کر دیا، اور اس کو تمام صحابہؓ نے ایک برکت سمجھا۔

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھو لیئے جائیں، پھر کمر سے دھو کر نجاست دور کر لی جائے پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے، پہلے دونوں ہاتھ دھوتے پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہا کر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے، پھر وضو کرتے لیکن پاؤں نہیں دھوتے پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بالوں کی جڑوں کو ملتے، پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے (مسلم باب صفۃ غسل الجنابۃ)

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں ہے' اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہو سکتا تھا' لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لیئے ہر روز نہا لے تو مباح ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیہ وسلم پانچوں وقت کی نماز کی تمثیل میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے دروزاہ پر نہر بہہ رہی ہو' اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہایا کرے تو اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کھانے پینے کے آداب

۱۔کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھولینا چاہئے' کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگر چہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے' لیکن اگر پیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتو سوکر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے' اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا (۳)۔

(۱)۔ابوداؤد کتاب الطھارہ۔ (۲)۔ ایضاً۔

اورابوداؤد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے۔(۴)۔ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سوجائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا اور اس کو اس تساہلی پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہئے' اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اس کے لیئے ہے جس کی انگلیاں کھانے میں ملوث ہوتی ہوں۔

۲۔مسلمانوں کا ہر کام خدا کے نام سے شروع ہونا چاہئے جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے' اور دنیا کے سب کاموں میں کھانا جو زندگی کی بقا اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے' کتنا بڑا کام ہے' یہ کام خدا کے نام کے بغیر شروع نہیں ہونا چاہئے' اس لیئے کھانا کھانے پہلے بسم اللہ کہہ لینا چاہئے' صحابہؓ کہتے ہیں کہ جب ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپ ﷺ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے' لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا' آپ ﷺ نے اسکا ہاتھ پکڑ لیا' پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ جس کھانے پر خدا کا نام نہیں لیا شیطان اس کو اپنے لیئے جائز کر لیتا ہے۔

(۱)۔اور اگر کوئی شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بسم اللہ اولہ وآخرہ کہہ لے۔ (۲)۔

۳۔انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک وناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے' صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کاموں کے لیئے خاص کر دیے جائیں' چنانچہ سب اچھے کاموں کے لیئے داہنے ہاتھ کو اور دفع نجاست وغیرہ کے لیئے بائیں ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے' اس تخصیص میں ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے انسان کے زیادہ تر کام فطرتاً پاک اور مباح ہوتے ہیں اور دفع نجاست وغیرہ کے پہلو کبھی کبھی ہوتے ہیں' اس لیئے زیادہ تر کاموں کے لیئے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے' جدھر قلب نہیں ہے یعنی دایاں پہلو' تاکہ کام کے ہچکولوں اور جھٹکوں سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے' یہی وجہ ہے کہ ہر انسان فطرتاً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بایاں ہاتھ صرف اس کی مدد کے لیئے لگاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی' چستی اور طاقت ہوتی ہے' اسی لیئے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہئے۔(۳)۔ صرف کھانے پینے ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ شریعت نے اکثر باتوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے' ایک بار آپ ﷺ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا' مجلس میں آپ ﷺ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اور بائیں جانب حضرت ابوبکرؓ تھے' آپ ﷺ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب میں داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے۔(۴)۔

ایک بار آپ ﷺ کے دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے' آپ ﷺ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں' اس نے کہا کہ اپنا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا' مجبوراً آپ ﷺ نے پہلے اسی کو دیا۔(۵)۔

(۱)۔ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔ (۲)۔ ایضاً۔ (۳)۔ ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔ (۴)۔ صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔ (۵)۔ ایضاً۔

۴۔کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہئے بیچ سے نہیں کھانا چاہئے کیونکہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائے گی' گندی نہ ہوگی' دوسری یہ کہ برتن گندہ نہ ہوگا اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا' اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برکت سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے۔(۱)۔

۵۔اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو کر کے نہیں (۲)۔کھانا چاہئے کیونکہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے تا کہ کوئی دوسرا آ کر شریک نہ ہو جائے اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھالے' یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص وطمع پر دال ہے' اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے' اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہئے۔

۶۔کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہئے' کیونکہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنے والوں میں بات بات میں فیہ نکالنے والے کی طرف سے چڑھ اور نفرت پیدا ہوتی ہے' اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی بجائے اور بگڑتا ہے' اس لیئے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھالینا چاہئے' ورنہ چھوڑ دینا چاہئے۔(۳)۔

۷۔سب کا مل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسن معاشرت کا ذریعہ ہے اسی لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو پسند فرمایا ہے' کہ دوست احباب' یا گھر

کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں' جیسا کہ قرآن پاک میں ہے' الگ الگ کھانا بھی جائز ہے' اور ایک ساتھ بھی' (۴)۔ لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ برکت ہوتی ہے' اسی طرح زیادہ برا دنہیں ہوتا' کوئی تھوڑا کھاتا ہے' کوئی زیادہ کھاتا ہے بس مل کر برابر ہو جاتے ہیں' اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے' پھر اس سے گھر والوں کا ایثار ثابت ہوتا ہے اور گھر کے مالک کا تشخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے' مٹتا ہے' اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے ایک بار صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں لیکن آسودہ نہیں ہوتے' فرمایا غالبًا تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو' صحابہؓ نے کہا ہاں' فرمایا۔ ایک بار ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ پڑھ لو تو برکت ہوگی۔ (۵)۔

۸۔ کھانا ٹیک لگائے کے بیٹھ کر یا منہ کے بل لیٹ کر نہیں کھانا چاہئے۔ (۶)۔ کیونکہ روحانیت کے علاوہ طبی حیثیت سے اس لیئے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ میں اچھی طرح سے بہا رام نہیں پہنچتی ہے' کھانے کے لیئے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کر کے اور پاؤں کو گرا کر اسی پر بیٹھ کر کھایا جائے' یا دوزانوں بیٹھ

---

(۱)۔ ترمذی ابواب الاطعمہ باب ماجافی کراھتیہ لوکل فی وسط الطعام۔ (۲)۔ سنن ترمذی ابواب الطعام۔ (۳)۔ بخاری کتاب الاطعمہ نور۔ (٤)۔ ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔ (۵)۔ ایضًا۔ (٦)۔ ابوداؤد کتاب الاطعمہ و ابن ماجہ کتاب الاطعمہ و شرح سفر السعادہ فیروز آبادی للشیخ عبدالحق محدث دھلوی۔

کر' اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں تو اکڑوں بیٹھ کر کھایا جائے' یا دوزانوں بیٹھ کر' (۱)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کرتے تھے کہ ٹیک لگا کر نہیں کھاتا' میں بندہ ہوں' غلاموں کی طرح کھاتا ہوں' یعنی خاکساری سے۔ (۲)۔

۹۔ کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہئے' ادھر ادھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہئے' خصوصًا

آداب مجلس

آداب مجلس میں اصولی بات یہ ہے کہ مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو' اور شرکائے مجلس میں سے ہر ایک کا حق برابر ہوتا کہ یہ مجلس شرکاء کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو' ان ہی دو باتوں کو قائم رکھنے کے لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہیں۔

۱۔ مجلس میں انسان کو جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جائے' یعنی یہاں تک نشست کا دائرہ اس کے آنے تک پہنچ چکا ہے وہیں بیٹھ جانا چاہئے' یہ نہیں کرنا چاہئے کہ مجمع کو چیر کر خوہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے' کیونکہ اس سے ایک تو پہلے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے' اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے' صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے۔(۱)۔ انتہا یہ ہے کہ مسجدوں میں بعد کے آنے والے نمازیوں کے لیئے یہ سزاوار نہیں کہ وہ لوگوں کو روندتے ہوئے آگے کی صف میں بیٹھنے کی کوشش کریں' جمعہ کی نماز میں یہ خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے اس لیئے تخطی رقاب یعنی دوسروں کی گردنوں کو روند کر اور زیر قدم لا کر آگے بڑھنے کو جمعہ میں خاص طور سے منع کیا گیا ہے۔

۲۔ مجلس میں کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نہیں بیٹھنا چاہئے' کیونکہ اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا' کیونکہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا' اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہیں جاتا۔

۴۔ اگر مجلس میں دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔(۴)۔ کیونکہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس میں

بات چیت کرنے کے لیئے یا کسی اور مصلحت باہمی سے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں میں موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے ان کا الگ کر دینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے۔

۵۔ اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہئے ایسے شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے (۵)۔ کیونکہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف

---

(۱)۔ آداب المفرد باب یجلس الرجل حیث انتھی۔ (۲)۔ ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراھتیان یقلم الحرل من مجلسہ ثم مجلس فیہ۔ (۳)۔ ترمذی ابواب الاستیذان باب اذاقام الرجل من مجلسہ ثم وجع ھوا حق بہ۔ (٤)۔ ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراھتیہ الجلوس بین الرجلین بغیر اذنھا۔ (٥)۔ ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراھتیہ القعود وسط الحلقہ۔

اس کا منہ ہوگا اور لوگوں کی طرف پیٹھ ہوگی' جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے' یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں تا کہ سب کو ہنسا سکیں' اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے۔

۶۔ مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہئے' (۱)۔ کیونکہ یہ عجمیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر آقا کے اور رعایا بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی' اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈنڈا شرک سے مل جاتا ہے' اس طرح ایک شخص گویا خدا بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریوں اور عزت نفس کو فنا کر دیتے تھے جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جا سکتا۔

۷۔ راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہئے کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے اور ہر آیندو روند کو تکنا بداخلاقی ہے لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہئے' یعنی نگاہ نیچی رکھنا' ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے دور کرنا' سلام کا جواب دینا' نیکی کا حکم دینا' بری باتوں

سے روکنا اور راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا۔(۲)۔

۸۔انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے' اس لیئے اپنے ہم نشینوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے' ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے' اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے' اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روحیں ایک مخلوط فوج ہیں جن میں باہم آشنائی ہوتی ہے' ان میں الفت و موانست پیدا ہو جاتی ہے' اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے ان میں تفریق و اختلاف پیدا ہو جاتی ہے۔(۳)۔ایک مشہور مثل ہے کہ ''اگر کسی کے اخلاق پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ۔'' اس نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے' اس لیئے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے۔'' پھر فرمایا کہ اچھے ہم نشین اور برے ہم نشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی جیسی ہے' مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا' یا اس کو خریدو گے یا اس کی خوشبو پاؤ گے لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلائے گی۔یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بو پہنچے گی۔(۴)۔

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کی جائے کسی دوسرے کے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے فرمایا کہ ''اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے۔(۵)۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی میں بیٹھیں' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے اور لوگوں

(۱)۔ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی الجلوس فی الطرقات۔ (۳)۔ ادب المفرد باب الارواح جنود مجندہ۔ (٤)۔ بخاری کتاب البیوع باب فی العطار وبیع المسک۔

کو وہاں سے ذرا سرکنے' ور دوسروں کے لیئے جگہ بنانے کے لیئے کہا جائے تو وہ برا مانتے ہیں' اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو سکھایا' فرمایا۔

یایھا الذین امنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجلس فافسحوا یفسح اللہ لکم واذا قیل انشزوا فانشزوا یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجاتط واللہ بما تعملون خبیر۔ (مجادلہ: ۲)

اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی کرو تو کشادگی کرو' اللہ تعالیٰ تمہارے لیئے کشادگی کرے گا' اور اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ' تو اٹھ جاؤ' اللہ ان کے رتبے اونچے کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے۔

اسی طرح مجلس میں بیٹھ کر اس طرح آپس میں کانا پھوسی نہیں کرنی چاہئے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں' منافقوں کے اس طرز عمل کی برائی قرآن پاک نے برملا کی ہے۔

انما النجوی من الشیطن لیحزن الذین امنوا۔ (مجادلہ: ۲)

یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے کہ دلگیر کرے ایمان والوں کو۔

جہاں چند آدمی بیٹھے ہوں' وہاں کوئی دو آدمی آپس میں ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کو یہ برا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہم کو اس راز کے قابل نہیں سمجھا' دوسرے یہ کہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں اس لیئے ارشاد ہوا

کہ ''تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ اس سے تیسرا غمگین ہوگا۔

مجلس کی راز کی باتوں کو برملا نہیں بیان کرنا چاہئے کہ المجالس بالا مانتہ قول نبوی ﷺ ہے۔(۳)۔

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

آداب ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لیئے جانا ایک ثواب کا کام ہے' ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے' تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لیئے ایک مکان بنالیا۔ (۴)۔

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

ا۔ دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوشدلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہئے اسی لیئے فرمایا کہ ''تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا یہ بھی صدقہ ہے۔'' (۵)۔

ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن وسلامتی کا پیام ہو جس کو شریعت نے السلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے چھوٹے بڑے کو' بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں۔

---

(۱)۔ترمذی ابواب الاستیذان۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب الادب فی نقل الحدیث۔ (۳)۔ ایضاً۔ (٤)۔ ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی زیارہ الاخوان۔ (۵)۔ ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المراہ۔

دنیا کی تمام مخلوقوں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لیئے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا اور عرب کے لوگ ملاقات کے وقت انعم اللہ بک عینا وانعم صباحا۔ کہتے تھے کہ یعنی' تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔'' تمہاری صبح خوشگوار ہو۔'' امراو سلاطین کے لیئے دوسرے الفاظ تھے' ایرانی ''ہزار سال بزی'' (ہزار برس جیو) کا فقرہ کہتے تھے' یورپ کے لوگوں میں صبح کو ''گڈ مارننگ'' (اچھی صبح) شام کو ''گڈ ایوننگ'' (اچھی شام) رات کو ''گڈ نائٹ'' (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے' مگر اسلام نے ان سب کے بجائے السلام علیکم کا لفظ ایجاد کیا اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں۔

۱۔ یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیاء علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں والسلام علی (مریم) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں وسلام علی المرسلین (صفت) ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے دنیوی تمتعات مثلاً طول عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں، اور نہ محدود معین اوقات سے مقید ہے، اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے۔

۳۔ اس میں مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ اس سلامتی سے مقصود (جس کی طرف السلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے۔

۴۔ اس میں مبالغہ آمیز تعظیم نہیں پائی جاتی، جو بندگی، کورنش، آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشروع طریقوں میں پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس بن سعدؓ نے آپ ﷺ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں تو آپ ﷺ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم لوگ آپ ﷺ کو سجدہ کیا کریں، تو آپ ﷺ نے ان کو اس کی اجازت نہیں دی۔ ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ! جب ہم میں کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیئے جھک جائے، فرمایا ''نہیں'' اس نے کہا تو اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے، فرمایا ''نہیں'' (۱)۔ اس نے کہا کہ ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے، فرمایا ''ہاں''۔

۵۔ دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جا سکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال، آل و اولاد دنیا و آخرت ہر قسم کی سلامتی کو مشتمل ہے۔

۶۔ جب دو انسان آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے بیگانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے، اب

جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں' اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

(۱)۔یہ ممانعت اسی موقع سے مخصوص ہے جہاں کوئی شرعی مخذور ہو مثلاً ملنے والا مرد ہو یا شہوت انگیز صورت ہو۔

۷۔

اسلام نے اپنے پیروؤں کے درمیان اس کو گویا آپس میں پہچان کی علامت اور ''واچ ورڈ'' مقرر کیا ہے آمنے سامنے جب دونوں سے یہ لفظ نکلتے ہیں تو دونوں اپنے سینوں میں ہزار بیگانگی کے باوجود آشنائی کی لہر پاتے ہیں اور آپس میں محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں' یہ بتایا ہے کہ دونوں ایک ہی ملت محمدیہ کے ایمانی فرزند ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی۔

یاایھا الناس افشوا السلام و اطعموا الطعام و صلوا والناس ینام تد خلوا الجنہت لبسلام۔ (۱)۔

لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ کھانا کھلاؤ' اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو' یہ سب کرو گے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض و غایت بھی بیان فرمادی اور فرمایا کہ تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ۔(۲)۔

سلام کرنے کے لیئے شناسا و غیر شناسا' جانے اور انجانے کی تخصیص نہیں۔(۳)۔ مرد اور عورت کی تفریق نہیں (۴)۔ بڑے اور بچہ کی تمیز نہیں' (۵)۔ البتہ اسلام نے سلام کی ابتدا کرنے کے لیئے دو اصولوں کو ملحوظ رکھا ہے جو تمام متمدن قوموں میں رائج تھے' ایک یہ کہ چھوٹا ادب و احترام کا لحاظ کرے' اور اس اصول کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو' گزرنے والا بیٹھنے والے کو اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے' دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ تواضع و خاکساری کا اظہار ہو اس اصول کی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہئے۔(۶)۔

اس مصالح کے لحاظ سے آپ ﷺ نے اپنے اہل و عیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا۔(۷)۔ مجلس سے اٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہئے۔(۸)۔ سلام میں رحمتہ اللہ و برکاتہ' کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے چنانچہ ایک بار ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا السلام علیکم ''آپ ﷺ نے فرمایا'' اس کو بیس نیکیاں ملیں۔'' دوسرا آدمی آیا تو کہا السلام علیکم و رحمتہ اللہ آپ ﷺ نے فرمایا ''اس کو تیس نیکیاں ملیں''(۹)۔

---

(۱)۔ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجا فی المصافحہ۔ (۲)۔ ترمذی ابواب الزھد ص ۴۰۹۔ (۳)۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجا فی افشار السلام۔ (۳)۔ بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفتہ۔ (۴)۔ بخاری کتاب الاستیذان باب تسلیم الرجال علی النساء و النساء علی الرجال۔ (۵)۔بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم علی الصبیان۔ (۶)۔ کتاب الاستیذان باب فی تسلیم الراکب علی الماشی۔ (۷)۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب فی التسلیم اذا دخل بیتہ۔ (۸)۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب التسلیم عندالقیام و القعود۔ (۹)۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب ما ذکر فی فضل السلام۔

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریقہ سے بلکہ اس

سے بہتر طریقہ سے دے' یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہیں ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے' ورنہ کم ازکم وہی الفاظ دہرا دے چنانچہ خود قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہے۔

واذا حییتم بتحیہت فحیوا باحسن منھا اور دوھا۔
(نساء: ۱۱)

اور (مسلمانو)! جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب میں) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو' یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو۔

اس سے کم الفاظ کا جواب دینا اگرچہ فقہا کے نزدیک جائز ہے لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ تحسانا یہ ناکافی ہے۔

۲۔ ملاقات کے وقت اظہار محبت اور اظہار مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے اور اس سے اسلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے' اس لیئے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جزو قرار دیا' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے' (۱)۔ مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہل یمن لائے (۲)۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو قبول کرلیا اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا' بعض حالات میں ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ممانعت آئی ہے لیکن اگر کوئی شرعی مخدور نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے' چنانچہ ایک بار حضرت زیدؓ بن حارثہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کو گلے لگا لیا اور ان کا بوسہ لیا۔ (۳)۔

کسی محبوب ومحترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوش محبت اور جوش عقیدت میں کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہیں' حضرت فاطمہؓ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتی تھیں تو آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے تھے' ان کا ہاتھ چومتے تھے اور اپنی جگہ

ان کو بٹھاتے تھے' اور جب آپ ﷺ ان کے یہاں آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھیں' ایک موقع پر جب حضرت سعد بن معاذؓ جو بیمار اور زخمی تھے' آئے تو آپ ﷺ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھ کر جائیں اور ان کو لے آئیں۔(۴)۔

دوسری قوموں میں ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے' اسلام نے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا' ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیروں اور بادشاہوں کے لیئے کھڑے ہوتے تھے' اور اس طرح کھڑے رہ جاتے تھے' آپ ﷺ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے لیئے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو' جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں۔ (۵)۔

اس قسم کے موقعوں پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً کہنے کی مثالی بھی شریعت میں موجود ہے۔(۶)۔

۳۔

ملاقات یا کسی اور کام کے لیئے کسی کے گھر میں جانے کے لیئے صاحب خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں دیا ہے:

(۱)۔ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجا فی المصافحہ۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی المصافحہ۔ (۳)۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجا فی المعانقہ والقبلہ۔ (٤)۔ یہ دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الادب باب ماجا فی القیام میں ہیں۔ (٥)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل۔ (٦)۔ ترمزی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی مرحبا۔

یایھا الذین امنوا لاتدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا وتسلموا علی اھلھا ذلکم خیر لکم لعلکم تذکرون فان لم تجدوا فیھا احدا فلا تدخلوھا حتی یوذن لکم وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا ھو ازکی لکم واللہ بما تعملون

کے گھر میں تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہیں۔ (۵)۔ ایک بار کسی نے آپ ~ صل۳ ~ کے حجرہ میں تاک جھانک کی' آپ ~ صل۳ ~ اس وقت ایک لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے' فرمایا اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمہاری آنکھوں میں کونچ دیتا پھر فرمایا انما جعل الاذن من قبل البصر ہ انما جعل الاستیذان من اجل البصر یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لیئے ہے کہ اس کو دیکھو نہیں۔ (۶)۔

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے یہ کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں۔ (۷)۔ تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہئے۔ (۸)۔ البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت

---

(۱)۔ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المنہی عن لادخول علی النساء الا باذن ازواجھن۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب الاستیذان فی عورات الثلاث۔ (۳)۔ ادب المفرد باب کیف یقوم عندالباب۔ (٤)۔ ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان۔ (۵)۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالتہ البیت و بخاری کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم فعقوا عینیہ فلا دیتہ لہ۔ (٦)۔ اس کتاب کے صفحہ ۸۸ میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھے گئے ھیں۔ مگر صحیح لفظ یہ ھیں جو یہاں نقل کیے گئے ھیں دیکھئے صحیح بخاری الاستیذان' باب الاستیذان من اجل البصرو کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم۔ (۷)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی استیذان۔ (۸)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب کم مرہ لسیلم الرجل فی الاستیذان۔

نہیں' (۱)۔ اگر کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے' (۲)۔ دوکانوں میں جانے کیلئے اور اسی قسم کے دوسرے پبلک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں' خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کر کے جانا چاہئے' اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کے حالت می ہوں گی یا گھر میں غیر محرم عورتیں آ گئی ہیں تو وہ

ہوشیار ہو جائیں۔

یہ آداب تو اجنبی اور نا آشنا لوگوں کیلئے تھے' لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں' اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں' مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے' یا لونڈی غلام' اس لیئے اگر ان کے لیئے بھی بروقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہوگی' البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں لوگ اکثر بے پردہ رہتے ہیں' ان کیلئے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے' اور خود قران مجید نے ان اوقات کی تعیین کر دی ہے یعنی نماز عشاء کے بعد سے نماز صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے' اور دوپہر کو جب قیلولہ کیلئے کوئی لیٹے کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے فرمایا:

یاایھاالذین امنوا لیستا ذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلث مرات من قبل صلوہت الفجر و حین تضعون ثیابکم من الظھیرہت ومن بعد صلوہت العشاء ثلث عورات لکم لیس علیکم ولا علیھم جناح بعد ھن طوافون علیکم بعضکم علی بعض' کذلک یبین اللہ لکم الایات واللہ علیم حکیم۔ واذا بلغ الاطفال منکم الحلم فلیستا ذنوا کما استاذن الذین من قبلھم (نور:۸)

مسلمانو! تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی غلام) اور تم سے جو سن بلوغ کو نہیں پہنچے' تین وقتوں میں تمہارے پاس آنے کی تم سے اجازت لے لیا کریں (ایک تو) نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب تم دوپہر کو (سونے کیلئے معمول کے مطابق) کپڑے اتار دیا کرتے ہو اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد (یہ) تین وقت تمہارے پردے کے وقت ہیں' ان (اوقات) کے سوا نہ (تو بے اذن آنے دینے میں) تم پر کچھ

گناہ اور نہ (بے اذن چلے آنے میں) ان پر (کچھ گناہ کیونکہ وہ) اکثر تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں (اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لونڈی غلاموں کو) بعض (یعنی تمہارے پاس آنے جانے کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے) تو بار بار اذن مانگنے میں تم لوگوں کو بڑی تکلیف ہوگی) یوں اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے' اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے اور (مسلمانو)! جب تمہارے لڑکے حد بلوغ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھروں میں آنے کیلئے) اذن مانگا کرتے ہیں' اس طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہئے۔

(۱)۔ادب المفرد باب دعاء الرجل ادنه۔ (۲)۔ ادب المفرد باب مالا یستاذن فیه۔ (۳)۔ ادب المفرد باب الاستیذان فی حوالیت السوق۔

آداب گفتگو

آداب گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتیں کرو۔

فتولا له قولا لينا (طه: ۴۴)

تو تم ان سے نرم بات کہنا۔

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو، فائدہ مند، اس کے کہنے میں اپنا یا دوسرے کا نفع ہو، اسی لیے فرمایا:

وقولوا للناس حسنا (بقره: ۸۳)

اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

مجلس میں بیٹھیں تو ایسے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں آتے تو اسی قسم کی باتیں کہتے انظرنا (ہمارا خیال کیجئے) کی جگہ راعنا کہتے جس میں تخفیف کا چھپا پہلو نکلتا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے باز رکھا، فرمایا:

يا ايها الذين امنوا لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا۔ (بقره: ۱۰۴)

اے ایمان والو! راعنا نہ کہو انظرنا کہو۔

اس کی پوری تفصیل سورۂ نساء رکوع ۷ میں ہے۔

باتیں ایسی کرنی چاہئیں جو منصفانہ اور درست ہوں، اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھیں تو آپس میں جھگڑا بہت کم ہو اور لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو فرمایا۔

يا ايها الذين امنوا اتقوا الله وقولوا قولا سديدا يصلح لكم اعمالكم ويغفر لكم ذنوبكم۔ (احزاب: ۷۰)

اے ایمان والو! خدا سے تقوی کرو، اور بات سیدھی کہو، اللہ

تمہارے کاموں کو سنوارے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا۔

عورتوں کو جب نامحرم مردوں سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات میں اور لہجہ میں ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو فرمایا:

فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبه مرض وقلن قولا معروفا۔ (احزاب: ۳۲)

تو (اے نبی کی بی بیو) زبان سے بات نہ کیا کرو ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کسی طرح کا کھوٹ ہے وہ خدا جانے تم سے کسی طرح کے توقعات پیدا کرے گا اور بات کرو تو معقول بے لاگ۔

مردوں کو نرم، معقول اور دلجوئی کے ساتھ باتیں کرنے کی تاکید آئی اور اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا ہے فرمایا:

قول معروف و مغفرة خیر من صدقة یتبعها اذی۔ (بقرہ: ۲۶۳)

نیک بات کہنی اور درگذر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔

بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے، فرمایا۔

واغضض من صوتك ان انكر الاصوات لصوت الحمیر۔ (لقمان: ۱۹)

اور کچھ اپنی آواز پست کر، کہ سب آوازوں میں بری آواز گدھوں کی ہے۔

فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے، مسلمانوں کی صفت یہ ہو۔

والذین هم عن اللغو معرضون۔ (مؤمنون: ۳)

اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے اس پر خدا کا فرشتہ گواہ رہتا ہے' خدا فرماتا ہے۔

مایلفظ من قول الا لدیہ رقیب عقید (ق:۲)

آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا' لیکن ایک نگران اس پر حاضر رہتا ہے۔

اس لیئے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے۔'' (۱)۔ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضور ﷺ کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں' کیونکہ جب ہم بری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے' ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو ادھر توجہ نہ دے۔ (۲)۔ یہ حدیث ان جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں مگر درحقیقت اس کوزہ میں دریا بند ہے مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بن جائیں۔

زبان انسان کو اظہار مطلب کے لیئے ملی ہے' اسی لیئے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد و معنی درست اور صحیح ہوں پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض اللغو میں داخل ہیں' اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے دیا جائے۔

واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما (فرقان:۶۳)

اور جب ناسمجھ ان کو خطاب کریں تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں۔

گفتگو ضرورت کرنی چاہئے' احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول باتیں کرتے ہوں' اور بکواس میں مبتلا رہتے ہوں' اور فرمایا ہے کہ ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہیں (۳)۔ یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تا قیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تا قیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے' (۴)۔ یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رخ

(۱)۔ کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار والضیف۔ (۲)۔ موطا وشرعہ للباجی باب ماجاء فی الصدق والکذب و ترمذی کتاب الزھد۔ (۳)۔ ادب المفرد باب فضول الکلام۔ (٤)۔ موطا امام مالك باب بومربہ من التحفظ فی الکلام۔

کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا ادھر پھر جاتا ہے یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی' اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں' اسی لیئے آیا ہے کہ جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا وہ جنت میں جائے گا۔(۱)۔

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے' بلکہ اس کو دہرا کر کہا جائے تا کہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے اسی غرض سے جب رسول اللہ ﷺ کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے' (۲)۔ اور گفتگو اتنی جلدی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے' ایک بار حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرہ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی' حضرت عائشہؓ نے اعتراض کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے' بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا'

حضرت جابرؓ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں ترتیل و ترسیل پائی جاتی تھی، یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا، اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے، اسی مفہوم کو حضرت عائشہؓ اس طرح ادا فرماتی ہیں۔

کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلا ما فصلا یفھمہ کل من سمعہ۔

رسول اللہ ﷺ کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا اور جو شخص اس کو سنتا تھا سمجھ لیتا تھا۔

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہئے، ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کیلئے بہتر ہوتا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں کیونکہ اختصار بہتر ہے۔ (۳)۔

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر و مباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے، بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے، ان اغراض کے حاصل کرنے کے لیئے لوگ نہایت مسجع، مقفّٰی اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہیں گفتگو کو طول دیتے ہیں، چبا چبا کے باتیں کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام باتوں کی ممانعت کی اور فرمایا کہ ''خدا اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہے۔'' نیز فرمایا کہ'' جو شخص اسلوب کلام میں اس لیئے ادل بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے خدا قیامت کے دن اس کا فدیہ و توبہ قبول نہ کرے گا۔ (۵)۔

جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف منہ کیا جائے تا کہ دوسروں کو عدم التفات کی شکایت نہ

پیدا ہو جائے۔(٦)۔

(١)۔موطا' امام مالك باب ماجاء فی مایخاف من اللسان۔ (٢)۔ ابوداؤد کتاب العلم باب تکریم الحدیث۔ (٣)۔ ابوداؤد کتاب العلم باب فی سرد الحدیث۔ (٤)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب الهدی فی الکلام۔ (٥)۔ ابوداؤد کتاب باب ماجاء فی المتشدق فی الکلام۔ (٦)۔ یعنی حق کی تبلیغ نہیں بلکہ اپنی تعریف کرانی مقصود ہو۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ میں متانت، سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہئے، خدا نے اچھے مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا ہے۔

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا۔ (فرقان:۶۳)

اور رحمت والے خدا کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں۔

اکڑ کر نہیں چلنا چاہئے، یعنی چال میں غرور تکبر کے انداز نہ ہوں، فرمایا:

ولا تمش فی الارض مرحا انك لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا۔ (بنی اسرائیل:۳۷)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چل (کہ اس طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ سکتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

ولا تمش فی الارض مرحا ان اللہ لا یحب کل مختال فخور۔ (لقمان:۱۸)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ مغرور اور فخار کو پسند نہیں کرتا۔

عورت کو بجنے والا زیور مثلاً پازیب، چھڑے یا جھانجھ پہن کر چلنے میں زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں رکھنا چاہئے کیونکہ اس کی آواز سے سننے والوں میں انتشار خیال پیدا ہوتا ہے، عرب کی عورتیں مردوں کے سامنے سے گزرتی تھیں تو اپنے پازیب کی آواز سنانے کے لیئے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں اس لیئے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا:

ولا یضربن بارجلھن لیعلم مایخفین من زینتھن

(نور: ۴)

اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو۔

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپائے، جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب و زینت کی ساری چیزیں چھپ جائیں اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منہ پر بھی آ جائے تاکہ ہر مرد کو معلوم ہو جائے کہ یہ شریف خاتون ہے لونڈی نہیں، پھر نگاہیں شرم سے جھکی رہیں۔

یایھا النبی قل لا زواجك وبنتك ونسا ء المئومنین یدنین علیھن من جلا بیبھنط ذلك اوفی ان یعر فن فلا یئوین (احزاب: ۸)

اے پیغمبر! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو کہہ دے کہ نیچے لٹکائیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں اس سے لگتا ہے کہ پہچانی پڑیں تو کوئی نہ ستائے۔

(۱)۔ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المتشدق فی الکلام۔ (۲)۔ ادب المفرد باب اذا حدث الرجل لایقبل علی واحد۔

وقل للمئومنت یغضضن من ابصار ھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ماظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن۔ (نور: ۴)

اور اے پیغمبر! ایمان والیوں کو کہدے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں، اور اپنا ستر چھپائیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں مگر جو (فطرہ) کھلا رہتا ہے اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں، اور اپنا سنگھار نہ دکھائیں، لیکن شوہر (وغیرہ محرم) کو (آخیر تک پڑھئے)

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہئے، کیونکہ اس سے میلان

طبع پیدا ہوتا ہے' اور عورت کا یہ خیال برملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں' اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافت نسوانی کے خلاف ہے۔

راستہ میں مرد اور عورت کو مل جل کر نہیں چلنا چاہئے' اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے عورتوں کو وسط راہ سے الگ ہو کر راستہ کے کنارے سے چلنا چاہئے۔ ایک بار راستہ میں مرد اور عورت باہم مل جل گئے۔ تو آپ ﷺ نے یہ حکم دیا' اور اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ عورتیں راستہ کی ادھر ادھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگیں۔ (۱)۔

راستہ چلنے میں ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہئے' یہاں تک کہ اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت میں ملنے کے لیئے متانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہئے' آنحضرت صلی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آ کر جماعت میں ملو۔ (۳)۔

مقدور ہو تو پاؤں کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لیئے جوتے پہنے جائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اکثر جوتے پہنا کرو' یعنی جوتے پہن کر چلا کرو' کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے۔ (۴)۔

جوتے دونوں پاؤں میں پہن کر چلنا چاہئے' یا دونوں پاؤں ننگے رہیں یعنی یہ نہیں کرنا چاہئے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں ننگا ہو۔ (۵)۔ کیونکہ یہ اداب و وقار کے خلاف ہے' ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھیں گے لیکن اگر گھر میں کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہیں۔ (۶)۔

آداب سفر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس زمانہ میں سفر فرمایا اسوقت زمانہ کے حالات اور سواریوں کے طریقے اور تھے' اس لیئے اس کے آداب عرب کی زمین عرب کی آب وہوا' اور عرب کی عام اگلی حالت سے

(۱)۔یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خاتون ہیں' ان کو کوئی راستہ میں چھیڑے نہیں۔(۲)۔ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق۔(۳)۔صحیح مسلم باب استحباب ایتان الصلوٰۃ بوقار۔(۴)۔ابوداؤد باب الانقال۔(۵)۔ایضا۔(۶)۔ترمذی کتاب اللباس باب المشی فی نعل واحدۃ۔

موزونیت اور مطابقت رکھتے تھے' عرب کی زمین خشک بنجر اور پتھریلی' پانی کی قلت ہو کی گرمی' دھوپ کی تمازت' قتل و غارت گری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ' ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتیں کی ہیں جن میں سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے بالخصوص دیہات وقصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہو سکتے ہیں جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے' اور صحرا اور بیابان کے راستوں میں ضرورت زندگی کے وہ ساز و سامان میسر نہیں آتے جن کی اسٹیشنوں اور ہوٹلوں میں بہتات ہوتی ہے۔

۱۔سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہئے' اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہئے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہئے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے۔(۱)۔

استودع اللہ دینکم و امانتکم وخواتیم اعمالکم۔

یعنی تمہارے دین' امانت اور خاتمہ عمل کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

۲۔سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہئے۔(۲)۔اس سے انسان کا وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ پورا دن کام میں آجاتا ہے اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے اور ایک معتد بہ مسافت طے کرکے دوپہر کے وقت آرام کرسکتا ہے۔

۳۔سفر تنہا نہیں کرنا چاہئے بلکہ کم ازکم تین آدمی ساتھ ہونے چاہئیں۔(۳)۔اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے' اور اسباب سفر کی حفاظت ونگرانی میں سہولت پیدا ہوجاتی ہے۔

۴۔اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو ان میں ایک کو اپنا امیر بنالینا چاہئے۔(۴)۔اسی شخص کو کاروان سالار کہتے ہیں۔

۵۔سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہئے' بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہئے۔(۵)۔

۶۔اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہئے۔(۶)۔

۷۔سفر رات کو کرنا چاہئے' حدیث میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے'(۷)۔اوپر درحقیقت لو' گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے' بہر حال عرب کی سرزمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لیئے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے' صبح کا وقت اور رات کا وقت'

---

(۱)۔ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعا مالوداع۔(۲)۔ ابوداؤد کتاب الجہاد فی الابکار فی السفر۔(۳)۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الرجل یسافر وحدہ۔(٤)۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی القوم یسافرون یومرون احدھم۔(٥)۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق۔(٦)۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی اتعلقی۔(۷)۔ ابوداؤد

۸۔مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہئے۔

۹۔رات کو مقام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہئے' کیونکہ راستہ سے جانور گزرتے رہتے ہیں' اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ (۱)۔

۱۰۔جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آ جانا چاہئے' کیونکہ سفر بہر حال تکلیف اور بے اطمینان کی چیز ہے۔(۲)۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

آداب خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے:

و من آیاته منامکم باللیل (روم:۳)

اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے۔

سورۂ فرقان میں فرمایا:

وھو الذی جعل لکم الیل لباسا و النوم سباتا وجعل النھار نشورا۔ (فرقان:۵)

اور اسی نے تمہارے لیئے رات کو پردہ اور نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا۔

سورۂ نباء میں ہے۔

وجعلنا نومکم سباتا و جعلنا الیل لباسا وجعلنا النھار معاشا (نباء: ۱)

اور ہم نے نیند کو تمہارے لئے آرام اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار بنایا۔

ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لیئے رات کا وقت ہے اور دن کا وقت کاروبار اور محنت کے لیئے ہے یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گزرے البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہل عرب آرام کرتے تھے جس کو قیلولہ کہتے تھے جس کا ذکر سورۂ نور۔ ع ۸ میں ہے: حین تضعون ثیابکم من الظھیرہ اور رات آرام میں گذاری جائے اور ہو سکے تو اس کے کچھ حصوں میں خدا کی یاد کی جائے جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہیں وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں یہاں تک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے (۳)۔

یہ تو عام افراد کے لیئے ہے لیکن خاصان خدا ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے۔

کانوا قلیلا من الیل مایھجعون (ذاریات: ۱)

یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے۔

---

(۱)۔مسلم کتاب الامارہ باب مراعاہ مصلحتہ الدواب فی السیر والنھی عن التعریس فی الطریق۔ (۲)۔ مسلم کتاب الامارہ باب السفر قطعتہ من العذاب۔ (۳)۔ بخاری کتاب النکاح۔

۱۔سنت نبوی ﷺ نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتادئے ہیں' نماز عشاء پڑھنے سے پہلے سونا نہیں چاہئے کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے' اور نماز عشاء پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہئے۔(۱)۔ یہ اس لیئے تا کہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے' اور آخیر وقت میں خدا کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سے غشی نہ ہو۔

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نماز عشاء کے بعد اس کے لیئے بات چیت کرنا منع نہیں' چنانچہ حضرت ابو بکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں نماز عشاء کے بعد بعض ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں اور آپ نے بات چیت فرمائی ہے۔ (۲)۔

۲۔احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہئے پھر داہنی کروٹ لیٹنا چاہئے۔(۳)۔

۳۔ایسی چھت پر نہیں سونا چاہئے جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی (۴)۔ ہو کیونکہ ایسی حالت میں زمین پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے۔

۴۔پاکی کی حالت میں سونا چاہئے' بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے۔(۵)۔

۵۔پیٹ کے بل نہیں سونا چاہئے' ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک

شخص کو اسی طرح سوئے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سونے کا یہ طریقہ خدا کو پسند نہیں۔ (۶)۔

۶۔ایک پاؤں کو اٹھا کر اس پر دوسرے پاؤں کو رکھ کر لیٹنا نہیں چاہئے۔ (۷)۔کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہ بند باندھتے تھے اس لیئے اس میں کشف عورت کا احتمال ہے البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے' کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طریقہ سے لیٹے تھے۔(۸)۔

۷۔سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہئے' کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہئے' چراغ کو بجھا دینا چاہئے کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو اٹھا لے جاتے ہیں' جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے یہی حال آگ کا بھی ہے' ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا آگ تمہاری دشمن ہے' جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو (۹)۔

۸۔سوتے اور سو کر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہئے' سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے۔

اللھم باسمك احیی و امرت

(اے اللہ! میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں۔)

---

(۱)۔ابوداؤد کتاب الادب باب النھی عن السمر بعد العشاء۔ (۲)۔ صحیح مسلم باب اکرام الضیف۔ (۳)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عندالنوم۔ (٤)۔ ابوداؤد کتاب الادب فی النوم علی سطح غیر محجر۔ (٥)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب مقال عند النوم و باب فی النوم علی ظھارہ۔ (٦)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی الرجل ینطح علی۔ (۷)۔ ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراھتیہ فی ذلك۔ (۸)۔ ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی وضع احدی الرجل علی الاخری مستلقیا۔ (۹)۔ بخاری کتاب الاستیذان باب لا تیرك النار فی البیت عندالنوم و باب باللیل' مگر یہ اس حالت کے متعلق ہے جب

گھر کی چھتیں پست ہوں اور بتی کا پرانا دیا جلایا جائے۔

اور جاگے تو کہے:

الحمد لله الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیه النشور

اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا' اور جس کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔

حدیثوں میں اس موقع کے لیئے اور بہت سی موثر دعائیں منقول ہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

آداب لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں' ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی' جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے' اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہئے وہ چھپے رہیں' اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو' اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جز ٹھہرایا' یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

مردوں کے لیئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے لیئے سر کے بالوں سے لے کر ٹخنوں سے گٹوں تک اور لونڈیوں کے لیئے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا۔ (۱)۔ جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں' یہاں تک کہ تنہائی میں ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں' ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو' فرمایا' خدا تو دیکھتا ہے' اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہئے۔ (۲)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کبھی ننگے نہ ہو' کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں تو ان سے شرم کرو' اور ان کا لحاظ رکھو۔ (۳)۔

حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کو بہشت میں جو بہشتی جوڑے ملے تھے' خدا کی نافرمانی کرنے سے وہ ان کے بدن سے اتر گئے تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھپانے لگے۔

فلما ذاقا الشجرة بدت لهما سوآتهما وطفقا يخصفان عليهما من ورق الجنة (اعراف: ۲)

تو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا' ان کے ستر ان پر کھل گئے تو اپنے اوپر درخت کے پتوں کو جوڑنے لگے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت بتائی ہے مگر دنیا میں آ کر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی، جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرمگاہوں تک محدود کر لیتی ہیں، عرب میں بھی یہی حال تھا، بلکہ حج میں انہوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورتیں خانہ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے (۵)۔ ورنہ یونہی ننگے پھرا کرتے تھے، وحی الٰہی نے انسانوں کو تہذیب وسلیقہ کا یہ سبق دیا۔

(۱)۔ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عندالنوم۔ (۲)۔ عورت کا چہرہ، قدم اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں۔ (۳)۔ سنن ترمذی للبواب الاستیذان والادب باب مجاء فی حفظ العوراۃ۔ (٤)۔ ایضاً باب ماجاء فی الاستئذان۔ (٥)۔ صحیح مسلم و طبری تفسیر آیات ذیل۔

یبنی ادم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سواتکم و ریشا ط و لباس التقوی ذلک خیر ط (اعراف:۳)

اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری ستر اور زینت کا سامان اور پرہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔

یبنی ادم خذوا زینتکم عند کل مسجد۔ (اعراف:۴)

اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو۔

قل من حرم زینت اللہ التی اخرج لعبادہ۔ (اعراف:۴)

کہدے! کس نے اللہ کی یہ زینت کو جس کو اس نے بندوں کے لیئے پیدا کیا ہے، منع کیا ہے۔

قل انما حرم ربی الفواحش ماظھر منھا و ما بطن

(اعراف: ۴)

کہہ دے کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی منع کیا ہے۔

ان آیتوں میں جس بے حیائی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ برہنگی ہے' اور جس زینت کا اختیا کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ستر پوشی ہے' ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے' پہلی آیت کے آخر میں لباس کے باب میں اصول کلیہ کی صورت میں ایک بلیغ فقرہ ہے جو بہت سی جزئیات کو حاوی ہے۔

ولباس التقوی ذلك خیر (اعراف:۳)

اور پرہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔

پرہیز گاری کے لباس سے کیا مقصود؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان' دوسروں نے' اعمال صالحہ اور یا شرم و حیا مراد لی ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہئے' اسی لیئے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے' مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباس تقوی قرار دیا ہے' کسی نے اس سے زہد و ورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں' (۱)۔لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہونا ہے' صحیح یہ ہے کہ لباس التقوی سے تقوی اور پرہیز گاری ہی کا لباس مراد ہے' یعنی وہ لباس پہننا چاہیئے جو تقوی اور پرہیز گاری کا منشا ہے' اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے' شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمہ قرآن کے حواشی میں لکھتے ہیں:

''اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیز گاری ہو' مرد لباس ریشمی نہ پہنے' اور دامن دراز نہ رکھے' اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے اور عورت بہت باریک نہ پہنے کہ لوگوں کو نظر آوے اور اپنی

زینت نہ دکھاوے'' (تفسیر اعراف آیت مذکور)

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ اور نہیں کی گئی ہے' اس حد بندی کی تشریح احادیث کے مطابق حسب ذیل ہے۔

(۱)۔ روح المعانی تفسیر آیت مذکور۔

۱۔مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خاص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہننا چاہئے کیونکہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردوں کی جدوجہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ جیسے لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں تا کہ اس کی لوہے کی کڑیاں بدن میں نہ چبھیں یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردراپن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیئے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں' اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگاتے تو اس کی بھی اجازت ہے۔

۲۔مردوں کے لیئے عورتوں کی سی پوشاک' اور عورتوں کے لیئے مردوں کی سی پوشاک پہننا جائز نہیں کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور وطریق کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس اور طور وطریق کی نقالی کریں لعنت فرمائی ہے۔

۳۔عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسیٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی' ان کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنا ازار فخر وغرور اور بڑائی کے اظہار کے لیئے گھسیٹ کر چلے گا اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائے گا' اسی لیئے مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچے نہیں کرنا چاہئے کہ ٹخنے چھپ جائیں' بلکہ آپ ﷺ نے پسند فرمایا کہ

پائجامہ اور تہبند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنوں سے اونچا رہے' فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور خدا غرور کو پسند نہیں فرماتا' البتہ عورتوں کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے۔

۴۔ ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں' پہننا ٹھیک نہیں' خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشاکیں ہوں' یا مولویوں کا نمائشی عبا' جبہ یا صوفیوں کی گیردار رنگ' کیونکہ ایسے کپڑے کے پہننے والوں کا اصل منشا اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے' اور یہ تفوق و امتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے۔

۵۔ مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے' عورتوں کے لیئے خصوصیت کے ساتھ آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ''کتنی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں۔

۶۔ ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو' یعنی اس سے ستر کی پورے حدود نہ چھپیں جائز نہیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کوئی ایسا (۱)۔ ہی کپڑا پہن کر حضور ﷺ کے سامنے آئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا' اے اسماء جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کھولنا حلال نہیں۔

۷۔ مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں! ایسی سرخ دھاریوں کی چادر آپ ﷺ نے اوڑھی ہے' زرد رنگ کی کپڑے پہنے جا سکتے ہیں آپ ﷺ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے' البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں' اور خوشبو کے لیئے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا مردوں کے لیئے منع ہے سبز رنگ کی چادر بھی آپ ﷺ نے اوڑھی ہے اور اس رنگ کا تہبند بھی آپ ﷺ نے باندھا ہے سیاہ رنگ کا عمامہ زیب

سرفرمایا ہے۔

۸۔مردوں کے لیئے عام طور سے سفید رنگ کے کپڑے آپ ﷺ نے پسند فرمائے ہیں۔

۹۔آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہئے۔

۱۰۔نیا لباس پہنتے وقت آپ ﷺ دعا پڑھا کرتے تھے جس میں اللہ تعالی کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے' یہ دعا پڑھتے تھے۔(۱)۔

الحمد لله الذی کسانی هذا ورزقنیه من غیر حول منی وقوبت۔

اس خدا کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا' اور روزی کیا میری قوت کے بغیر (یعنی محض اپنے فضل سے)

اور نہ اترا ؤاس پر جو تم کو اس نے دیا اور اللہ نہیں چاہتا ہے کہ کسی اترا تے بڑائی مارتے کو۔

(۱)۔ اس باب کی یہ ساری حدیثیں صحاح اور سنن کی کتاب اللباس میں ہیں' میرے پیش نظر اس وقت ابوداؤد اور ترمذی ہیں ان مسائل' کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔

ساتھ ہی اس کے مسلمانوں میں مردہ دلی نہیں پیدا کی ہے' بلکہ معتدل طریقہ پر اظہار مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں۔

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اسی کے فضل وکرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی' اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدۂ شکر بجالانا چاہئے تا کہ غایت مسرت کی حالت میں دینوی فخر وغرور کے بجائے انسان کی نیاز مندی کا اظہار ہو' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدہ شکر بجالاتے۔

ایک بار مکہ سے مدینہ کو جارہے تھے جب غروراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی' پھر سجدہ میں گر پڑے' اس کے بعد دیر تک دعا کی' پھر سجدہ میں گر پڑے اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی اور سجدہ میں گر پڑے اور فرمایا کہ میں نے خدا سے اپنی امت کے لیئے شفاعت کی دعا کی' تو اس نے میری ثلث امت کے لیئے شفاعت قبول کرلی' اس لیئے میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لیئے سجدہ میں گر پڑا پھر میں نے سر اٹھا کر اپنی امت کے ئے یہی درخواست کی تو اس نے میری ثلث امت کے لئے اور میری درخواست قبول کی' اس لیئے میں نے خدا کا شکر ادا کرنے کے لیئے سجدہ میں گر پڑا' پھر میں نے یہی التجا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیئے اور میری التجا کو قبول کیا تو میں اپنے خدا کے لیئے سجدہ میں گر پڑا۔ (۱)۔

صحابہ کرام کا بھی یہی دستور تھا' چنانچہ حضرت کعبؓ بن مالک کی توبہ جب قبول ہوئی

اوران کواس کامژدہ سنایا گیا تو وہ سجدہ میں گر پڑے اس قسم کے مسرت آمیز موقعوں پر دوسرے مسلمانوں کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارکباد دے کر اس کی مسرت میں شریک ہوں چنانچہ اس موقع پر صحابہ کرام بھی ان کے پاس جوق در جوق آئے اوران کو مبارکباد دی۔(۲)۔

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن میں پہنچنے کی مسرت ہوتی ہے اس موقع پر اعزہ واحباب کی دعوت کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوں چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر سے مدینہ میں آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا' (۳)۔اس موقع پر دوسروں کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر سے واپس آنے والے کا استقبال کریں تا کہ اس طریقہ سے ان کی مسرت کا اظہار ہو' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے لوگوں نے ثنیۃ الوداع تک جا کر آپ ﷺ کا استقبال کیا۔جس میں بچے بھی شامل تھے'(۵)۔

اجتماعی طور پر اظہار مسرت کا علم مواقع شادی بیاہ میں پیش آتا ہے' اوراس مواقع پر اسلام نے اظہار مسرت کے لیئے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے تا کہ خوب اعلان ہو اور سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

---

(۱)۔ ابوداؤد کتاب جهاد باب فی سجود الشکر۔ (۲)۔ بخاری کتاب المغازی حدیث کعب بن مالك (۳)۔ ابوداؤد کتاب الاطعمهت باب الاطعام عند القدوم من السفر (٤)۔ ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی التلقی (٥)۔ ترمذی کتاب النکاح باب ماجاء فی اعلان النکاح

فصل سلبین الحلال والحرام الدف والصوف

حلال اور حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے۔

یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے تا کہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا ہے' اور زنا چھپ کر چپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت ربیعؓ بنت معوذ بن عفراؤ کا نکاح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لا کر ان کے پاس بیٹھے' چند لڑکیاں دف بجا بجا کر حضرت ربیع بنت معوذؓ کے ان بزرگوں کی تعریف میں اشعار گانے لگیں جو غزوہ بدر میں شہید ہوئے تھے اسی حالت میں ایک نے یہ مصرع گایا۔

و فینا نبی یعلم ما فی غد

ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو' اور جو گا رہی تھیں اسی کو گاؤ۔ (۱)۔

ایک بار حضرت عائشہ نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عائشہ لوگوں کے ساتھ گیت نہ تھا' کیونکہ انصار کو گیت پسند ہے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا تم لوگوں نے اس کے ساتھ ایک لونڈی کیوں نہیں بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی جاتی' (۲)۔

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا' قرظہ بن کعبؓ اور ابو مسعودؓ انصاری بیٹھے لڑکیوں کا گانا سن رہے تھے اتنے میں عامرؓ بن سعد ایک تابعی آ گئے انہوں نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا آپ دو صاحب بدری صحابی ہیں اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے انہوں نے کہا تمہارا جی چاہے تو تم بھی بیٹھ کر سنو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے (نسائی باب الہود الغنا عند العرس)

عربوں میں رسم تھی کہ دولہا کو بالرفاء والبنین کہہ کر عیش و آرام اور اولاد نرینہ کی دعا

دیتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی:

بارك الله لك وبارك عليك وجمع بينكما في خير۔

تمہارے لیئے اللہ مبارک کرے تم پر برکت اتارے اور تم دونوں میں بھلائی میں میل ملاپ رکھے۔

شادی بیاہ میں دوستوں اور عزیزوں کی دعوت مسنون ہے' اس کو ولیمہ کہتے ہیں جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزوں اور دوستوں کو اس موقع پر کھلائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا' اور کچھ نہیں تو ایک بکری ذبح کر کے کھلا دو (۴)۔ اور خود کبھی پنیر' گھی اور اور چھوہارے بھی کھلائے ہیں (۵)۔ اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی میں تحفہ کے طور پر بھی کچھ بھیج سکتے ہیں (نسائی باب الہدیۃ لمن عرس)

---

(۱)۔ بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمہت

(۲)۔ بخاری کتاب النکاح باب النسوہ یہدین المراہ الی زوجہا وعاہن بالترکہت مع فتح الباری۔ (۳)۔ ابوداؤد کتاب النکاح باب مایقال للزوج۔ (٤)۔ بخاری کتاب النکاح باب الولیمتہ ولو بشاہ۔

(۵)۔ نسائی کتاب النکاح باب البنائی السفر۔

مسلمانوں کے لیئے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانہ پر اجتماعی اظہار مسرت کا موقع عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن پیش آتا ہے' زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے سال میں دو دن مقرر کیئے تھے' جن میں وہ خوشیاں مناتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم لوگ دنوں میں خوشیاں مناتے تھے اب خدا نے ان کو تمہارے لیئے ان سے دو بہتر دنوں سے بدل دیا' یعنی عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن (۱)۔ خوشی کے ان دنوں کی تعیین میں دوسری مشرک قوموں کی طرح فصل و موسم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یا دگار کا ذریعہ نہیں بنایا گیا' بلکہ دین حنیف کے دو عظیم الشان واقعوں کو اظہار مسرت کے لیئے پسند کیا گیا' عید اضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام کی خوشیوں اور خانہ کعبہ کی بنا پر اور فتح کی' اور عید الفطر اسلام کی

آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے۔

ان دونوں دنوں میں اظہار مسرت کے لیئے عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھیلوں کو پسند فرمایا' حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دو لونڈیاں جو پیشہ ور گانے والیاں نہ تھیں' وہ اشعار گا رہی تھیں جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے' اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ آئے اور کہا کہ ''شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں'' لیکن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اے ابوبکرؓ! ہر قوم کے لیئے عید کا ایک دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید (۲)۔ کا دن ہے'' یعنی اسی دن گانا مباح ہے۔ (۳)۔

حبشی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود حضرت عائشہ کو یہ تماشا دکھایا اور حبشیوں سے کہا ''ہاں بنوارفدہ!'' اس سے آپ کا مقصد ان میں مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا' یہاں تک کہ جب حضرت عائشہؓ تھک گئیں تو آپ نے کہا کہ ''بس'' انہوں نے کہا ''ہاں'' ارشاد ہوا تو جاؤ۔ (۴)۔

مسرت کے اس طریقہ اظہار کا نام ''تقلیس'' تھا' جس کے معنی دف بجانے' گانے اور دلچسپی کے لیئے شمشیر بازی' نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کودیں' تماشے دکھائیں' عہد رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہ کو کسی جگہ عید کا دن اظہار مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا تو ان کو تعجب ہوتا تھا' چنانچہ ایک بار حضرت عیاض اشعریؓ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لوگ ''تقلیس'' کیا کرتے تھے' اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے۔

حضرت قیسؓ بن سعد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جو

چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھ لیں بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے "تقلیس" ہوتی تھی۔(۵)۔

(۱)۔ نسائی کتاب صلوٰۃ العیدین۔ (۲)۔ بخاری باب سنتہ العیدین لاھل الاسلام۔ (۳)۔ بشرطیکہ اس کے مضامین اخلاقی اور مذھبی حیثیت سے برے نہ ھوں۔ (٤)۔ بخاری باب الحراب والدرق یوم العید۔ (٥)۔ ابن ماجا کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی التقلیس یوم العید۔

عیدین کے دن خوشی ومسرت کے اس طریقہ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دوموقع ایسے مذہبی وقومی جشن کے آئیں جس میں لوگ کھل کر خوشی کرسکیں اور متین سے متین آدمی کچھ دیر انبساط خاطر کا اظہار کرے' اسی لیئے ان دنوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے' اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ دن کھانے پینے' اہل وعیال سے لطف اٹھانے اور یاد الٰہی کے ہیں۔(۱)۔ اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلب کو خدا کی یاد سے غفلت نہ ہو' اس لیئے عید کے دونوں موقعوں پر دوگانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا' تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے عید گاہ کو جائیں اور دوسرے راستہ لوٹیں' تا کہ ہر طرف اسلام کی شان وشوکت کا اظہار ہو اور لتکبروا اللہ علی ما ھدکم کی تعمیل ہو۔

آداب ماتم

خوشی اورغم تو عام ہیں، جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے غم کی حالت میں بھی وہ اعتدالی سے گزر جاتا ہے عربوں میں فخر وغرور اور جہالت ووحشت کی وجہ سے تعزیت وماتم کی عجیب عجیب رسمیں قائم ہوگئی تھیں، فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا اس لیئے اظہار فخر کے بہت سے طریقے جاری ہوگئے تھے، سب سے مقدم یہ کہ مرنے والا جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہئے، چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے۔

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

اذا انا فابکینی بما انا اهله وشقی علی الجیب یابنت معبد۔

جب میں مرجاؤں تو میرے لیئے میرے درجہ کے موافق رونا، اور میرے لیئے گریبان کو چاک کرڈالنا۔

منہ پر تھپڑ مارنا چھاتی کوٹنا، سر کے بال کھول دینا، عام رسم تھی اور شعراء اس کا فخر یہ اظہار کرتے تھے۔

من کان مسرورا بقتل مالك فلیات نسوتنا بوجه نهار یجد النساء حواسرا یندبنه یلطمن وجهن بالاسحار۔

جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوتا تھا، تو ہماری مستورات کو دن دھاڑے آکر دیکھے۔ وہ دیکھے گا کہ عورتیں سر کھول کر نوحہ کر رہی ہیں۔ اور صبح کے وقت اپنی گالوں پر طمانچے مار رہی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص گریبان پھاڑتا، اور گالوں پر طمانچے مارتا، اور جاہلیت

کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے وہ میری امت میں سے نہیں'' (۲)۔ یعنی یہ میری امت کے کام نہیں۔

(۱)۔ شرح معانی الآثار طحاوی ص ۴۲۹' یہاں بعال کا ترجمہ اھل و عیال سے لطف اٹھانا کر دیا گیا ھے۔ (۲)۔ ترمذی کتاب الجنائز باب ماجاء فی النھی عن ضرب الخدود۔

حضرت جعفر طیارؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہایت محبت تھی' ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو ان کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا' آپ ﷺ نے منع کرا بھیجا' وہ باز نہ آئیں' دوبارہ منع فرمایا' پھر جب نہ مانیں تو آپ ﷺ نے حکم دیا ''ان کے منہ میں خاک بھر دو۔'' (۱)۔

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہوں' اس بنا پر دور دور سے عورتیں بلا کر آتی تھیں' رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخل مراسم ہوگئی تھی' یعنی کسی میت کے لیئے کسی خاندان کی عورتوں نے نوحہ کیا ہے تو اس میت کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا۔ ایک دفعہ ایک خاتون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ ''وہ کونسی بات ہے جس میں ہم کو آپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہئے۔'' وہ بولیں کہ میرے چچا نے جب انتقال کیا تو فلاں خاندان کی عورتیں آ کر روئی تھیں' ان کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے' آپ ﷺ نے منع فرمایا' لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں' بالآخر ان کے بار بار اصرار پر اجازت دی' لیکن وہ خاتون آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اصلی منشا سمجھ گئی تھیں' اس لیئے پھر کبھی کسی کے نوحہ میں شریک نہ ہوئیں۔ (۲)۔

دستور تھا کہ جب کوئی مر جاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئیں اس کو عربی میں ''نعی'' کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا' حضرت حذیفہؓ جب مرنے لگے تو ''فرمان نبوی کی اس قدر احتیاط مدنظر تھی کہ) وصیت کی کہ ''میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا' میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کو اعلان مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے' اور شاید خبر کرنا بھی اعلان میں داخل ہو''(۳)۔

جنازہ کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنے والے چلتے' اور بخور دان جلا کر لے جاتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لیجائے' راگ سے مقصود کفار ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہوسکتا ہے تب یہ مطلب ہوگا کہ ''جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور باجا نہ لے جائے۔(۴)۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک جنازہ میں شریک تھے ایک عورت انگیٹھی لے کی آئی۔ آپ ﷺ نے اس کو اس زور سے زجر کیا کہ وہ بھاگ گئی۔ (۵)۔

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینک دیتے تھے' صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا' ایک دفعہ آپ نے لوگوں کو اس صورت میں دیکھا تھا تو فرمایا کہ جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو؟ میرا یہ ارادہ ہوا کہ میں تمہارے حق میں ایسی بد دعا کروں کہ تمہاری صورتیں بدل جائیں لوگوں نے فوراً چادریں اوڑھ لیں اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہ کیا۔(۶)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوگ کی مدت بھی مقرر کردی' اور فرمایا کہ کسی مومن کی لیئے یہ جائز نہیں کہ تین دنوں سے زیادہ کسی کا سوگ کرے البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا' جس میں وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے خوشبو نہ لگائے اور نہ کوئی اور آرائش و زیبائش کرے۔(۷)۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عندالمصیبته لعرف فیه الحزن۔ (۲)۔ ترمذی تفسیر سوراہ ممتحنہ۔ (۳)۔ ترمذی کتاب الجنائز باب کراهته النعی۔ (٤)۔ باب الاسلام یهدم ماقبله ص ۱۹۹۔ (۵)۔ ابوداؤد جلد ۲ کتاب الجنائز باب فی النار یتبع بها المیت مع بذل المجهود فی شرح ابی داؤد۔ (٦)۔ اسد الغابته جلد ٤ صفحه ۳۹۵ مصر۔ (۷)۔ ابن ماجه کتاب الجنائز باب مجاء فی النهی عن التسلب مع الجنازه۔

معذرت کرنے آئی اور صبر کا کلمہ ادا کیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ صبر صدمہ کے شروع ہی میں کرنا چاہئے۔(۵)۔

خدا فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون (بقرہ:۱۹) اسی لیئے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہیں اور یہ دستور مستحسن ہے۔

تقدیر کا عقیدہ غم کا چارہ کار ہے، جو کچھ ہوا خدا کے حکم اور مصلحت سے ہوا یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے، اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتادیا ہے؛

لکیلا تاسوا علی ما فاتکم (حدید:۳)

تاکہ تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہے اس پر غم نہ کرو۔

---

(۱)۔ ترمذی کتاب الطلاق باب ماجاء فی مدہ المتوفی عنہا زوجہا۔ (۲)۔ مسلم کتاب الفضائل باب رحمتہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الصبیان والعیال۔ (۳)۔ فتح الباری جلد ۳ ص ۱۲۲۔ (٤)۔ ابوداؤد کتاب الجنائز باب صنعتہ الطعام لا ھل المیت۔ (۵)۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثائوب۔

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر ناگواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً جمائی لینے میں انسان کا منہ کھل جاتا ہے، آہ آہ یا ہاہ ہاہ کی ناگوار آواز منہ سے نکلتی ہے اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر ایک مضحکہ خیز شکل پیدا ہوجاتی ہے اسی مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے "جمائی شیطان کی جانب سے ہے، اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے، تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے۔(۴)۔ بعض حدیثوں میں ہے کہ جب تم میں کوئی جمائی لے تو اپنے منہ کو بند کرلے، کیونکہ شیطان اس کے

منہ کے اندر گھس جاتا ہے'(۱)۔حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس میں حقیقت ومجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے۔(۲)۔اس لیئے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے۔

۱۔ پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمائی روکنے کی چیز ہے'اس لیئے جہاں تک ممکن ہو اس کو روکنا چاہئے'ہاہا ہاہا نہیں کہنا چاہئے'اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہئے۔

۲۔ جمائی کے برخلاف آپ ﷺ نے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی ہے بلکہ اس کو خدا کی جانب سے بتلایا ہے(۳)۔ ہمارے شراح حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے'لیکن جمائی بدن کے ثقل اور کسل وسستی کا نتیجہ ہے س لیئے چھینک عمل کے لیئے نشاط اور جمائی اس کے لیئے کسل پیدا کرتی ہے'شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی اجزا نکلتے ہیں اور اس طریقہ سے وہ شفا کا ذریعہ بن جاتی ہے'اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر خدا کا شکر کرے اور الحمدللہ کہے دوسرے لوگ اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہیں۔(۴)۔

۳۔تاہم وہ ایک بدنما چیز ہے'بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہے'اس لیئے چھنکتے وقت منہ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہے اور اس طریقہ سے چھنیک کی آواز کو پست کرنا چاہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا۔(۵)۔

۴۔انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپ ﷺ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے خصائص کی بعض کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمائی اور انگڑائی نہیں لیتے تھے'حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان حدیثوں کو نقل کیا ہے اور

(۱)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی التثاؤب۔ (۲)۔ حجتہ اللہ البالغہ ادب۔ (۳)۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاوب۔ (٤)۔ ایضاً۔ (٥)۔ ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء کیف یشمت العاطس۔

ان کی تضعیف وتردید نہیں کی ہے' بلکہ بعض کی تائید کی ہے۔(۱)۔ بہرحال یہ حدیثیں صحیح ہوں یا نہ ہوں لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انگڑائی لینے میں جسم کی جو حالت ہوتی ہے وہ بدنمائی پیدا کرتی ہے' اس لیئے مجمع عام میں اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

ڈکار کے متعلق صحیح ترمذی میں ہے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ کے سامنے ڈکار لی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو' کیونکہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہیں وہ آخرت میں سب سے زیادہ بھوکے رہیں گے اس حدیث سے پرخوری کی ممانعت کے ساتھ ضمناً ڈکار کی کراہت ثابت ہوتی ہے۔

آداب کا فلسفہ ::

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ میں ان آداب کی خصوصیات پر ایک نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

تمام متمدن ملکوں کے باشندوں نے خورد ونوش' نشست وبرخاست اور وضع ولباس وغیرہ کے متعلق اجتماعی ومعاشرتی حالات میں فطرتاً چند آداب کی پابندی کا لحاظ رکھا ہے اور اس میں مختلف طریقے اختیار کیئے ہیں۔

۱۔ بعض لوگوں نے ان کی بنیاد حکمت طبعی کے قواعد پر رکھی ہے اور ان آداب کو اختیار کیا ہے جو طب اور تجربہ کی رو سے مفید ہیں۔

۲۔ بعض لوگوں نے ان کو مذہبی اصول پر قائم کیا ہے' اور اس میں اپنے مذہب کی پابندی کی ہے۔

۳۔ بعض لوگوں نے اس معاملہ میں اپنے بادشاہوں' حکیموں اور راہبوں کی تقلید کی

ہے' ان کے علاوہ اور اصول وقواعد بھی ہیں جن میں بعض مفید اور بعض میں نفع و نقصان کچھ بھی نہیں ہے اس لیئے جو مفید تھے وہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان کی پابندی کا حکم دیا جائے' اور جو مضر تھے ان کی ممانعت کی جائے اور جن میں نفع و نقصان کچھ بھی نہیں تھا وہ اپنی اباحت کی حالت میں قائم رکھے جائیں' ان مصلحتوں کی بنا پر شریعت نے ان سے بحث کی اور اس میں امور ذیل کا لحاظ رکھا۔

۱۔ ایک تو یہ کہ ان آداب کی پابندی سے بعض اوقات خدا بھول جاتا ہے اور دل کی صفائی باقی نہیں رہتی اس لیئے شریعت نے ان سے پہلے' ان کے بعد اور ان کے ساتھ چند دعائیں مسنون کردیں جو خدا کو یاد دلاتی ہیں۔

۲۔ بعض افعال واشکال شیطانوں کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں مثلاً ایک جوتا پہن کے چلنا اور بائیں ہاتھ سے کھانا' اس لیئے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اس کے بخلاف بعض باتیں ایسی ہیں جو فرشتوں سے قریب کردیتی ہیں مثلاً گھر میں داخل ہونے اور نکلتے کے وقت دعا پڑھنا' اس لیئے شریعت نے ان کی ترغیب دی ہے۔

۳۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے تجربہ بہت" تکلیف پہنچتی ہے مثلاً ایسی چھت پر سونا جس پر کوئی آڑ یا جالی نہ ہو' یا سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا' اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ چوہے چراغ کی بتی سے گھر میں آگ لگا دیتے ہیں۔

---

(۱)۔ ابوداؤد کتاب الادب باب فی العطاس۔ (۲)۔ فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۵۰۶۔ (۳)۔ ترمذی ابواب الزھد صفحہ ۴۰۹۔ (٤)۔ ترمذی ابواب الزھد صفحہ۴۰۹۔ (۵)۔ حجتہ البالغہ ص ۳۶۳۔

۴۔ بعض آداب ایسے ہیں جن سے عجمیوں کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے مثلاً حریر' تصویر دار کپڑوں اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت۔

۵۔بعض چیزیں وقار تمدن کے منافی ہیں اور انسانوں کو بالکل وحشیوں اور بدوؤں میں شامل کر دیتی ہے اس لیئے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ممانعت فرمائی تا کہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے (۱)۔

اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ دنیا کے تمدن مہذب قوموں کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی اسلام کے احکام میں اور رسول انام علیہ السلام کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں' اور مذہبی' اخلاقی' تمدنی اور طبی' غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہیں یعنی ان آداب کی پیروی سے خدا کی رضا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع' روح اور جسم کی پاکیزگی گھر کی صفائی' اخلاق کی طہارت اور بلندی' معاشرت کی اچھائی' صحت کی حفاظت اور ترقی' بزرگوں کے آزمودہ اصول کار' طریق زندگی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے۔

اسلام نے ان آداب میں بڑی لچک رکھی ہے یعنی ان میں جو اصلی اور بنیادی باتیں ہیں' ان کی تو قرآن پاک اور حدیث نبویہ میں پوری تاکید کر دی ہے اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے' لیکن ان میں بعض ایسے امور بھی ہیں جو وقتی مصلحت' عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں' اسی لیئے ان کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو' یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید (۱)۔فرمائی گئی ہو اور اس لیئے ان کے دینوی مصالح اور فائدے بھی بتا دیئے گئے ہیں' ان کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے تو وہ برا نہیں' جیسے جہاں ہاتھ دھونے میں اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے وہاں اگر مٹی کے جگہ صابون استعمال کیا جائے' تو لیئے کام میں لائے جائیں' کھاتے میں ہاتھ کے بجائے چمچوں سے کھانا نکالا جائے۔چھری سے گوشت کاٹا جائے' (۲)۔پلیٹیں بدلی

جائیں یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے اختیار کیے جائیں' یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں' حلال کھانا کھائیں' بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں تو ان کی پوری اجازت ہے لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق و محبت کا ہے' جو لوگ اس راہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں' ان کے لیئے زمانہ کچھ ہی بدل جائے مگر ان کی نظر میں وہی ادائیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں۔

---

(۱)۔حجتہ البالغہ ص ۳۲۳۔ (۲)۔ ہمارے فقہا نے اسی کو سنن الھدی اور سنن الروائد کی اصلاحوں میں بیان کیا ہے۔ (۳)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھری سے گوشت کاٹ کر کھایا ہے۔